مقالاتِ
دینی و علمی

حصّہ اوّل

چند دینی و علمی تحقیقی تقریریں

جو

پروفیسر مولوی محمد شفیع ایم۔اے (کینٹب)
ڈی لٹ و ایل ستارۂ پاکستان
صدر شعبۂ دائرۂ معارفِ اردو

نے

ریڈیو کے ذریعے سے نشر کیں

۱۹۶۰ء

مطبوعہ دین محمدی پریس لاہور

عرضِ حال

والدِ بزرگوار پروفیسر مولوی محمد شفیع نے گذشتہ سالوں میں بعض دینی اور علمی مضامین پر لاہور ریڈیو سے چند تقریریں نشر کیں۔ احباب کی فرمائش سے اب اِن تقریروں کو افادۂ عام کی غرض سے کتابی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ ارادہ یہ ہے کہ اِسی سلسلے کی اور تقریروں کو بھی حصہ دوم میں طبع و نشر کیا جائے۔ اسی طرح اگر موقعہ ملا تو ان کے متفرق علمی مضامین کو اِنشاء اللہ تعالیٰ حصہ سوم میں جمع کر دیا جائے گا تاکہ وہ شائقینِ علم و ادب کو یکجا مل سکیں۔ جو تقریریں اب شائع کی جا رہی ہیں۔ ان کے لئے ہم ریڈیو پاکستان لاہور کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے ان نشریات کے طبع کرنے کی اجازت دی۔

العارض:۔

مصطفیٰ کمال
ایم۔اے

فہرست مقالات

سیرتِ پاک

سیرتِ پاک کا پس منظر

چند مباحث جن کے پیش کرنے کا ارادہ ہے، ماہِ مبارک ربیع الاوّل کی مناسبت سے حضور علیہ السّلام سے تعلق رکھتے ہیں۔ سب سے پہلے سیرتِ پاک کا پس منظر ملاحظہ ہو۔

دیارِ عرب کے شمال میں دشتِ شام، مشرق میں دشتِ عراق اور خلیج فارس اور بحرِ عمان ہے۔ مغرب میں بحرِ احمر جسے انگریزی میں (RED SEA) کہتے ہیں اور جنوب میں بحرِ ہند۔ اِس سرزمین کا بیشتر حصّہ ریگ زار ہے۔ جنوبی حصّے میں الربع الخالی کا لق و دق صحرا کلیتہً بے آب و گیاہ ہے۔ اُس میں ریت کا سمندر موجزن ہے، اور ہوائیں مسلسل اس میں ریت کا تانا بانا تنتی رہتی ہیں۔ یہ صحرا نجد، حضرموت، بلادِ عمان، حجاز اور عسیر کے درمیان ۱/۲ ۲ درجے جغرافیائی طول میں اور ۱/۲ ۱ درجہ عرض میں پھیلا ہُوا ہے۔ اِس صحرا کے شمال مشرقی سرے سے ایک ریگستانی زبان شمال کو گئی ہے۔ جو الحسا اور القصیم کے درمیان میں سے گذر کر دشتِ شام سے جاملی ہے۔ یہ تو تھا دشت، رہا عرب کا آباد حصّہ، وہ زیادہ تر ساحلوں کے ساتھ ساتھ ہے۔

دکن کی طرح عرب کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ ایک پہاڑی سلسلہ شمال سے جنوب کو آتا ہے۔ یہ پہاڑ آباد ہے۔ اِس میں چشمے، ندیاں، باغات اور کشت زار ہیں۔ اِس پہاڑی سلسلے کا جنوبی سرا یمن میں ختم ہوتا ہے۔ اِس سلسلے کو کوہستانِ سروات کہتے ہیں۔

بلادِ عرب چھ حصّوں میں منقسم ہے۔ جن کے نام آپ ابھی سن چکے ہیں یعنی حجاز، یمن و عسیر، حضر موت، عمان، بحرین، نجد و الحسا، ان میں سے حجاز وہ حصّہ ہے جو بحر احمر کے متصل ہے۔ اس کے مشرق میں الربع الخالی ہے اور جنوب میں بلادِ عسیر، کوہسار سروات اس کے بیچوں بیچ شمال سے جنوب کو گیا ہے۔ حجاز میں بعض جگہ اس کی بلندی ۸ ہزار فٹ ہے اس پہاڑ کی مغربی ڈھلان اور سمندر کے درمیان شمالاً پھیلا ہوا ایک تنگ میدان ہے جسے تہامہ کہتے ہیں۔

بلادِ حجاز کا مرکز مکۂ مکرمہ ہے۔ قرآن مجید سورۂ آل عمران میں اس کو بکّہ بھی کہا گیا ہے:۔ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ۔ اور سورۂ انعام میں اُمُّ الْقُرٰی بھی۔ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَھَا۔ یہ شہر جو سطحِ سمندر سے ۱۳۳۲ فٹ بلند ہے۔ یونانی جغرافیہ نویس بطلیموس کو بظاہر MACORABA یعنی معبد کے نام سے معلوم تھا۔ لیکن اس کی آبادی کا آغاز بطلیموس کے زمانے سے بہت پہلے ہو چکا تھا۔ یعنی حضرت ابراہیم اور ان کے بیٹے اسمٰعیل علیہما السّلام کے زمانے میں ان کی اولاد خیمہ نشین تھی۔ مگر جب قصّی بن کلاب نے جس کو مجمّع بھی کہتے ہیں۔ دوسری صدی قبل ہجرت میں شام سے آکر کعبہ اور چاہِ زمزم کے گرد اگرد گھر بنائے۔ اور ان میں بنو قریش کو بسایا تو اس وقت سے اس کی آبادی روز افزوں ہے۔ عرب کے جنوبی سواحل پر مشرقی ممالک کی تحفہ چیزیں، خصوصاً خوشبودار مصالحے قدیم الایّام سے آتے تھے۔ اور یمن اور حضر موت کی اسی قسم کی چیزوں کے ساتھ عربوں کے قافلے انہیں بحیرۂ روم کے کناروں تک پہنچاتے تھے۔ جس راستے کو وہ استعمال کرتے تھے، انہیں انگریزی مصنف INCENSE ROAD یعنی طریق اللطائم کہتے ہیں۔ مکہ غالباً اسی شاہراہ پر واقع تھا۔ اس کا محلّ وقوع جغرافیائی اعتبار سے بیحد اہم تھا۔ وہ ایشیا اور افریقہ کی سرحد

پر واقع ہے، بابل اور شام سے جو سڑکیں یمن، بحرِ ہند اور بحرِ احمر کو جاتی تھیں، مکّہ ان کے محلِّ تقاطع سے قریب واقع تھا۔ اہلِ مکہ کا ایک تجارتی قوم بن جانا ایک قدرتی بات تھی۔ چنانچہ کسریٰ و قیصر، شاہانِ حیرہ و شاہانِ غسّان، اقیالِ یمن اور نجاشیِ حبشہ سبھی سے ان کے تجارتی معاہدے تھے۔ اور ہر سال سردی اور گرمی میں ان کے دو تجارتی قافلے مکّہ سے باہر جاتے تھے۔ یہ قافلے کھالیں، چمڑا، زبیبِ طائفی، سونا، جنوبی عرب کا گوگل، ہندوستان اور افریقہ کے گرم مصالحے، سنا مکّی وغیرہ اونٹوں پر لاد کر چلتے تھے۔ اس مالِ تجارت میں متعدد خوبیاں تھیں۔ مثلاً اس کا قلیل الحجم مگر قیمتی ہونا، اس کا قلیل الحجم ہونا تو نہایت ہی ضروری تھا، کیونکہ وہ اونٹوں پر لادا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ گرمی، اونٹوں کی آہستہ خرامی اور سفر کے طول سے اس مال کے خراب ہونے کا احتمال بھی تھا۔ اس مال کے مبادلے میں یہ قافلے یمن سے ہندوستان کی پیداوار اور چین کا ریشم اور مخطط دھاری دار چادریں وغیرہ لاتے تھے۔ افریقہ کا سونا، ہاتھی دانت اور غلام حاصل کرتے تھے۔ افریقہ سے تو اہلِ مکہ مزدور، اور فوجی سپاہی (احابیش) بھی حاصل کرتے تھے۔ مصر سے مختلف قسم کا سوتی اور ریشمی کپڑا، اسلحہ، دالیں اور تیل لاتے تھے۔ یہ درآمد و برآمد کی تجارت نہایت پُر نفع تھی۔ اس میں سو فیصدی نفع کمانا کچھ بات ہی نہ تھی۔ اس لئے کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ اہلِ مکہ میں صرف مردوں ہی کو نہیں، عورتوں کو بھی تجارت میں دلچسپی تھی۔ حضرت خدیجہؓ تاجرہ تھیں۔ ابوسفیان کی بیوی ہندہ تاجرہ تھیں۔ ابوجہل کی ماں تاجرہ تھی۔ علیٰ ہذا القیاس، سردی گرمی میں قافلوں کا جانا اور آنا اہلِ مکہ کے تمام باشندوں کی دلچسپی کا موجب تھا۔ اور وہ اس تقریب کو اسی طرح مناتے تھے جس طرح میلوں کو مناتے ہیں۔ "رحلۃ الشّتاء والصیف" میں انہیں دو قافلوں کے سفر کا ذکر ہے۔

مکّہ ایک وادی غیر ذی زرع میں واقع ہے۔ دائیں بائیں شہر کے دونوں جانب خشک اور یک انداز پہاڑوں کی قطار ہے، شہر جبلِ قعیقعان کے دامن میں ایک پچکے ہوئے ہلال کی شکل میں ہے جس کی نوکیں اس پہاڑ کے دونوں پہلوؤں کی طرف اُٹھی ہوئی ہیں۔ اس ہلال کا درمیانی حصہ پست ہے۔ شہرِ مکّہ ابتدا میں یہیں آباد ہوا تھا، یہی وادی مکّہ یا بطنِ مکّہ ہے جس کی نسبت سورۃ الفتح میں ارشاد ہوا تھا :- وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ ۔ اور جس کی نسبت کعب بن زہیر نے کہا تھا ؎

فی عُصبۃٍ من قریشٍ قال قائلھم ؛ ببطن مکّۃ لمّا اَسلمُوا ازُولُوا

اِس وادیٔ مکّہ کے پست ترین حصّے کو البطحاء کہتے تھے۔ یہیں کعبہ مکرمہ ہے۔ کعبہ کے چاروں طرف لوگوں کے گھر تھے۔ مختلف قبائلِ قریش ان گھروں میں آباد تھے۔ پہاڑوں سے گھرے ہونے کی وجہ سے مکّے کی گرمی مشہور ہے۔ اس لئے شرفاءِ مکّہ میں اپنے بچوں کو بچپن میں مکّے سے باہر قبائلی علاقے میں بھیجنے کا دستور قائم ہوگیا تھا کہ وہ وہاں کی کھلی ہوا اور بداوت وسذاجت کی زندگی میں نشو و نما پائیں، قبائل کی خالص زبان، قول و فعل کی حرّیت اور شہسواری سیکھیں۔ مکّے میں عموماً بارش بہت کم ہوتی ہے۔ بعض اوقات تین تین چار چار سال تک بارش نہیں ہوتی، مگر کبھی کبھی سردیوں میں اتنے زور کی بارش ہو جاتی ہے کہ آس پاس کی پہاڑیوں سے ندی نالے سیلاب بن کر وادیٔ مکّہ میں اتر آتے ہیں۔ اس علاقہ کی خشک، کم آب اور بنجر زمین کی وجہ سے اہلِ مکّہ کو اناج وغیرہ ضروریاتِ زندگی کے لئے شام و مصر کا دست نگر ہونا پڑتا ہے۔ کبھی قافلوں کے آنے میں دیر ہو جائے یا اور موانع پیش آجائیں تو قحط کا اندیشہ ہو جاتا ہے۔

ابھی یہ ذکر ہوا تھا کہ وادیٔ مکہ کے درمیانی نشیب کے گرد اگرد قریش کی بستی تھی۔

قریش یا فہر ان کے جدّ کا نام تھا۔ پہلے قریش حرم کے آس پاس کی پہاڑیوں میں بنو کنانہ کے ساتھ مقیم تھے۔ قصیّ مُجمّع نے مکے کو بنو خزاعہ سے لے لیا۔ اور قریش کے تمام خاندانوں کو اکٹھا کر کے دس قبائل کی صورت میں وسطِ وادی یعنی بطحاء میں بسا دیا۔ جہاں چاہِ زمزم اور کعبہ واقع تھا۔ شرفائے قریش اور اُن کے قدیم ترین خاندانوں کا مسکن یہی جگہ تھی۔ ان سے کم درجے کے لوگ قریشِ ظواہر تھے۔ جو شہر کے نواح میں متصلہ پہاڑیوں کے نیچے کی ڈھلانوں پر اور ان کے شعبوں یا گھاٹیوں میں آباد ہو گئے تھے۔ بطحاء کی نسبت سے بطحاء کے قریشیوں کو قریش البطاح، اَلبطحی یا بِطاحی کہتے تھے۔ چنانچہ قریش کا شاعر قیس الرقیّات اموی خلیفہ ولید بن یزید کی مدح میں کہتا ہے :-

"تو فراخ اور سپاٹ وادیوں کا بیٹا ہے۔ تو ایسا نہیں ہے کہ تجھے پست زمینوں اور پہاڑوں کے کھڈوں نے گھیرا ہو" (یعنی تو شرفائے قریش میں سے ہے اور تیرا مقام قریش میں مخفی نہیں) ابن قیس الرقیات کے الفاظ ہیں :-

انتَ ابنُ مُسلَنطِحِ البطاحِ ولم تَعطِفْ علیکَ الحُنیُّ والوُلُجُ

(دیوان صہ ۲۲۵)

سیرت پاک کے اہم واقعات

سیرتِ شریفہ کے پس منظر کے طور پر ہم نے عرب اور جاہلیت کے اہلِ عرب کا کچھ ذکر کیا تھا۔ اور یہاں تک پہنچے تھے کہ جب مشیّتِ ایزدی کو منظور ہوا کہ عرب اور عجم کو ایمان کی نعمت نصیب ہو تو اس کا سامان ہو گیا۔ اور شہر مکہ میں بنو ہاشم کے گھرانے میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وجود باجود نے ظہور فرمایا ؎

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا ٭ دُعائے خلیلؑ اور نویدِ مسیحاؑ

تاریخ ولادت کے متعلق کچھ اختلاف ہے۔ مہینہ ربیع الاول کا تھا۔ مولد مبارک مکہ مکرمہ کے محلہ شعب بنی عامر میں ہوا۔ یہ مکان آج بھی موجود ہے۔ اور مصری مصنف بتنونی نے اپنی کتاب "الرحلۃ الحجازیۃ" میں اس کا خاکہ دیا ہے اور حال لکھا ہے۔ حضورؐ کی زندگی کے مختصر حالات، ابن قتیبہ کی کتاب "المعارف" میں یوں دیئے ہیں:۔

آپ اپنے والد عبداللہ بن عبدالمطلب کے اکلوتے بیٹے تھے۔ عبداللہ اپنی والدہ کے عزیزوں سے ملنے مدینے گئے اور وہیں عین عالم شباب میں فوت ہوئے۔ والدہ نے آپؐ کو ایک دودھ پلانے والی دایہ کے سپرد کیا۔ جو بنو سعد بن بکر میں سے تھی اور اس کا نام حلیمہ تھا۔ آپؐ پانچ برس کے ہوئے تو دایہ نے آپؐ کو اپنی والدہ کے پاس واپس پہنچا دیا۔ ایک سال کے بعد آپ کی والدہ آپ کو ہمراہ لیکر مدینے میں اپنے بھائیوں کے پاس گئیں اور راستے میں ابواء کے مقام پر فوت ہو گئیں۔ یہ ابن قتیبہ صاحب "کتاب المعارف" کا قول ہے۔ "معجم البلدان" میں ہے کہ آمنہ ہر سال اپنے شوہر کی قبر پر جانے کیلئے مدینے آیا کرتی تھیں۔ جب حضورؐ چھ سال کے ہوئے تو آمنہ اپنے خسر کے ہمراہ امّ ایمن حضورؐ کی کھلائی کو ساتھ لے کر حسب معمول اپنے شوہر کی قبر کی زیارت کیلئے مدینے گئیں، واپسی میں جب وہ مدینے سے تقریباً ۲۳ میل کے فاصلے پر ابواء پہنچیں تو پیغام اجل آ پہنچا اور ان کو ابواء ہی میں دفن کر دیا گیا۔ ابن قتیبہ ہی نے لکھا ہے کہ جب آپؐ کی والدہ کا انتقال ہوا تو امّ ایمن نے آپؐ کو مکے میں پہنچا دیا۔ جب آپؐ آٹھ برس دو ماہ کے ہوئے تو آپؐ کے دادا عبدالمطلب بھی فوت ہو گئے۔ جب آپؐ کی عمر بارہ برس کی ہوئی تو آپؐ اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ بغرض تجارت شام کی جانب تشریف لے گئے۔ آپ بیس ۲۰ برس کے تھے جب آپؐ جنگ فجار میں شامل ہوئے۔ پچیس ۲۵ برس کی عمر میں حضرت خدیجہ بنت خویلد

کی طرف سے پھر شام کا سفر اختیار کیا۔ اور اس سے دو ماہ کچھ دن بعد جناب خدیجہ سے شادی کی۔ حضورؐ کے آٹھ بچوں میں سے سات بچے حضرت خدیجہ کے بطن سے تھے شادی سے پندرہ برس بعد تک وہ زندہ رہیں۔ اُن کی زندگی میں آپؐ نے دُوسری شادی نہ کی۔ جب آپؐ کی عمر ۳۵ سال کی ہوئی تو بنائے کعبہ کا واقعہ پیش آیا۔ جس میں قریش مکّہ نے آپؐ کے فیصلے کو تسلیم کیا۔

ابن قتیبہ نے اس واقعے کی تفصیل نہیں دی۔ یہ ہم آپ کو ابن ہشام کی "سیرت رسول اللہ" (ص ۱۲۲) اور دیگر ماٰخذوں سے لے کر بتاتے ہیں۔ بعثت سے پانچ برس پہلے، جب آپؐ کی عمر ۳۵ برس کی تھی، قریش نے چاہا کہ کعبے کی دیواریں بلند کر کے ان پر چھت ڈالیں۔ اتفاق سے اُس زمانہ میں کسی رومی تاجر کا ایک جہاز طوفان کی زد میں آکر جدّے کے ساحل پر چڑھ آیا اور ٹوٹ گیا۔ قریش اس جہاز کی لکڑی کو مکّے میں لے آئے اور چاہا، کہ اس سے کعبے پر چھت ڈالیں۔ ایک قبطی بڑھئی مکّے میں رہتا تھا۔ اس کے مشورے سے عمارت کھڑی کی گئی۔ دیواریں پتھروں اور لکڑی کے متبادل ردوں سے بنائی گئیں، جب حجر اسود کو اس کے موقع پر لگانے کا وقت آیا تو قبائل قریش میں جھگڑا ہو گیا۔ ہر قبیلے نے یہ چاہا کہ یہ شرف اس کو حاصل ہو۔ چنانچہ آپس میں لڑنے مرنے کو تیار ہو گئے۔ بنو عبدالدار لہو کا بھرا ہوا پیالہ لائے اور انہوں نے اور بنو عدی بن کعب نے لہو میں ہاتھ ڈال کر عہد باندھا کہ مر جائیں گے، مگر یہ گوارا نہیں کریں گے کہ حجر اسودؐ کو کوئی دُوسرا قبیلہ نصب کرے۔ چار پانچ روز یہ جھگڑا جاری رہا۔ آخر وہ سب مسجد الحرام میں جمع ہوئے اور مشورہ کرنے لگے کہ یہ مشکل کس طرح حل ہو۔ بعض راوی کہتے ہیں کہ ابو امیہؓ بن مغیرہؓ نے، جو دوسروں سے عمر میں بڑا تھا، کہا، اے معشر قریش! جو شخص مسجد الحرام کے دروازے سے سب سے پہلے (مسجد) میں

داخل ہو اُسے اِس معاملہ میں حکم بنا لو۔ قریش اِس بات پر متفق ہو گئے۔ اتفاق سے رسول اللہ سب سے پہلے مسجد الحرام میں داخل ہوئے۔ آپؐ نے ایک چادر منگوائی، حجرِ اسود کو اس میں رکھا۔ ہر قبیلے نے آپؐ کے ارشاد کے مطابق چادر کے مختلف کناروں کو پکڑا۔ اور جب اُس کے مقام پر پہنچے تو آپؐ نے خود پتھر کو اس کے ٹھکانے پر لگا دیا۔

ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ جب آپؐ کی عمر چالیس برس کی ہوئی تو آپ پیغمبر مبعوث ہوئے۔ آپؐ ۴۹ برس کے تھے کہ آپؐ کے چچا ابو طالب فوت ہوئے اور اس سے تین دن بعد حضرت خدیجہ کا انتقال ہوا۔ اِس واقعے سے تین مہینے کے بعد آپؐ زید بن حارث کو ساتھ لیکر طائف تشریف لے گئے۔ اور ایک مہینہ وہاں ٹھہر کر مکّے واپس آئے۔ اس سے ۱۲ برس بعد آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے مدینے کو ہجرت کر جانے کا حکم دیا۔ اور آپ پر جہاد فرض کیا۔ آپؐ نے اصحابؓ کو ہجرت کا حکم دیا۔ اور وہ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں مکّہ سے روانہ ہو گئے۔ آپؐ خود بھی حضرت ابوبکرؓ، ان کے مولیٰ، اور عبداللہ بن ارقم الدیلی کو ہمراہ لے کر مدینے روانہ ہوئے۔ لوگوں کی امانتوں کو، جو آپؐ کے پاس تھیں، واپس کرنے کی غرض سے آپؐ نے حضرت علیؓ کو مکّہ میں چھوڑا اور وہ بھی اِس کام سے فارغ ہو کر آپؐ سے آملے۔ رسول اللہ کی عمر ہجرت کے وقت ۵۳ برس کی تھی۔ پیر کا دن تھا اور ربیع الاوّل کی ۱۲ راتیں گذری تھیں۔ کہ آپؐ مدینہ میں داخل ہوئے۔ یہاں سے تاریخ ہجرت شروع ہونی چاہیئے تھی۔ لیکن آسانی کے لئے یہ قرار دیا گیا کہ اس سال کے محرّم سے ہجری سنہ کا آغاز ہو اس لئے کہ ہر سال محرم سے شروع ہوتا ہے۔ آپؐ پہلے قُبا میں آکر ٹھہرے (جو مدینہ منوّرہ کے جنوب مغرب میں تقریباً ۳ میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں آپؐ نے مسجد بنوائی جو عصرِ اسلامی کی پہلی مسجد ہے۔ اس مسجد کے صحن میں ایک قبہ اُس مقام پر بنا ہے جہاں مکّے سے آنے پر

آپؐ کی اونٹنی ٹھہری تھی) آپؐ نے یہاں ایک ماہ چار یوم قیام کیا۔ ۵ ماہ بعد آپؐ نے مہاجرین وانصار کے درمیان مؤاخاۃ کرائی، یعنی اُن کا ایک دُوسرے کے ساتھ بھائی چارہ کرادیا (اس سے ۶ ماہ بعد دشمنانِ اسلام کے خلاف غزوات کا سلسلہ شروع ہوا۔ اُن میں سے اہم یہ ہیں :- ہجرت کے دُوسرے سال میں غزوۂ بدر، تیسرے سال میں غزوۂ اُحد، پانچویں سال میں غزوۂ خندق، ساتویں میں خیبر، آٹھویں میں فتح مکّہ اور غزوۂ حُنَین، نویں سال میں غزوۂ تبوک)۔

بقولِ ابن قتیبہ حنین کے بعد رسولؐ اللہ نے طائف کا محاصرہ کیا۔ اور وہ محاصرہ چند ماہ تک جاری رہا۔ فتح طائف کے بغیر ہی آپؐ مدینے واپس آئے۔ اور رجب ۹ھ تک وہاں مقیم رہ کر بلادِ روم کی طرف روانہ ہوئے اور تبوک تک پہنچے۔ یہ آخری حد تھی جہاں آپؐ پہنچے۔ وہاں آپؐ نے ایک مسجد بنائی۔ آپؐ نے اسی سفر میں خالد بن الولید کو دُومۃ الجندل بھیجا اور اس کا حاکم اُکَیدِر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اس سے جزیے کی ادائگی کی شرط پر صلح ہوئی۔ اس کے بعد آپؐ مدینۂ طیبہ میں واپس تشریف لائے، اور اسی سال کے زمانۂ حج تک وہیں ٹھہرے رہے۔ پھر حضرت ابوبکرؓ کو امیر الحاج مقرر کرکے مکّہ معظمہ بھیجا۔ یہ پہلا حج تھا جو زمانۂ اسلام میں آیا۔ ۱۰ھ میں رسولؐ اللہ مدینے ہی میں مقیم رہے، اور عربوں کے وفود ہر طرف سے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ نیز آپؐ نے ملوکِ عالم کو قاصد بھیجے۔ اور لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد سُورۃ "اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ" نازل ہوئی۔ جس سے آپؐ کو اپنے کام کی تکمیل اور حیاتِ ارضی کے خاتمے کا علم ہوا۔ آپ حج کے لئے تشریف لے گئے۔ حج کرکے مدینے واپس آئے اور ۱۰ھ کے باقی ایّام اور ۱۱ ہجری کی بارھویں ربیع الاوّل کی رات تک مدینۂ منوّرہ میں،

مقیم رہے۔ پیر کے دن آپؐ نے رحمتِ باری تعالیٰ کی طرف انتقال فرمایا۔ اس حساب سے مدینہ منوّرہ میں آپ کامل دس سال مقیم رہے۔ آپؐ نے ۶۳ سال عمر پائی۔ کہتے ہیں کہ آپؐ دو شنبہ کے دن پیدا ہوئے، بعثت بھی دو شنبے کے دن ہوئی۔ آپؐ مدینے میں بھی اسی دن داخل ہوئے اور انتقال بھی اسی دن فرمایا۔ بدھ اور جمعرات کی درمیانی رات کو حضرت عائشہؓ کے حجرے میں جہاں آپ نے انتقال فرمایا تھا۔ وہیں آپؐ کو دفن کیا گیا۔

حیاتِ پاک کے اس مختصر خاکے کے متعلق یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہجرت سے پہلے کے واقعات میں بالعموم راویوں کے بیانات میں اختلاف ہے۔ کم یا زیادہ، مگر ہجرت کے بعد کے واقعات میں اس قسم کا اختلاف نہیں پایا جاتا، مثال کے طور پر آپؐ کی تاریخِ ولادت ہی پر غور فرمایئے۔ "العقد الفرید" قاہرہ ۱۳۲۱ھ (۲ : ۲۰۱) میں ہے :۔

"کہتے ہیں رسول اللہ عامِ فیل میں پیدا ہوئے۔ ربیع الاوّل کی دس راتیں گذر چکی تھیں۔ اور بعض نے کہا کہ دو راتیں گذری تھیں۔ اور بعض نے کہا کہ (واقعۂ) فیل سے تیس دن گذر چکے تھے۔"

اور تنوخیؒ نے لکھا ہے کہ صحیح ترین قول یہ ہے کہ اصحاب فیل کے آنے سے ۵۰ دن بعد آپؐ کی ولادت ہوئی۔ "طبقات ناصری" میں ہے کہ ربیع الاوّل کے ۱۴ دن گذر چکے تھے "سالِ فیل" کے دو مہینے گذر چکے تھے۔

اسی طرح کے ایک اور اختلاف کی مثال ملاحظہ ہو :۔

"العقد" میں ہے :۔ "اللہ نے آپؐ کی طرف وحی اُس وقت بھیجی جب آپؐ کی عمر ۴۰ برس کی تھی۔ آپؐ مکّے میں دس سال ٹھہرے اور مدینے میں دس سال۔ ابن عباسؓ نے کہا، کہ آپؐ مکّے میں پندرہ برس ٹھہرے اور مدینے میں دس سال۔ اور اجماع اس پر ہے کہ آپؐ

مکّے میں تیرہ سال رہے اور مدینے میں دس سال۔" یہ ابن عبد ربّہ صاحب العقد کا قول ہے اس آخری قول کی کہ آپؐ دس سال سے زیادہ مکّے میں ٹھہرے۔ حضرت حسّان بن ثابتؓ کے قول سے بھی تائید ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں :۔

ثَوَی فی قریشٍ بِضْعَ عَشْرَۃَ حِجَّۃً ۔ یُذَکِّرُ لو یلقی حبیبًا مُوَاتِیا

و یَعْرِضُ فی اھل المواسمِ نفسَہ ۔ فلم یرَ مَن یُؤْوِی و لم یر داعیا

فلمّا اتانا و اطمأنّت بہ النّویٰ ۔ فاصبح مسرورًا بطیبۃَ راضیا

" آپؐ قریش میں دس سے کچھ اوپر سال ٹھہر کر وعظ کرتے رہے۔ کاش کوئی موافق دوست آپ کو ملتا۔ آپؐ اپنے آپ کو مواسم میں پیش کرتے رہے۔ نہ کوئی پناہ دہندہ ملا، نہ کوئی دعوت دینے والا نظر آیا، ہاں جب ہمارے پاس آئے اور سفر ختم ہوا تو آپؐ مدینے میں خوش و خرّم ہو کر رہے۔" (بِضْعَ عَشْرَۃَ سے مراد ۱۳ سے ۱۹ تک ہو سکتی ہے)

ہم نے سیرتِ پاک کے اہم وقائع پر ایک نظر ڈالی۔ اب اس کے بعد ہم آپؐ کے حلیۂ مبارک اور آپؐ کی سیرت کے بعض اور جزئیات پر نظر ڈالنے کا شرف حاصل کریں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ!

حُلیۂ مبارک

گذشتہ مقالے میں ہم نے حیاتِ طیّبہ کے اہم واقعات کو اجمالاً شروع سے آخر تک مطالعہ کیا۔ اب ہم حلیۂ مبارک بیان کرنے کا شرف حاصل کرتے ہیں :۔

سیرت ابن ہشام (طبع یورپ) میں (صہ ۲۶۶ پر) ہے کہ حضرت علیؓ جب نبیؐ کی صفت بیان کرتے، تو فرماتے :۔

"آپؐ نہ لمبے تھے نہ ٹھگنے، بلکہ میانہ قد تھے۔ آپؐ کے بال نہ گھونگھریالے تھے نہ لٹکے ہوئے، آپؐ زیادہ فربہ نہ تھے۔ آپؐ کا چہرہ زیادہ گولائی پر نہ تھا۔ آپؐ کا رنگ سُرخی ملا ہُوا تھا۔ آپؐ کی آنکھیں کشادہ تھیں اور ان کی سیاہی گہری تھی۔ آنکھوں کی پلکیں لمبی تھیں۔ اعضا اور کندھوں کی ہڈیوں کے سرے بڑے بڑے تھے، آپؐ کم مُو تھے، سینے سے ناف تک بالوں کی ایک پتلی سی لکیر تھی۔ آپؐ کی دونوں ہتھیلیاں اور دونوں قدم پُرگوشت تھے۔ چلتے تو پاؤں زمین سے بقوّت اٹھا کر چلتے، گویا نشیب میں اُتر رہے ہیں۔ مڑتے تو یکبار مُڑتے، آپؐ کے دونوں شانوں کے درمیان مہرِ نبوّت تھی اور وہ (اُنؐ پر درُود اور سلام ہو) خاتم النبیّین تھے، اور سب سے زیادہ سخی، سب لوگوں سے زیادہ جری، سب سے زیادہ راست گو اور ذمّے داری کو پُورا کرنے والے، نرم خُو اور کریمانہ خوشدلی کے مالک تھے۔ جس نے آپؐ کو ناگاہ دیکھا ہیبت زدہ ہُوا۔ اور جو آپؐ کو جاننے کے بعد آپؐ سے ملا، آپؐ سے محبّت کرنے لگا۔ آپؐ کی صفت بیان کرنے والا کہتا ہے کہ میں نے آپؐ جیسا نہ آپؐ سے پہلے دیکھا اور نہ آپؐ سے بعد۔" (آزاد ترجمہ)

اِس سے زیادہ مفصل روایت "طبقاتِ ناصری" (طبع کوئٹہ، ۱: ۴۷) میں دی ہے۔ وہ مختصراً یوں ہے:-

"حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسّلام باہیبت تھے۔ جو آپؐ کو دُور سے دیکھتا تھا اُس پر خوف طاری ہو جاتا تھا، مگر نزدیک تر آتا تھا تو اس کے دل میں سکون اور راحت پیدا ہو جاتی تھی۔ آپؐ بشاش رُو تھے۔ آپؐ کے چہرہ پر نُور چمکتا تھا۔ آپ دراز بالا تھے۔ آپؐ کا سر گول تھا، گھونگھریالے بال بُنِ گوش تک آتے تھے۔ کھینچنے سے کندھے تک آجاتے، مگر چھوڑنے سے پھر اپنی جگہ چلے جاتے تھے۔ آپ فراخ پیشانی، کشادہ

ابرو تھے، آپؐ خفا ہوتے تو ابروؤں کے درمیان کی رگ نمایاں ہو جاتی۔ آپؐ باریک بین، باریک لب اور کشادہ دندان تھے۔ چہرہ گول تھا، آپ شیریں سخن، لطیف آواز تھے۔ بالوں کا رنگ سیاہ تھا۔ آپؐ سپید عارض، زیبا گردن اور معتدل اندام تھے۔ آپؐ کی پشت و شکم راست اور سینہ فراخ تھا۔ سینے سے ناف تک چھوٹے چھوٹے بالوں کا ایک ایسا خط تھا کہ گویا مُو قلم سے بنایا گیا ہے۔ بازو لمبے، ہتھیلیاں کشادہ، انگلیاں باریک لمبی اور کشادہ تھیں، ناخن لمبے تھے۔ آپؐ دیکھتے تو دو گوشۂ چشم سے دیکھتے تھے۔ آپؐ اکثر اپنی نظر زمین کی طرف رکھتے تھے۔ آپؐ میں آہستگی تھی، تُرشروئی نہ تھی۔ آپؐ ہنسنے کے بغیر شادماں طبع تھے۔ آپؐ کا حکم عدل، آپؐ کی گفتار حکمت تھی۔ آپؐ سخاوت پیشہ، پُردل اور نرم گو تھے۔ تُند خُو نہ تھے۔ بدی کا بدلہ بدی سے نہ دیتے تھے۔ گناہ گار کا گناہ معاف کر دیتے تھے۔ آپؐ کے دونوں کندھوں کے درمیان ایک سیاہ خال تھا، دینار سے کمتر، زردی مائل، یہ مُہرِ نبوّت تھی کہ جس سے بوئے مُشک کے مانند خوشبو آتی تھی۔ صلوٰۃ اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ۔"

حیاتِ طیبہ کے سنین اور حضورؐ کا حُلیہ مبارک ذہن میں محفوظ کر لینے کے بعد آپؐ کے حالات پر ہم مزید غور کرتے ہیں ؎ معاصر فاضل بتنونی کہتے ہیں کہ :۔

"قریش کے درمیان آپؐ کی ابتدائی زندگی ایک مردِ عاقل، حکیم، شجاع، کریم اور بَرِّ رحیم کی زندگی تھی۔ آپؐ تقویٰ اور زہد و ورع میں اپنا وقت صرف فرماتے تھے، لوگوں کی سیرتوں میں جو قابلِ اعتراض باتیں ہوتی ہیں۔ آپؐ اُن سے دُور، قول و فعل میں صادق، بلند ہمّت، بزرگ مروّت تھے۔ یہی وجہ تھی کہ قریش کے دل میں آپؐ کی بزرگی اور عظمت کے نقوش تھے۔ وہ آپؐ سے مشورہ لیتے تھے" اور آپؐ کے فیصلوں کو مانتے تھے" اور آپؐ کو

"الصادق الامین" کے نام سے موسوم کرتے تھے۔"

آپؐ کی تیزیٔ ذہن، فصاحت و بلاغت کا یہ عالم تھا کہ آپؐ کے کلمات امثال کے طور پر لوگوں کی زبانوں پر جاری تھے، خصوصاً اسلام کے آنے کے بعد، یہ کلمات بلند مضمون اور تھوڑے لفظوں میں بہت سا مطلب ادا کرنے والے ہیں، کتبِ حدیث و سیرت و ادب میں یہ کلمات محفوظ ہیں، مثال کے طور پر ذیل کے فقروں پر غور کیجیے:۔

دستِ بالا دستِ زیرین سے بہتر ہے۔ ترکِ شر صدقہ ہے۔ جو زمین پر ہے اُس پر رحم کرو، جو آسمان پر ہے وہ تم پر رحم کرے گا۔ نیکی کی راہ بتانے والا، نیکی کرنیوالے کے مانند ہے۔ ہر نیکوئی صدقہ ہے۔ تیری کسی شئے سے محبّت تجھے اندھا اور بہرا کر دیتی ہے۔ بلا بولنے سے وابستہ ہے۔ جنگ فریب سے انصرام پاتی ہے۔ سرآغازِ حکمت خوفِ خدا ہے۔ (احسان) ان سے شروع کرو جن کو تم نفقہ و خورش دیتے ہو (یعنی اوّل خویش بعدہٗ درویش) فضلِ علم فضلِ عبادت سے بہتر ہے۔ آدمی اپنے بھائی کی وجہ سے کثیر بنتا ہے (یعنی کسی کا بھائی نہ ہو تو وہ ایک ہے، بھائی ہو تو اُسے کثرت حاصل ہوئی)، اعمال صرف نیّتوں پر منحصر ہیں۔ تونگری دل کی تونگری ہے۔ حیا سر بسر خیر ہے۔ لوگ کانیں ہیں اُسی طرح، جس طرح سونے چاندی کی کانیں۔ جو شخص اپنی ذات کیلئے ایک چیز کو مفید سمجھتا ہے مگر تیرے لئے اسے مفید نہیں سمجھتا اُس شخص کی صحبت میں تیرے لئے کوئی خیر نہیں۔ صادق کا تاجر کبھی مفلس نہیں ہوتا۔ امور میں سے بہترین درمیانی چیز ہے (یعنی وہ جو اس کے دونوں کناروں کے مابین ہو) تھوڑا مال جو کفایت کرے، اُس کثیر مال سے بہتر ہے جو اپنے ہی میں مصروف کرے۔ کریموں کی لغزش کو معاف کر دیا کرو۔ قریب ہے کہ فاقہ کفر بن جائے۔ اپنی دُنیا کیلئے اِس طرح کام کرو گویا تم ہمیشہ زندہ رہو گے، اور آخرت کیلئے

اس طرح گویا تم کل مرجاؤ گے۔ وغیرہ وغیرہ (البتونی الرحلۃ الحجازیۃ قاہرہ ۱۳۲۹ھ ص ۲۶)۔

آپؐ کی جن صفاتِ بزرگ کا ذکر ہوا ہے۔ اُن کی وجہ سے آپؐ بالطبع نبوّت کی ذمّے داری کا بارِ گراں اُٹھانے کیلئے تیار تھے۔

اسلام سے پہلے عرب میں اور متصلّہ ممالک میں مذہبی فرقہ بندی کا زور تھا عربوں میں اکثر لوگ بُت پرست تھے، کچھ صابی اور کچھ مجوسی بھی تھے۔ یہودیوں میں چند فرقے تھے، مثلاً ربّانیّین اور قرّائین اور سامریّہ۔ نصاریٰ کے بھی کئی فرقے تھے۔ مثلاً یعقوبی، نسطوری، ملکی وغیرہ۔ منجملہ اور اسباب کے یہ فرقہ بندیاں بھی سلطنت ہائے روم و فارس کے اختلال کا سبب بنیں۔ اس لئے کہ ان فرقوں کے مجادلوں سے شدید مخاصمتیں پیدا ہوتی تھیں۔ عین اُس وقت اللہ پاک نے اپنے نبیؐ کو دینِ متین دے کر سارے عالم کی طرف بھیجا اور آپؐ صبر و استقلال کیساتھ مسلسل کوشش کرتے رہے کہ اسلام کی عمارت کی بنیادیں مضبوط ہوں اور گو آپؐ کی قوم نے حسد اور ضد کی وجہ سے آپؐ کی اہانت کی اور نئے دین کی پابندیاں اپنے اوپر عائد کرنے کے بجائے آپؐ کا ہر طرح سے مقابلہ کیا، مگر آپؐ کی ملال ناپذیر طبیعت نے ان اہانتوں کی کچھ پروا نہ کی۔ استقلال و ثبات اور حسنِ بصیرت و حلم کو کارفرما کرکے یہی کہا۔ "اے اللہ میری قوم کو ہدایت دے، اس لئے کہ وہ نہیں جانتے"۔ آخر ایک جماعت آپؐ پر ایمان لائی اور آپؐ کے ساتھ ہجرت کرکے مدینے پہنچی اور انصار کے ساتھ مل کر آپؐ کے تمام غزوات میں آپؐ کا ساتھ دیا، تاآنکہ دشمنوں کی دشمنی ناکام ہوئی۔ اور جو کچھ اللہ پاک نے آپ پر نازل کیا تھا اس کی سب نے تصدیق کی، اور اس پر ایمان لائے۔ ان غزوات سے مسلمانوں نے لشکروں کو تیار کرنا، سیاستِ حروب، میدانِ جنگ کی ثابت قدمی، شجاعت اور شدائد پر صبر کرنا سیکھا۔ یہاں تک کہ دشمن اُن

سے خائف ہوئے اور ان کے مرتبے کی بلندی کو تسلیم کیا۔ رسول اللہ نے عربوں کی سیرت اور اخلاق کی درستی اور ان کے نفوس کی تربیت کے بارے میں اتنی کوشش کی کہ ان میں نئے اخلاق، درست رائیں اور بلند ارادے پیدا ہوئے۔ پھر جو ان کے مقابلے میں آیا اس نے مُنہ کی کھائی۔ آپؐ نے مہاجرین و انصار کو سعیِ پیہم سے فضائل کے راستوں پر چلایا، اور رذائل کے راستوں سے ہٹایا۔ بُری عادتیں جو ان کو پڑ چکی تھیں، ان سے چھڑوائیں۔ مثلاً لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا، شراب خواری، ناحق و ناروا قتلِ نفوس کا ارتکاب، ازلام کے ذریعے چیزوں کا بانٹنا، پتھروں کو پوجنا، مَیسر کا کھیلنا، جھوٹ، نفاق، ریا کاری، دُوسروں کا مال چھیننا، عورتوں کے ساتھ بدسلوکی، غلاموں پر سختی، تاآنکہ ان میں بیٹیوں سے محبت کرنا عام ہو گیا۔ انہوں نے مسکرات کو چھوڑ دیا۔ زندگی کے معنیٰ اور اس کا مقصد ان کے ذہن نشین ہو گیا۔ توحید ان کا دین بن گیا۔ سچائی، خلوص و صراحت اور رحمت کی فضیلت ان کے دلوں میں بیٹھ گئی۔ آپ ان کو ذاتی اور اخلاقی شجاعت کا سبق دیتے رہے۔ حقیقی زندگی کی منزلیں طے کراتے رہے، یہاں تک کہ ان کی امیدیں بلند ہو گئیں اور وہ خدمتِ انسانیّت میں عظیم الشان کارناموں کی طرف مائل ہو گئے۔ دین اسی خدمتِ انسانیّت کی تائید کیلئے آیا تھا۔ اور انسانیّت کو پستی سے نکالنا، اس کے کلمے کا بلند کرنا، اور جس مطلب کے لئے انسان پیدا ہوا تھا اس تک اس کو پہنچانا، یہی اس دین کا مقصد تھا۔ جو معاملات پیش آتے رہے۔ اُن کے نظام کیلئے وقتاً فوقتاً دو طرح کے قانون بنتے رہے۔ ایک تو وہ معاملات جن کے متعلق وحی آتی رہی۔ یہ قانون قرآن مجید میں محفوظ ہے۔ دُوسرے وہ معاملات جن کے متعلق کوئی وحی نازل نہ ہوئی اور حضورؐ نے ان کا فیصلہ خود کیا۔ یہ فیصلے کتبِ حدیث شریف میں محفوظ ہیں۔ آپؐ نے متصلہ حکومتوں کو بھی دین کی دعوت دی۔ ملوکِ روم و فارس و مصر و

یمن و حبشہ کو دینِ الٰہی کا پیغام بھیجا اور اپنی دعوت کو مکمل کیا۔ جب سنہ ہجری آیا، تو بلادِ عرب تمام کے تمام فتح ہو چکے تھے۔ اور عرب کے شمال کی جانب کے لوگ جزیے کی ادائیگی کی شرط پر صلح کر چکے تھے۔ اسی سال میں اُمّتِ عربیہ تیار ہو گئی کہ دینِ اللہ کی نشر و اشاعت چار دانگِ عالم میں کرے حضورؐ کی ماموریّت اس پر مکمل ہو گئی۔ آپؐ نے آخری حج یعنی حجّۃ الوداع ادا کیا۔ اور جمعہ کے دن عرفہ کے میدان میں خطبہ دیا۔ اور عین اس کے بعد یہ آیت شریفہ نازل ہوئی :۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔

"آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کیا۔ اور تمہارے لئے دینِ اسلام کو پسند کیا"

اپنے عظیم الشان کام کے مکمل ہونے کے بعد، جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ ۱۲ ربیع الاول سلہ کو آپ نے رحمت الٰہی کی طرف انتقال فرمایا ۔

قرآن مجید

حفاظتِ وحی و قرآن مجید

گذشتہ مقالے میں ہم نے حلیۂ مبارک کے ذکر کے بعد حضورؐ کی فصاحت و بلاغت اور ان اصلاحات کا ذکر کیا تھا جو آپؐ نے عربوں کی سوسائٹی میں کیں اور جن سے آپ نے عربوں کو دین اللہ کی نشر و اشاعت کیلئے تیار کیا اور اس نظامِ تشریعی کا ذکر کیا جو وحی کے ذریعے یا حضورؐ کے اپنے فیصلوں سے مرتب ہوا۔ اب ہم اس وحی کے متعلق جو قرآن مجید میں محفوظ ہے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

بخاری شریف میں "کیف کان بَدْءُ الوحیِ الی رسول اللہ" کے عنوان سے ایک باب باندھا ہے۔ اس میں یہ کیفیت یوں بیان ہوئی ہے:۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حارث بن ہشام نے رسول اللہؐ سے پوچھا کہ یا رسول اللہؐ! آپ پر وحی کس طرح آتی ہے؟ آپؐ نے فرمایا "کبھی تو میرے پاس وحی جرس کی آواز کی طرح آتی ہے، اور تمام قسموں میں (وحی کی یہ قسم) مجھ پر زیادہ دشوار ہے۔ پھر فرشتہ جو کچھ کہے اُسے اخذ کر چکتا ہوں تو یہ کیفیت مجھ سے دُور ہو جاتی ہے۔ اور کبھی فرشتہ میرے سامنے آدمی کی صورت بن کے آجاتا ہے اور مجھ سے کلام کرتا ہے۔ جو کچھ وہ کہتا ہے میں اُسے حفظ کر لیتا ہوں۔"

حضرتِ عائشہؓ فرماتی ہیں: بیشک میں نے سخت سردی کے دن آپؐ پر وحی اترتے

ہوئے دیکھی۔ جب وہ کیفیت ختم ہو جاتی تھی تو آپؐ کی پیشانی سے پسینہ بہنے لگتا تھا۔

اِسی باب میں ایک اور حدیث منقول ہے: حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں، کہ رسولؐ اللہ نزول (قرآن)، سے سخت محنت اٹھاتے تھے۔ اور از اں جملہ یہ تھا کہ آپؐ اپنے دونوں ہونٹ جلد جلد ہلاتے تھے (تاکہ وحی یاد ہو جائے) ابن عباسؓ نے کہا: میں اپنے ہونٹوں کو تمہارے سمجھانے کیلئے اُسی طرح حرکت دیتا ہوں جس طرح رسولؐ اللہ انہیں حرکت دیتے تھے۔ اِس پر اللہ عزّ وجلّ نے (یہ آیت) نازل فرمائی۔

لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ

"اے محمدؐ! قرآن کو جلد یاد کرنے کیلئے تم اپنی زبان کو (بہت) حرکت نہ دیا کرو، یقیناً اس کا جمع کرنا اور پڑھا دینا ہمارے ذمّے ہے۔"

ابن عباسؓ کہتے ہیں۔ "یعنی قرآن کا تمہارے سینے میں جمع کر دینا اور اُسے تمہارا پڑھنا، پھر جس وقت ہم اسے پڑھ چکیں تو تم اس کے پڑھنے کی پیروی کرو۔" ابن عباسؓ کہتے ہیں یعنی اسے سنو اور چپ رہو، پھر یقیناً اس کے مطلب کا سمجھانا ہمارے ذمّے ہے اور بیشک ہمارے ذمّے ہے کہ تم اسے پڑھو۔ اس کے بعد رسولؐ اللہ کے پاس جبرئیل آتے تھے تو آپ سنتے تھے۔ اور جب جبرئیل چلے جاتے تو جس طرح جبرئیلؑ نے پڑھا تھا، اُسی طرح اُسے پڑھتے تھے۔

اِس سے پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ حضورؐ چالیس برس کے تھے جب آپ پر وحی آنا شروع ہوئی، اور بتدریج آتی رہی۔ اور ۲۳ سال یعنی آپؐ کی باقی ماندہ زندگی کے تقریباً آخر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ کسی وقت کی تخصیص نہ تھی۔ سفر، حضر، دن، رات، تنہائی میں، مجلس میں، مختلف اوقات میں وحی آتی رہی۔ کبھی پے در پے وحی آتی، کبھی مدت تک وحی

منقطع رہتی۔ جب وحی نازل ہوتی تو آپ کسی صحابی کو بلا کر، جو لکھنا جانتا وحی لکھوا دیتے اور فرما دیتے کہ اسے فلاں سورت میں فلاں مقام پر لکھ لو۔ اور صحابی بھی اسے یاد کر لیتے۔ بعض صحابی اپنے طور پر بھی قرآن جمع کرتے رہے۔ چنانچہ "کتاب الفہرست" میں سات صحابہ کا نام دیا ہے، جو عہد نبوی میں قرآن جمع کرتے تھے۔ ان میں حضرت علیؓ، حضرت ابو الدرداءؓ، حضرت معاذؓ بن جبل وغیرہم شامل تھے۔ "فتوح البلدان" میں ہے کہ جب اسلام آیا، تو قریش کے ۱۷ آدمی لکھنا جانتے تھے۔ ان کے علاوہ اسی کتاب میں پانچ عورتوں کے نام بھی دیئے ہیں، جو کاتبہ تھیں۔ مدینے کے اوس و خزرج میں نسبتاً کم کاتب تھے۔ مکہ میں رواج کتابت زیادہ تھا، اس لئے کہ اہل مکہ تاجر لوگ تھے۔ اور تجارت میں کتابت جاننے کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے۔ اس زمانے میں حجاز میں کاغذ کا پتہ نہ تھا۔ کتابت قرآن کے لئے جھلیوں کے ٹکڑے، پتلے سفید پتھر اور کھجور کی ٹہنیاں جن سے پتے دور کیے ہوئے ہوں استعمال میں لاتے تھے۔ "کتاب الفہرست" میں جمع و نشر قرآن کے متعلق ایک فصل دی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ زید بن ثابتؓ نے ایک راوی سے کہا، مجھے (حضرت) ابو بکرؓ کے پاس بھیجا گیا، میں گیا تو (حضرت) عمرؓ بن الخطاب بھی وہیں تھے۔ (حضرت) ابو بکرؓ نے مجھ سے کہا، "عمرؓ میرے پاس آئے اور مجھ سے کہا کہ یمامہ کی لڑائی میں قرآن خواں بہت قتل ہوئے ہیں اور مجھے ڈر ہے کہ اور لڑائیوں میں بھی اسی طرح قرآن خواں قتل ہوئے تو بہت قرآن جاتا رہے گا، اس لئے میری رائے ہے کہ قرآن فوراً جمع کر لیا جائے۔ میں نے عمرؓ سے کہا، "جو کام رسول اللہ نے نہیں کیا، وہ میں کیسے کروں؟" وہ مجھ سے اس بارے میں بار بار گفتگو کرتے رہے ہیں۔ تاآنکہ اللہ تعالیٰ نے میرے سینے کو اس بارے میں کھول دیا۔ اور اب میری بھی وہی رائے ہے، جو عمرؓ کی ہے۔" زیدؓ بن ثابت کہتے ہیں "(حضرت) ابو بکرؓ نے مجھ سے کہا: تم

جوان عقلمند آدمی ہو، اور ہم رسول اللہ کے بارے میں تمہیں متہم نہیں کرتے۔ تم رسول اللہ کیلئے وحی لکھا کرتے تھے۔ اب قرآن کا تتبع کرو اور اسے جمع کرو" زیدؓ کہتے ہیں: "واللہ پہاڑوں میں سے کسی پہاڑ کا ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا میرے لئے اس سے زیادہ گراں وزن نہ تھا جتنا سارے قرآن کا جھلیوں، سفید پتلے پتھروں، کھجوروں کی ٹہنیوں اور لوگوں کے حفظ سے جمع کرنا، جس کا مجھے حکم ملا۔ یہاں تک کہ سورۃ توبہ مجھے ابوخزیمہ الانصاری کے پاس ملی، اور کسی کے پاس نہ تھی۔ یعنی لقد جاءکم رسولٌ من انفسکم عزیزٌ علیه ماعنتم..... سے آخر سورۃ تک (یعنی آخری دو آیتیں) (یہ یاد رہے کہ محمد بن نعمان بن بشیر کی روایت میں سورۂ توبہ ترتیب نزول کے اعتبار سے آخری سورت تھی) یہ صحیفے (حضرت) ابوبکرؓ کے پاس ان کی زندگی میں موجود رہے تا آنکہ انہوں نے انتقال فرمایا پھر (حضرت) عمرؓ کے پاس موجود رہے، تا آنکہ انہوں نے بھی انتقال فرمایا پھر (حضرت) حفصہؓ بنت عمرؓ کے پاس رہے۔ محمد بن اسحٰق کہتے ہیں کہ ثقہ آدمیوں سے روایت ہے کہ حذیفہ بن الیمان عراق میں تھے۔ وہ وہاں سے (حضرت) عثمان بن عفان کے پاس آئے اور ان سے کہا۔ اس امّت کا معاملہ سنبھالیئے، اس سے پیشتر کہ ان میں کتاب (اللہ) کے بارے میں یہود ونصاریٰ کا سا اختلاف پیدا ہو (حضرت) عثمانؓ نے (حضرت) حفصہؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ صحیفے ہمارے پاس بھیج دیں تاکہ ہم ان کو مصاحف میں نقل کرلیں اور اصل آپ کے پاس واپس بھیج دیں۔ (حضرت) حفصہؓ نے صحیفے (حضرت) عثمانؓ کے پاس بھیج دیئے، اور (حضرت) عثمانؓ کے حکم سے زید بن ثابتؓ اور عبداللہؓ بن الزبیر اور سعیدؓ بن العاص، اور عبدالرحمٰن بن الحارثؓ بن ہشام نے انہیں مصاحف میں نقل کیا۔ (حضرت) عثمانؓ نے قریش کے ان آدمیوں سے کہا تھا کہ اگر کسی چیز کے متعلق ان میں، اور زید بن ثابت میں (جو انصاری تھے)

اختلاف ہو تو مصاحف میں وہی لکھا جائے جو لسانِ قریش کے مطابق ہو۔ اس لئے کہ قرآن قریش کی زبان میں اُترا۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ جب مصحف لکھا جا چکا تو حضرت عثمانؓ نے صحف (حضرت) حفصہؓ کو واپس بھیج دیئے، اور نقل شدہ مصاحف میں سے ایک ایک ہر علاقے میں بھیج دیا، اور ان کے سوا ہر صحیفے اور مصحف کو جلوا دیا۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ قرآن مجید میں سورتیں ترتیبِ نزول پر مرتّب نہیں ہیں۔ جمعِ قرآن مجید کی تفصیل آپ نے سُن لی۔

اب ہم مکّی اور مدنی سورتوں کے فرق پر غور کرتے ہیں۔ قرآن مجید کی بعض سورتیں مکّے شریف میں نازل ہوئیں، بعض مدینے شریف میں۔ اور چونکہ دونوں مقامات میں مختلف مسائل درپیش تھے۔ اس اعتبار سے ان دو طرح کی سورتوں میں بھی فرق ہے مکّی سورتوں میں بُت پرستی سے ہٹا کر لوگوں کو توحید کی طرف لانا تھا اس لیے ان سورتوں میں یہ مقصد ہر وقت پیشِ نظر ہے۔ اِن سورتوں میں جابجا خداوندِ پاک کی عظمت و جبروت کا درس دیا گیا ہے۔ انفس و آفاق کی طرف توجہ دلا کر اور قصصِ انبیاء علیہم السّلام سُنا کر سب کو سمجھایا گیا ہے کہ توحیدِ الٰہی کے ثبوت مظاہرِ قدرت اور تاریخِ بشر میں موجود ہیں۔ اس کے برعکس بُت ناکارہ اور بے بس ہیں، ان کی پوجا عقل کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ مکّی سورتوں میں جنّت و دوزخ کے حالات بیان ہوئے ہیں۔ اور ثواب و عذاب کی کیفیات ذہن نشین کی گئی ہیں۔ غرض چار بنیادی عقائد پر زور دیا گیا ہے۔ یعنی:-

ا۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں (۲) محمدؐ رسول اللہ ہیں، اور قرآن مجید خدا کا کلام ہے اور بذریعہ وحی آپؐ پر نازل ہوا (۳) قیامت کے دن حشر موتی ہونے کے بعد اعمال کا حساب ہو گا (۴) نیک لوگ بہشت میں جائیں گے اور بُرے لوگ دوزخ میں۔

۱۰۲۵۹

جیسا کہ معلوم ہے، مدینے میں حالات مختلف تھے۔ اہلِ مکہ تو ایک معبد یعنی کعبے کے خادم تھے۔ اس معبد کی حیثیت برقرار رکھنے میں ان کو دلچسپی تھی۔ اس لئے کہ قبائل میں ان کی اپنی حیثیت برقرار رکھنے پر اس کا اثر پڑتا تھا۔ اس کے برعکس اہلِ مدینہ کو بُت پرستی سے کوئی مادی دلچسپی تھی، نہ کسی خاص انتفاع کی امید۔ اُن کے لیے کسی معبد کی حفاظت ضروری نہ تھی۔ وہ نسبتاً جلد بُت پرستی کو ترک کرنے اور توحید قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ مدینے میں نئی اسلامی حکومت کا سنگِ بنیاد رکھا جا چکا تھا۔ اس کے لئے قوانین اور قواعد و ضوابط کی ضرورت تھی۔ مدنی سورتوں میں اجتماعی اور مُلکی زندگی سے متعلق باتیں ہیں۔ اور روزے، زکوٰۃ، حج وغیرہ کے احکام ہیں۔ نکاح و طلاق اور وراثت کے قوانین ہیں۔ غرض ایک نئی سلطنت اور اس کی ضروریات سے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں، ان کا نظام قائم کیا گیا ہے۔ مکے کے بُت پرستوں کی جگہ مدینے میں یہودیوں اور منافقوں نے لے لی۔ اس لئے ان کا ذکر اور ان کے پیدا کردہ مسائل کا ذکر بھی ایسی بہت سی آیاتِ شریفہ میں آیا ہے جو مدنی سورتوں میں ہیں۔ باوجود اس فرق کے جس کا ذکر ہوا کتابِ الٰہی کی تمام مکّی اور مدنی سورتوں میں دلوں کا جلانا، عقلوں کا جگانا اور لوگوں کو اندھیرے سے روشنی میں لانا مشترک طور پر مقصود ہے، چنانچہ ارشاد ہوا ہے:-

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۵ : ۱۸)

"اللہ کی طرف سے تمہارے پاس نور (ہدایت) اور قرآن آچکا ہے (جس

کے احکام) صاف (وصریح) ہیں۔ جو لوگ خدا کی رضامندی کے طلبگار ہیں اُن کو اللہ قرآن کے ذریعے سے سلامتی کے راستے دکھاتا ہے اپنے فضل (وکرم) سے ان کو (کفر کی) تاریکیوں سے نکال کر (ایمان کی) روشنی میں لاتا ہے، اور ان کو راہِ راست دکھاتا ہے۔"

ہم نے ابتداء وحی، جمع قرآن مجید اور مکّی اور مدنی سُورتوں کا فرق بیان کیا اگلے مقالے میں ابھی ہمیں قرآن مجید کے متعلق کچھ اور کہنا ہے۔

اعجاز القرآن

کل ہم نے ابتداء وحی، جمع قرآن اور مکّی اور مدنی سورتوں کے فرق کے متعلق کچھ گفتگو کی تھی، آج ہم اعجاز القرآن کا ذکر کرتے ہیں۔

عربوں کو قرآن مجید میں تحدّی کی گئی ہے کہ قرآن کا مثل لا سکتے ہو تو لاؤ مقصود اس تحدّی کا یہ ہے کہ قرآن کلام بشر نہیں ہے، ورنہ اور لوگ بھی ایسا کلام لکھ سکتے اس قرآنی تحدّی میں تدریج ہے۔ پہلے فرمایا۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (۱۷: ۹)

"(اے پیغمبر! ان لوگوں سے) کہو کہ اگر آدمی اور جنّات جمع ہو کر اس بات پر آمادہ ہوں) کہ اس قرآن کی طرح کا (اور کلام) بنا لائیں، تب بھی اس جیسا نہیں (بنا) لا سکتے۔ اگرچہ ان میں سے ایک کی پشتی پر ایک (کیوں نہ) ہو"

پھر فرمایا۔

قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ (۱۱ : ۱۶)

(ان سے) کہو (کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو کہ میں نے یہ قرآن اپنے دل سے بنایا ہے تو) تم بھی اسی طرح کی بنائی ہوئی (زیادہ نہیں) دس ہی سورتیں لے آؤ۔"

پھر فرمایا:۔

وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۔ (۲ : ۲۱)

"اور جو ہم نے اپنے بندے (محمدؐ) پر (قرآن) اتارا ہے، اگر تم کو اس میں شک ہو (اور یہ سمجھتے ہو کہ یہ کتاب خدا کی نہیں، بلکہ آدمی کی بنائی ہوئی ہے اور اپنے اس دعوے میں) سچے ہو، تو اس جیسی ایک سورت (تم بھی بنا) لاؤ، اور اللہ کے سوا اپنے حمایتیوں کو بھی بلا لو"

ایک فاضل مصری معاصر استاد شیخ احمد شرباصی اعجازِ قرآن کے متعلق لکھتے ہیں:

"قرآن معجزہ یوں ہے کہ اس میں دقتِ نظم، ترتیبِ کلام، جمالِ اسلوب، الفاظ کی شیرینی، رونق کی چمک دمک اور بیان کا کمال ہے۔ تم قرآن پڑھتے ہو یا سنتے ہو، تو محسوس کرتے ہو کہ اس کے الفاظ دل پر اس طرح اثر کرتے ہیں کہ اور الفاظ ویسا اثر نہیں کرتے، اس کی نظم و ترتیب، مضبوطی و پختگی اور متانت ایسی ہے کہ اس کے سوا اور کسی کلام کی نہیں مصحف شریف تمہارے سامنے ہے، تم اسے لے کر پڑھو اور جو ہم کہہ رہے ہیں اس کو آزما لو۔ الفاظ کے انتخاب میں عجیب و غریب باریکی، اسلوب کا نسق تم کو گرویدہ کرے گا۔"

"قرآن اس لئے بھی معجزہ ہے کہ اس میں معانی کا سرچشمہ ہے۔ ایسا کہ ذہن اس کے

چشموں سے سیراب ہوتے ہیں۔ مگر وہ بدستور لبریز وجوش ہے۔ نہ کم ہو نہ ختم ہو قلم تکان اور فرسودگی سے ٹوٹ جائیں۔ اس سے قبل کہ وہ قرآنی معانی و مفہومات کو ختم کرسکیں کہیں احکام و قوانین ہیں، کہیں اخلاق و آداب، کہیں عبادات و معاملات ہیں۔ کہیں وعظ و تہذیب، کہیں عبرت آموزی اور تذکیر کے شواہد ہیں، کہیں سوچنے اور فکر کرنے کے اشارے غرض دلوں اور عقلوں کے لئے قوت بخش غذائے روحانی ہے۔"

"قرآن اس لئے بھی معجزہ ہے کہ آنے والے واقعات کی خبر دیتا ہے، جو قرآن کے مطابق اور جس طرح اس میں لکھا ہے، وجود میں آئے۔ قرآن میں آیا:

غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ۔ (۳۰: ۱)

"قریب کے ملک (یعنی فارس) میں رومی (جو نصاریٰ ہیں، اہلِ فارس سے جو آتش پرست ہیں) مغلوب ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ لوگ اپنے مغلوب ہونے پیچھے عنقریب چند سال میں (پھر اہلِ فارس پر) غالب آ جائیں گے۔"

یہ واقعہ اسی طرح ہوا، اور یہی حال ہوا:۔ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِیْنَ۔ کی پیشینگوئی کا (انشاء اللہ تم (مسلمان) مسجدِ حرام میں بے خوف (وخطر) باطمینانِ (تمام) داخل ہو گے)۔

اور اسی طرح ہوا، ذیل کی پیشینگوئیوں کی صورت میں:۔

وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (۵: ۱۷) "اور اللہ تم کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔"

سَیُهْزَمُ الْجَمْعُ وَیُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ (۵۴: ۴۵) "عنقریب ہو گی ان کی جماعت شکست کھائیگا۔"

اِنَّا كَفَیْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِیْنَ (۱۵: ۹۵) "یہ لوگ جو تم پر ہنستے ہیں تمہاری طرف سے ہم ان (کی سزادہی) کو بس

کرتے ہیں:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (۲۴:۵۵)

"تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل (بھی) کرتے ہیں، ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ (ایک نہ ایک دن) ان کو ملک کی خلافت (یعنی سلطنت) ضرور عنایت کریگا۔"

قرآن اس لئے بھی معجزہ ہے کہ وہ نفس سامع میں ایسا اعجاب (مفرط) پیدا کرتا ہے جو اور کلام نہیں کرتا، آپ ایک قصیدے کو پسند کرتے ہیں، اس سے خوش ہوتے ہیں یا ایک کلام کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں، لیکن یہ اور چیز ہے اور وہ اعجاب جو سامع قرآن سے پیدا ہوتا ہے، وہ اور چیز ہے۔ اعلیٰ اور بلند تر، اور باقی تر' یہی وہ اعجاب مفرط تھا جس کی وجہ سے (حضرت) عمرؓ جیسا سخت طبیعت آدمی چند آیات کے سنتے ہی اپنی بزرگ منشی سے اتر کر اور اپنی جاہلیت سے روگردان ہو کر ایک خشوع وخضوع کرنے والے مسلمان کی حیثیت سے آگے آتا ہے۔ یہی وہ اعجاب مفرط ہے، جس نے ولید بن مغیرہ سے گو وہ رئیس کفر و شرک تھا، قرآن کے حق میں گواہی دلائی۔ اس نے بعض آیتیں سنیں اور پکار اٹھا" بیشک اس کلام میں شیرینی اور دلپذیری ہے، اس میں سیرابی ہے، اس میں ثمر ہے۔ واللہ یہ کلام بشر نہیں" اور یہی اعجاب مفرط تھا کہ جس کی وجہ سے ایک مشرک کا نو آیت مبارک فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ سنتا ہے، اور فوراً سجدہ کرتا ہے۔ اس سے کہا جاتا ہے" تم نے سجدہ کیوں کیا؟ کیا مسلمان ہو گئے؟" تو وہ جواب دیتا ہے۔" نہیں میں نے اس کلام کے حسن بیان اور بلاغت کے سامنے سجدہ کیا ہے۔"

قرآن اس لئے بھی معجزہ ہے کہ اس کے بار بار پڑھنے کے بعد بھی اس کی حلاوت

ہے اور آدمی اکتاتا نہیں۔ کتنی ہی حکمت کی باتیں، قصیدے اور عبارتیں، جب ہم پہلی بار سُنتے ہیں تو وہ دلپذیر معلوم ہوتی ہیں اور ہم کو طرب میں لاتی ہیں۔ لیکن ان کے اعادہ و تکرار کے بعد ہمارا اعجاب بتدریج کم ہونے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ہمارے لئے دُہرائی ہوئی باتوں کا حکم رکھنے لگتی ہیں۔ لیکن ۱۴ صدیاں ہونے کو آئی ہیں کہ قرآن کریم کو صبح و شام، مجالس و محافل میں، خلوت و جلوت میں، عبادات و محادثات میں، درسوں اور تقریروں میں پڑھا جارہا ہے، اور وہ لاکھوں زبانوں پر جاری ہے۔ مگر نہ اس کی شیرینی کم ہوتی ہے نہ لذّت، اور انسان کو اس کی تکرار ناگوار نہیں گذرتی، بلکہ ہر بار اس کی تکرار شیریں اور لذیذ معلوم ہوتی ہے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک مردِ صوفی رات بھر یہ آیت پڑھتا رہا ہے :۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ (۲۳ : ۱۱۷)

(لوگو!) کیا تم ایسا خیال کرتے ہو کہ ہم نے تمہیں (یونہیں) بیکار پیدا کر دیا ہے
اور یہ کہ تمہیں ہماری طرف لوٹ کر آنا نہیں ہے"

اور ہر دفعہ کے پڑھنے میں اس کے جمال سے متأثر اور اس کی لذّت سے بہرہ ور ہوتا رہا ہے۔

قرآن اس لئے بھی معجزہ ہے کہ وقتِ نزول سے اس وقت تک کہ مدّتیں ہوئیں اور زمانہ گذر گیا۔ تحریف و تبدیل سے خالی ہے، اور زیادتی اور کمی سے محفوظ ہے۔ اور یہ تو معلوم ہی ہے، کہ انسانی کتابیں جب پر صدیاں گذرجائیں تغیر و تبدیل سے خالی نہیں رہتیں اور تقدیم و تأخیر اور زیادت و نقص سے مبرّا نہیں ہوتیں، بڑی بڑی مشہور کتابوں کو جب ان کے نسخوں کا مقابلہ کر کے چھاپنے کیلئے تیار کرتے ہیں تو ان میں واضح اختلافات نظر آتے ہیں اور کمی، زیادتی، تقدیم و تأخیر نمایاں ہوتی ہے، مگر قرآنِ کریم جن کے

تقریباً ۱۳۷۹ سال گذر چکے ہیں اور جس کے دشمن لاتعداد تھے۔ اور جس کی امت پر کئی طرح کی مصیبتیں اور تکلیفیں اور بلائیں اور انقلابات آئے، مگر کتاب پاک اُسی طرح خطِ عثمانی میں مکتوب، ایک نسل سے دُوسری کو پہنچتی ہوئی چلی آئی ہے۔ نہ اِس میں کوئی حرف بڑھا ہے، نہ گھٹا ہے، اِس لیئے کہ فرمایا گیا تھا:۔ اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوۡنَ۔

اِس سلسلے میں یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ اگرچہ پے در پے آیاتِ تحدّی نازل ہوئیں ـــ پہلے کہا گیا کہ اِس قرآن جیسی کتاب لا سکتے ہو تو لاؤ۔ آخر میں کہا گیا، کہ ایسی ایک ہی سُورت لا سکتے ہو تو لاؤ۔ تاہم قرآن مجید سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کسی نے اس تحدّی کے جواب میں کوئی چیز پیدا کی، عربوں کو اپنی فصاحت و بلاغت پر ناز تھا، یہ کُھلا چیلنج جو اُن کو مِل رہا تھا، اس کے قبول کرنے کی جرأت اگر ان کو ہوتی تو وہ ضرور کوشش کرتے اور قرآن مجید میں اس کا ذکر ہوتا۔ اِس لیئے کہ قرآن مجید میں، جو ۲۳ برس میں مکمل ہُوا، جا بجا مشرکین و کفار کے اعتراضات اور ان کی تنقیدات اور مزعومات کا ذکر ہُوا ہے۔ اگر کوئی قابلِ ذکر کوشش ہوئی ہوتی تو اس کا ذکر قرآن مجید میں ضرور ہوتا، غرض یہ کہ معاصرین کے سکوت ہی سے اعجازِ قرآن کا مسئلہ پیدا ہُوا، دلائل جو اس باب میں بیان ہوئے حقیقتہً یہ پُرانے دلائل ہیں۔ قاضی ابوبکر محمد الباقلانی (متوفی ۴۰۳ھ) نے جو دس دلائل اپنے اور اپنے پیشروؤں کے بیان کئے ہیں، اُن میں سے اکثر وہی ہیں جو آج مذکور ہوئے۔ ایک دو، باتیں زائد جو انہوں نے کہی ہیں، وہ اِس قسم کی ہیں:۔

اکثر مصنّفین کا کلام یکساں نہیں ہوتا؛ کتاب کا کوئی حصّہ بلند ہوتا ہے کوئی پست، لیکن قرآن مجید میں مختلف مضامین یکساں طور پر بلند اسلوب سے بیان ہوئے ہیں۔

قِصَص، مواعظ، دلائل، اِنذار، وعد و عید، اخلاقیات وغیرہ ہر ایک کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اسلوب میں فرق نہیں پڑا، اور یہ مختلف موضوع کتابِ پاک میں ایک کُلِّ واحد کے اجزاء معلوم ہوتے ہیں۔ شعراء اور خطباء کسی ایک مضمون کے ادا کرنے میں تخصص پیدا کرتے ہیں، قرآن پاک میں اتنا تنوّع مضامین کا ہے، مگر اندازِ بیان سب کا ایک سا کامل و مکمل ہے۔

قاضی باقلانی نے یہ بھی کہا ہے کہ شریعت کے خاص مصطلحات ہیں، عربی میں ایسی چیز پہلے نہ تھی۔ قرآن مجید میں معانیِ شریعت کیلئے پہلی دفعہ یہ مصطلحات مستعمل ہوئی ہیں، یہ بجائے خود اعجاز ہے، پھر یہ کہ قرآن مجید کی زبان سادہ، سہل اور آسانی سے سمجھ میں آنے والی ہے۔ مگر اس کے باوجود ایسی زبان لکھنا محال ہے۔ ان دلائل میں علّامہ ماوردی نے ایک اور دلیل کا اضافہ کیا ہے، وہ یہ کہ قرآن مجید کے حفظ کرنے میں آسانی ہے۔ چنانچہ نہ صرف عرب، بلکہ عجم، مثلاً ایرانی اور قبطی لوگ بھی بآسانی تمام قرآن مجید حفظ کر لیتے ہیں:

نزولِ قرآن اور عربوں کے ادب کی کیفیّت

کل اعجازِ قرآن کا ذکر ہو رہا تھا اور اُن دلائل کا اعادہ کیا گیا تھا جو اس بارے میں علماء سے منقول ہیں، اِس مسئلے کی پوری حقیقت سمجھنے کیلئے یہ دریافت کرنا ضروری ہے، کہ نزولِ قرآن مجید کے وقت عربوں کے ادب کی کیا کیفیت تھی؛ اِس لئے کہ کسی زبان میں بیان کا دار مدار اِس لسانی موادّ پر ہوتا ہے جو کسی زبان میں موجود ہو۔

آپ سُن چکے ہیں کہ اسلام سے پہلے حجاز کے دو بڑے شہروں یعنی مکّے اور مدینے

میں لکھنا جاننے والوں کی تعداد کس قدر کم تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ عربی خط کے لکھنے پڑھنے کا عام رواج اسلام کے بعد کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے کہ جاہلی ادب زیادہ تر منظوم ادب تھا۔ شعر پر جاہلیت میں بہت زور تھا۔ قبیلے کا شاعر اس کی عزّت کا محافظ، اس کے کارناموں کا مدح گو اور فضائل و مکارم کا راستہ دکھلانے والا تھا، اگرچہ وہ شعرِ جاہلی جو ہم تک پہنچا ہے۔ اسلام سے ۱۵۰ سال سے زیادہ پہلے کا نہیں ہے، مگر اس کی کیفیت شاہد ہے کہ بہت سا کلام اس سے پہلے بھی لکھا گیا ہوگا، جو محفوظ نہیں رہا، اس لئے کہ یہ کلام بلند پایہ ہے۔ عروضی قواعد کے مطابق اور منجھا ہوا کلام ہے۔ جس میں خاص خاص تراکیب اور کلمات زبانِ شعر کے مسلّم اجزاء کے طور پر مستعمل ہیں، اور یہ باتیں قلیل عرصہ میں پیدا نہیں ہوتیں۔ اس منظوم کلام کو محفوظ رکھنے کا انتظام بھی تھا۔ وہ یہ کہ ہر شاعر کا راوی ہوتا تھا جو اس کا کلام یاد رکھتا اور سُننے والوں تک پہنچاتا تھا، لیکن چونکہ کتابت کا فن عام نہ تھا، نثر کا کوئی ادب اسلام سے پہلے عرب میں نہ تھا۔ چند ضرب المثلیں اور چند خطبے یہ کل کائنات نثری ادب کی تھی۔ خطبے، جو لوگوں نے حفظ کے ذریعے سے محفوظ کر لئے تھے، اکثر مسجّع تھے۔ جو نمونے ہم تک پہنچے ہیں وہ ایسے ہی ہیں۔ چند کلمات و تراکیب — جو ایام العرب کے قصّوں میں آئے ہیں، وہ بھی قدیمی معلوم ہوتے ہیں۔ بہر حال کوئی قابلِ ذکر مسلسل منثور کلام جاہلیت میں نہ تھا، نہ ضبط ہوا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ نثر کے لئے کتابت لازمی ہے، زبانی روایت سے طویل نثری مضامین کو ضبط نہیں کیا جاسکتا۔

عربی زبان جو دورِ اوّل کے شعر میں مستعمل ہے، یا امثال و خطب کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے، سادہ زور دار مرادفات اور کلماتِ زجر و تنبیہ سے پُر جذبات کے

ادا کرنے اور مناظر کی تصویر کشی کے لئے موزوں زبان ہے۔ مگر با ترتیب سلسلۂ خیالات کے ادا کرنے کیلئے موزوں نہیں، خصوصاً ایسے خیالات کے لئے جو حسیات پر مبنی نہ ہوں۔

قرآن کا اعجاز یہ بھی ہے کہ وہ عربی کی پہلی منثور کتاب ہے۔ اس کی طرح کی کوئی کتاب اس سے پہلے عربوں میں نہ تھی۔ عربی نثر اس قسم کے خیالات ظاہر کرنے کے لئے اس سے پہلے کبھی استعمال میں نہیں آئی تھی۔ جاہلیت کے کاہنوں کے کچھ سجعے موجود ہیں۔ ان کے مبہم بیانات کہاں اور کتاب مبین کہاں؟ چہ نسبت خاک را با عالم پاک! جب آیاتِ کتابِ پاک اہلِ عرب نے سنیں تو طبعاً انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے، وہ اس پر ایمان لائے اور پکار اٹھے کہ یہ قولِ بشر نہیں ہے۔

اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ فصحائے عرب کلام پاک کا جواب لانے سے عاجز ہوئے۔ اس لئے کہ جو روحانی کیفیات حضورؐ پر گذریں، ان کو آپؐ نے بیان فرمایا، اور جب تک کوئی اور شخص انہیں کیفیات سے نہ گذرتا، وہ ان کو کس طرح بیان کر سکتا تھا؟ چنانچہ فرمایا گیا:۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى. اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (وہ اپنی خواہش نفسانی سے باتیں نہیں بنا رہے ہیں (بلکہ یہ قرآن جو پڑھ کر سناتے ہیں) وحی آسمانی ہے جو ان پر نازل ہوتی ہے") پھر فرمایا:۔ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ٥ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى. ("پیغمبرؐ نے جو کچھ دیکھا تھا (ان کے) دل نے اس میں کچھ جھوٹ نہیں ملایا۔ پیغمبرؐ جو (جبریل کو) دیکھا کرتے ہیں، تو کیا تم لوگ ان سے اس بات پر جھگڑتے ہو") پھر فرمایا:۔ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ٥ لَقَدْ رَاٰى مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ("پیغمبرؐ کی نظر نہ (کسی طرف کو) بہکی اور نہ (حد سے) آگے بڑھی، بے شک انہوں نے اپنے رب کی بڑی نشانی کو دیکھ لیا")۔

مدعائے سخن یہ ہے کہ یہ کتابِ پاک جو ہماری ہدایت کیلئے بھیجی گئی، وہ ہماری دین و دُنیا کی بہتری کا سرمایہ ہے، اس کی طرف رجوع ہمارے لئے فلاحِ دارین کا موجب ہے اور اس کی تلاوت اور اس میں تدبّر ہماری روحانیت کی غذا ہے۔

امام غزالیؒ نے "احیاء العلوم" (۱ : ۱۹۹) میں قرآن مجید کی تلاوت کے لئے دس باطنی اعمال کا ذکر کیا ہے، جنہیں ملحوظ رکھنا شروطِ تلاوت کا ادا کرنا ہے۔

پہلی شرط ہے فہمِ عظمتِ کلام، یہ ملحوظ رکھنا کہ اللہ پاک کا لطفِ عظیم ہے کہ اس نے اپنے عرشِ جلال سے اتر کر اپنی خلقت کے سمجھانے کے درجے تک نزول فرمایا ہے۔

دُوسری شرط ہے تعظیمِ متکلّم، تلاوت شروع کرتے وقت قاری کے دِل میں عظمتِ متکلّم موجود ہونی چاہئے، اور اسے جاننا چاہیئے کہ جو کچھ وہ پڑھ رہا ہے، وہ کلامِ بشر نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔ لَا یَمَسُّہٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (۵۶ : ۷۸) "پاکوں کے سوا کوئی اس کو چھُونے نہیں پاتا" یہ ظاہری مس کا حکم ہے کہ پاک آدمی کتاب کو چھُوئے۔ مگر یہی حال باطن کا ہے کہ وہ باطن کلام اللہ سے محجوب ہے۔ جو ہر رِجس اور ناپاکی سے پاک نہ ہو اور نورِ تعظیم و توقیر سے روشن نہ ہو کہ تعظیم کلام تعظیم متکلّم ہے اور عظمتِ متکلّم قاری کے ذہن میں نہ آئے گی۔ جب تک وہ صفات و جلال و افعالِ الٰہی میں غور نہ کریگا اور اس کے دل میں یہ نہ ہوگا کہ عرش و کرسی اور آسمان و زمین اور ان کے مابین ہر جاندار کا خالق اور ان پر قادر اور ان کا رازق وہی ایک ہے۔ ہاں اِس قسم کی باتوں پر غور کرنے سے تعظیمِ متکلّم اور تعظیمِ کلام اس کے ذہن میں آسکتی ہے۔

تیسری شرط حضورِ قلب اور ترکِ حدیثِ نفس ہے، تفسیر میں ہے کہ یا یحییٰ خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ("اے یحییٰ کتاب کو قوّت سے پکڑ!") اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ جِدّ و اجتہاد کو

کام ہیں لا یعنی ان کے پڑھنے کے وقت غیر سے توجہ ہٹالے۔ چنانچہ سلف میں سے ایک بزرگ کا دستور تھا کہ اگر کسی آیت کے پڑھتے وقت ان کا دل متوجہ نہ ہوتا تو اس آیت کو پھر سے پڑھتے۔

چوتھی شرط تدبّر ہے کہ قراءت سے مقصود یہی تدبّر ہے۔ اور ترتیل سے غرض یہی ہے کہ تدبّر پر قدرت حاصل ہو۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اس قراءت میں خیر نہیں جس میں تدبّر نہیں۔ اگر اعادے کے بغیر تدبّر نہ ہو سکے تو اعادہ کرنا چاہیئے بجز اس صورت کے کہ ہر ایک شخص امام کی قراءت سن رہا ہو۔ ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہؐ نے بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھی اور بیس مرتبہ دہرائی۔ دہرانے سے مقصود اس کے معانی پر غور کرنا تھا۔ ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے ایک رات ہمارے ساتھ نماز پڑھنے میں گذاری۔ ایک آیت پر ٹھہرے اور اس کو دہراتے رہے۔ وہ آیت یہ تھی:

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (۵ : ۱۱۸)

"اگر تو ان کو عذاب دے تو (تجھ کو اختیار ہے) یہ تیرے بندے ہیں، اور اگر تو ان کو معاف کرے تو بے شک تو سب پر غالب اور حکمت والا ہے۔"

اور تمیم الداری ایک مرتبہ نماز میں یہ آیت رات بھر دہراتے رہے۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ (۴۵ : ۲۰)

"جو لوگ برائیوں کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں، کیا انہوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ ہم ان کو انہیں لوگوں جیسا کر دیں گے، جو ایمان لائے اور نیک کام کئے

کہ ان سب کا مرنا اور ان کا جینا ایک ہی طرح کا ہوگا۔ یہ (کیا ہی) بُرے حکم لگایا کرتے ہیں۔"

اور سعید بن جبیرؒ اسی طرح رات بھر یہ پڑھتے رہے :-

وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ۔ (۳۶ : ۵۹)

"گنہگار لوگو! آج (ان جنتیوں سے) الگ رہو۔"

ایک بزرگ فرماتے ہیں، جس آیت کو میں نہیں سمجھتا، اور جس کے پڑھتے وقت میرا دل اس میں نہ ہو، میں اپنے لئے اس کی تلاوت میں ثواب شمار نہیں کرتا۔

پانچویں شرط تفہّم ہے۔ یعنی ہر آیت سے وہ چیز سمجھنا جو اس آیت کے مناسب ہے۔

چھٹی شرط ہے، موانعِ فہم سے احتراز۔ اکثر لوگ فہم معانی قرآن سے محجوب ہیں۔ اس لئے کہ شیطان نے متعدد حجاب دلوں پر ڈال رکھے ہیں۔ یہ حجاب چار ہیں۔ اوّل ساری توجہ کو مخارج حروف اور ان کے حُسنِ ادا پہ صرف کر دینا، گو معانی نظر سے چھپ جائیں۔ دُوسرا حجاب ہے۔ تنقیدی طور پر اعتقاداتِ مسموعہ کی پابندی تاآنکہ اعتقادِ آباء سے گذر کر غیر مسموع کی طرف جانا ناممکن ہی ہو جائے۔ ایسے ہی علم کے متعلق صوفیہؒ کہتے ہیں۔ العلم حجاب الاکبر "علم سب سے بڑا حجاب ہے" اور علم سے ان کی مراد ایسے اعتقاد ہیں، جن پر اکثر لوگ تقلیدِ محض کے طور پر قائم ہیں، یا وہ جدل کے کلمے، جن کو متعصبین مذاہب نے لکھا ہے، ورنہ علم حقیقی جس میں نُورِ بصیرت سے کشف و مشاہدہ حاصل ہوتا ہے۔ اسے کون حجاب کہہ سکتا ہے؟ وہ تو منتہائے طلب اور مقصودِ طلب ہے۔ تیسرا حجاب ہے گناہ پر اصرار، غرور و تکبر، اور ہُوائے دُنیا کی اطاعت۔ یہ سب صُورتیں دِل کو سیاہ اور زنگ آلود کرنے والی ہیں۔

اطاعتِ ہوا کی صورت میں معانیٔ قرآن دل کے اس سیاہ آئینے میں کیسے منعکس ہوں؟

چوتھا حجاب یہ ہے کہ کسی نے ظاہری تفسیر پڑھی اور یہ سمجھ لیا کہ قرآنی کلمات کے معنی ان معنوں کے سوا جو حضرت ابن عباس اور مجاہد وغیرہ سے نقل ہوئے ہیں، اور کچھ نہیں اور اس تفسیر کے سوا جو کچھ ہے وہ تفسیر بالرأئے ہے۔ اور جس نے تفسیر اپنی رائے سے کی۔ اُس نے اپنا ٹھکانا جہنّم میں بنالیا۔ یہ خیال بھی بہت بڑے حجابوں میں سے ہے۔ اس لئے کہ اخبار و آثار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اربابِ فہم کیلئے معانیٔ قرآن میں کافی گنجائش ہے۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے فرمایا۔ "مجھ کو رسولُ اللہ نے کوئی ایسی بات نہیں بتائی جو اوروں سے چھپائی ہو۔ بجز اس کے کہ اللہ اپنے نیک بندے کو فہم قرآن دیتا ہے۔ سو اگر صرف ترجمۂ منقولہ ہی وہ چیز ہے جس کی اجازت ہے، تو پھر یہ فہم کیا ہے؟ اس کے علاوہ رسولُ اللہ نے فرمایا ہے کہ قرآنِ مجید کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن تو اس ظاہر و باطن کے کیا معنیٰ ہیں؟ اور ابن مسعودؓ نے کہا کہ جو علم اوّلین و آخرین چاہتا ہے وہ قرآن میں تدبّر کرے۔ تو یہ تدبّر صرف تفسیرِ ظاہر سے نہیں ہو سکتا۔ پس، اگر قرآن کے معنے صرف ظاہری منقول ہی ہیں تو لوگوں کے لیئے اس میں اختلاف کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ پھر اختلاف کی بنیاد کیا تھی؟

امام غزالی کی بیان کردہ دس شروطِ تلاوت میں سے چھ کا ذکر ہوا۔ باقی چار انشاء اللہ اگلے مقالے میں بیان ہوں گی۔

تلاوتِ قرآن کے باطنی اعمال!

کل تلاوتِ قرآن کے دس باطنی اعمال کا ذکر ہو رہا تھا، جو امام غزالیؒ نے احیاء العلوم

میں بیان کئے ہیں۔ ان میں سے صرف چھ کی تفصیل کل پیش کی جا سکی تھی۔ باقی چار اب بیان کئے جاتے ہیں۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ ساتویں شرط تلاوت کی تخصیص ہے۔ وہ یہ کہ قرآن مجید کا مطالعہ کرنے والا یہ بات ذہن میں رکھے کہ ہر خطاب سے مقصود وہ خود ہے، اگر امر یا نہی سنے تو یہ سمجھے کہ حکم اُسے ملا ہے اور منع اُسے کیا گیا ہے۔ اگر قصصِ اولین بیان ہو رہے ہیں تو سمجھے کہ مقصود کہانی کا بیان کرنا نہیں، بلکہ عبرت گیری و پند پذیری مطلوب ہے اور ایسا کیوں نہ سمجھا جائے۔ جبکہ قرآنِ مجید دُنیا جہان کیلئے شفاء، ہدیٰ، رحمت اور نُور ہے۔ اور رب کو حکم ہوا ہے کہ :-

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللهِ عَلَيْكُمْ وَمَا اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ (۲ : ۲۳۱)

"اور اللہ نے جو تم پر احسان کئے ہیں، اُنہیں یاد کرو، اور اس کا یہ (احسان بھی یاد کرو) کہ اس نے تم پر کتاب اور عقل کی باتیں اتاریں (اور منظور یہ ہے) کہ تم کو ان کے ذریعے سے نصیحت کرے۔"

اور ایک اور جگہ ہے :-

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ (۱۶ : ۴۴)

"اور (اس طرح) ہم نے تم پر (بھی) یہ قرآن اتارا ہے، تاکہ جو احکام لوگوں کی ہدایت) کے لئے ان کی طرف بھیجے گئے ہیں، تم ان کو اچھی طرح سمجھا دو۔"

مالکؒ بن دینار کہا کرتے تھے: "اے اہلِ قرآن تمہارے دل میں قرآن نے کیا بیج بویا! قرآن مومن کی بہار ہے، جس طرح بارش زمین کی بہار ہے۔"

آٹھویں شرط تأثر ہے۔ وہ یہ ہے کہ مختلف آیات سے دل پر مختلف اثرات پیدا ہوں اور حزن، خوف و رجا وغیرہ کی کیفیت قاری کے دل پر طاری ہو، وعدۂ مغفرت سے اسے بشارت ہو۔ وعید اور مغفرت مقیّد بشروط سے وہ ڈرے۔ جلالِ خداوندی کے سامنے اس کی حالت خضوع کی ہو۔ جنّت کے وصف بیان ہوں تو اس کے باطن میں شوق پیدا ہو، دوزخ کا ذکر ہو تو وہ خوف سے کانپ اُٹھے۔ اگر وہ یہ آیت پڑھ رہا ہو اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ۔ "اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو مجھ کو (قیامت کے) روزِ سخت کے عذاب سے (بڑا ہی) ڈر لگتا ہے"۔ اور وہ خائف نہ ہو تو وہ گویا صرف ناقل و راوی ہے۔ اور جب وہ پڑھے :۔ عَلَیْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَیْكَ اَنَبْنَا وَاِلَیْكَ الْمَصِیْرُ۔ "ہم تجھی پر بھروسہ رکھتے ہیں اور تیری ہی طرف رجوع کرتے ہیں، اور تیری (ہی) طرف (ہمیں) لوٹ کر جانا ہے") اور اس کے حال سے توکّل، انابت اور خدا کی طرف بازگشت کا یقین ظاہر نہ ہو تو وہ گویا صرف ناقل و راوی ہے۔ پس اگر اس میں یہ صفات موجود نہیں اور اس کے دل پر ان حالات کی کیفیت وارد نہ ہو تو تلاوت میں اس کا حصہ فقط اتنا ہی ہوا کہ اس نے زبان ہلا دی اور وہ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ کا مورد بنا ("یہ بات) اللہ کو سخت ناپسند ہے کہ کہو (سب کچھ) اور کرو (کچھ) نہیں"۔

تلاوتِ قرآن مجید سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ احوالِ قلب پر جاری ہوں۔ ورنہ زبان ہلا دینے میں کونسی مشقّت ہے۔ ایک قاری کہتے ہیں کہ میں نے اپنے شیخ سے قراءت سیکھی، کچھ مدّت بعد میں اُن کے پاس دوبارہ گیا اور چاہا کہ ایک مرتبہ پھر پڑھوں شیخ نے مجھے جھڑکا اور کہا : تم نے مجھ پر یہ کیا کر لگا رکھی ہے۔ جاؤ اور اللہ عزّ و جل کے

حضور میں قرآن پڑھو اور دیکھو کہ وہ کن باتوں کا حکم دیتا ہے اور کن باتوں سے منع کرتا ہے۔

احوال و اعمال میں صحابہؓ کا بھی یہی شغل تھا۔ رسول اللہؐ نے انتقال فرمایا تو بیس ہزار صحابی موجود تھے۔ اُن میں سے پورے قرآن مجید کے حافظ چھ تھے۔ جن میں سے دو کے متعلق اختلاف ہے۔ ہاں، اکثر صحابہ کو ایک دو سورتیں یاد تھیں اور جس کسی کو سورۂ بقرہ و انعام یاد تھی، اس کا شمار صحابہ کے علماء میں سے تھا۔ ایک شخص قرآن سیکھنے کے لئے جب اس آیتِ شریفہ تک پہنچا۔ فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ "تو جس نے ذرہ بھر نیکی کی (ہوگی) وہ اس (نیکی) کو بچشم خود دیکھ لے گا۔ اور جس نے ذرّہ بھر بُرائی کی (ہوگی) وہ اس (بُرائی) کو (بچشم خود) دیکھ لے گا") تو وہ شخص کہنے لگا: "یہ کافی ہے"۔ اور واپس چلا گیا۔ اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا: "یہ آدمی فقیہ یعنی دانشمند اور دریا بندہ بن کر واپس گیا ہے۔ وہ کیفیت جو آیت سمجھنے کے بعد اللہ کی عنایت سے مؤمن کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے وہ قیمتی اور ارجمند ہے، ورنہ صرف زبان ہلا دینے کا فائدہ کم ہے۔ بلکہ صرف زبان سے پڑھنے والا اور عمل سے اعراض کرنے والا "وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ" کی تہدید کی ذیل میں آتا ہے۔ حقِ تلاوت یوں ادا ہوتا ہے کہ زبان، عقل اور دل سب تلاوت میں شریک ہوں، زبان ترتیل کے ساتھ حروف کو صحیح ادا کرے، عقل معانی کی تفسیر بیان کرے اور دل نصیحت حاصل کرے اور تنبیہات و احکام سے متأثر ہو۔ زبان ترتیل کرے، عقل ترجمہ کرے اور دل پند پذیر ہو۔

نویں شرط، ترقی ہے۔ ترقی یہ ہے کہ قاری کلام پاک کو اللہ عزّ و جلّ سے سُنے

نہ کہ اپنے آپ سے۔ قراءت کے درجے تین ہیں۔ ادنیٰ یہ کہ بندہ یہ سمجھے کہ وہ اللہ عزّوجلّ کے سامنے قرآن پڑھ رہا ہے۔ اور اللہ حاضر و ناظر ہے اور بندہ کی قراءت سُن رہا ہے۔ اِس صورت میں قاری کا موقف سوال، چاپلوسی کرنے اور گڑگڑانے، اور زاری کرنے کا ہے ـــ اِس سے اوپر کا درجہ یہ ہے کہ وہ دل سے جانے کہ گویا اللہ عزّوجلّ اُسے دیکھ رہا ہے اور اپنے الطاف سے اسے مخاطب کر رہا ہے اور اپنے انعام و احسان کا مژدہ اسے سُنا رہا ہے۔ ایسے قاری کا موقف حیا، تعظیم، اور غور سے سُننے اور سمجھنے کا ہے۔ اور آخری درجہ یہ ہے کہ وہ کلام میں متکلم کو اور کلمات میں صفات کو دیکھے، اپنی ذات کو اور اپنی قراءت کو نہ دیکھے اور نہ منعم کے انعام کو دیکھے، بلکہ اپنی تمام توجہ متکلم کی طرف رکھے اور اپنے فکر کو اس پر صرف کرے گویا مشاہدۂ متکلم میں مستغرق ہے۔ یہ درجہ مقرّبین کا ہے۔ اور پہلے دو درجے اصحاب الیمین کے ہیں۔ اور جو شخص اِن تینوں درجوں سے خارج ہے وہ درجات غافلین میں شامل ہے۔ حضرت عثمان اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اگر دل پاک ہوں تو قرآن پڑھنے سے کبھی سیر نہ ہوں۔ اور انہوں نے یہ صرف اِس لئے کہا کہ پاکیزگیٔ دل ہی سے یہ ممکن ہو سکتا ہے۔ کہ کلام سے مشاہدۂ متکلم تک ترقی کر سکیں اور غیر سے اعراض کر کے اور مشاہدہ متکلم کے ذریعے سے ہی اس فرمانِ خداوندی کی اطاعت کر سکتے ہیں کہ فَفِرُّوا اِلَی اللہ

دسویں شرط تبرّی ہے۔ یعنی اپنی حول و قوت، اپنے نفس سے راضی ہونے اور خود کو نیک و پاک تصوّر کرنے سے براءت، جب قاری آیاتِ وعدہ یا آیاتِ مدحِ صالحین پڑھے تو اپنے آپ کو ان میں شامل نہ سمجھے، بلکہ یقین اور صدق والوں کو اُن میں سے جانے اور اس بات کا شائق ہو کہ اللہ اُسے ان کے زمرے میں شامل کرنے۔ جب نافرمانوں اور

قصور واروں کی مذمت کی آیات پڑھے تو یہ سمجھے کہ وہ خود ان میں سے ہے۔

تلاوت کے ان دس باطنی اعمال کے سوا امام غزالیؒ نے اتنے ہی تلاوت کے ظاہری آداب شمار کئے ہیں، وہ مختصراً یہ ہیں:۔

اوّل، حال قاری کے متعلق: وہ یہ کہ قاری باوضو ہو۔ ادب و سکون کی ہیئت میں ہو، خواہ کھڑا ہو یا قبلے کی طرف منہ کر کے بیٹھا یا لیٹا ہوا ہو۔ افضل حالت یہ ہے کہ کھڑا ہو کر نماز میں قرآن مجید پڑھ رہا ہو۔ اور حالتیں فضیلت میں اس سے کم ہیں۔ فرمایا گیا ہے:

الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِىْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۳ : ۱۸۸)

"جو کھڑے، بیٹھے اور پڑے خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی ساخت میں غور کرتے ہیں۔"

دُوسرا، مقدار قراءت کے متعلق، مقدار کے متعلق امام صاحب نے لوگوں کے مدارج میں فرق بیان کیا ہے۔ عابد اور طریق عمل کے سالک روزانہ زیادہ پڑھینگے۔ اعمال قلب و فکر کے سالک یا جو لوگ نشر علم میں مصروف ہیں ان سے کم اور جو معانی قرآن میں بہت زیادہ فکر کرنے والے ہیں وہ ان سے بھی کم پڑھیں گے۔ اس لئے کہ انہیں بار بار اعادہ اور تامّل کرنا ہے۔

تیسرا احزاب کے متعلق: اس میں ان لوگوں کے لیے جو ایک ہفتے میں قرآن مجید ختم کرتے ہیں۔ سات احزاب کا ذکر کیا گیا ہے۔ جن میں صحابہؓ قرآن مجید کو تقسیم کر کے پڑھا کرتے تھے۔

چوتھا، کتابت کے متعلق: قرآن مجید کی کتابت کا خوبصورت بنانا مستحب ہے۔

پانچواں، ترتیل کے متعلق: چونکہ قرارت سے تفکّر مقصود ہے اور ترتیل کے بغیر ہموار طور پر اور آرام سے اور واضح طریق سے پڑھنا تفکّر کیلئے مفید ہے اس لئے ترتیل مستحب ہے۔

چھٹا، بکاء: یہ بھی قرارت میں مستحبّ ہے اس لئے کہ جب تہدید و وعید و مواثیق وعہود والی آیتوں پر قاری تامّل کرے گا اور اوامر و زواجر میں اپنی تقصیر پر غور کرے گا تو لامحالہ بکاء و حزن پیدا ہوگا۔

ساتواں، حقِ آیات کی رعایت: مثلاً سجدے کی آیتیں آئیں تو سجدہ کرے۔

آٹھواں، ابتدائے قرارت میں استعاذہ: شروع کرنے سے پہلے استعاذہ کرے اور اسی طرح آیت تسبیح و تکبیر میں تسبیح و تکبیر کرے۔

نواں، قرارت آواز بلند سے کرنا: آواز کم از کم اتنی بلند ہو کہ خود سُن سکے اس سے چارہ نہیں۔ اِس لئے کہ قرارت کے معنٰی ہیں حروف کا آواز سے ادا کرنا۔ پس آواز ضروری ہے۔ آہستہ پڑھنا ریا اور تصنّع سے زیادہ دُور ہے۔ اگر ریا اور تصنّع کا خوف ہو تو آہستہ پڑھے اور اگر بلند آواز سے پڑھنے سے کسی اور نمازی کا وقت مشوش نہ ہو تو افضل یہ ہے کہ بلند آواز سے پڑھے۔

دسواں، خوش آوازی سے پڑھنا: خوش آوازی سے پڑھا جائے مگر نہ اتنا کہ حروف کو مفرط طور پر لمبا کیا جائے کہ نظمِ حروف میں تغیّر پیدا ہو۔ خوش آوازی سے پڑھنا سُنّت ہے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا: زَیِّنُوا الْقُرْآنَ بِاَصْوَاتِکُمْ "(اپنی آوازوں سے قرآن کو آراستہ کیا کرو)" اللہ پاک نے فرمایا: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ (اور ذکر کو دلوں میں محفوظ کرنے کے اسباب میں تلاوت کی مداومت بھی شامل ہے)، لیکن اس کے آداب

شروط کی پابندی اور اعمالِ باطنی اور آداب ظاہری جو اس کے ساتھ ضروری ہیں ان کی محافظت کرنا چاہئے۔

علومِ قرآنیہ

کل قرآن مجید کی تلاوت کے دس باطنی اعمال اور ظاہری آداب کا ذکر ہوا تھا۔
آج ہم علومِ قرآنیہ کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔

قرآن پاک ایک سمندر ہے، جس کے عجائبات ختم نہیں ہو سکتے۔ ایک بلند پہاڑ ہے جس کے غرائب کی حد تک پہنچا نہیں جا سکتا۔ اس کے باوجود علمائے اسلام کی ہمت پر ہزار آفرین کہ انہوں نے چودہ صدیوں سے زیادہ کتابِ پاک پر مختلف زاویوں سے نگاہ ڈالنے میں صرف کیں اور ہزاروں باریک نکتے پیدا کیے۔ ہر مسلم قوم اور ہر مسلم ملک میں آج تک نامور فاضلوں کی جماعتوں کی جماعتیں عمیق غور و فکر کے بعد ہزاروں کتابیں علومِ قرآنیہ پر تصنیف کر چکی ہیں۔ ہم ان میں سے چند علوم کے نام آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ صرف وہ، جن پر عربی زبان میں کتابیں لکھی گئیں۔ ان سے آپ اندازہ لگائیں گے کہ تمام علومِ قرآنیہ اور ان کے فروع و فنون کی جامع فہرست قوّتِ تقریر اور نطاقِ تحریر کے بس کی ہے یا نہیں۔ علمِ قرارت ہی کو لیجئے۔ اس علم میں اس سے بحث ہوتی ہے کہ قرآن کیونکر جمع ہوا اور صحابہؓ سے دیگر صحابہ اور تابعین نے قرآن مجید کی روایت کیونکر کی۔ قرّاء مدینہ و مکہ، کوفہ و بصرہ اور شام اس بارے میں کیا مساعیٔ جمیلہ کام میں لائے، قرّاءِ سبعہ اور قرّاءِ عشرہ کی تفصیل کیا ہے؟

علمِ قرارت کے بہت سے فروع ہیں۔ مثلاً شواذ اور متواتر کا فرق، مخارج

حروف کا علم، مخارج الفاظ کا علم، وقفوں کا علم، اور وقفوں کی قسمیں، عللِ قرات یعنی کسی قراءت کی خاص صورت کی توجیہ، قرآن کے رسم خط کا علم، بیہقی فرماتے ہیں کہ مصحف کو انہیں ہجوں سے لکھنا چاہیئے، جن میں اگلے لوگ لکھتے چلے آئے ہیں۔ اس میں تبدیلیاں نہیں کرنی چاہئیں۔ اس لئے کہ سلف ہم سے علم میں، اور صدقِ قلب و لسان میں، اور امانت میں زیادہ تھے۔ علم آدابِ کتابتِ صحف" یعنی کتابت مصحف کی تحسین و تزئین اور اس کے واضح بنانے کا علم۔ نقطوں اور اعراب اور عددِ آیات، سجدات، عشرات، وقوف، اختلافاتِ قرارت و معانی وغیرہ کے لکھنے کے آداب اور آداب تلاوت کنندہ کا علم یہ سب قراءت اس کے فروع تھے۔ اب علم تفسیر کو لیجئے جو علوم قرآنی میں بہت اہم علم ہے۔ اس علم کے بے شمار فروع ہیں، مثلاً مکی، مدنی، سورتوں کی پہچان۔ حضری، اور سفری آیات کا علم، یعنی وہ وحی جو سفر میں آئی، اور وہ جو قیام کے زمانے میں آئی، اسی طرح ہے نہاری اور لیلی اور صیفی اور شتوی کا علم۔ "علم اسباب النزول" میں آیتوں کی شانِ نزول سے بحث ہوتی ہے، اسی طرح قرآن پاک کے نازل ہونے کی کیفیت پر بھی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ قرآن مجید میں قرآن کے ۵۵ نام آئے ہیں، سورتوں میں سے بعض کا ایک نام ہے بعض کے کئی نام ہیں۔ جمع و ترتیب قرآن کا علم، قرآن مجید کی سورتوں اور آیتوں اور کلمات و حروف کے شمار کا علم۔ بعض نے شمار کیا ہے کہ قرآن مجید میں ۶ ہزار ۲۳۶ آیتیں ہیں۔ غریب القرآن کا علم، یعنی قرآن مجید کے مشکل الفاظ کا حل۔ اس بارے میں ابو عبیدہ ابن درید العزیزی، جس نے ۱۵ سال میں "غریب القرآن" تصنیف کی۔ ابن الانباری الراغب اصفہانی، جس کی کتاب اس فن کی بہترین کتابوں میں سے ہے اور زجاج، فرائم اخفش وغیرہم نے کتابیں لکھی ہیں۔ قرآن مجید کے ان کلمات کا علم جو لغتِ حجاز میں نہیں

ہیں ابوبکر واسطی نے لکھا ہے کہ قرآن مجید میں پچاس زبانوں کے لفظ ہیں۔ ان میں سے اکثر قریش، ہذیل، کنانہ اور ۳۸ اور عرب قبائل کی زبانوں کے لفظ ہیں۔ مگر کچھ لفظ فارسی رومی، قبطی، حبشہ، بربر، سریانی اور عبرانی کے بھی ہیں۔ "علم وجوہ الفاظ" یعنی ایک ہی لفظ کے مختلف معنوں کا علم، مثلاً ھُدیٰ کا لفظ قرآن میں ۱۷ معنوں میں آیا ہے۔ " اِنَّ الْھُدٰی ھُدَی اللّٰہِ " میں ھُدیٰ کے معنیٰ دین کے ہیں۔ " وَلَقَدْ آتَیْنَا مُوْسَی الْھُدٰی " میں ھُدیٰ توراۃ ہے۔ فَبِھُدٰھُمُ اقْتَدِہْ میں ھُدیٰ بمعنی سُنّت ہے، وعلیٰ ہذا القیاس۔

"اعراب قرآن کے علم" پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ ابن الانباری نے دو جلدوں میں صرف ان ضمیروں پر کتاب لکھی، جو قرآن مجید میں استعمال ہوئی ہیں۔ "محکم و متشابہ کا علم" ان دو اصطلاحوں کے معنیٰ میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں، محکم وہ ہے جس کے معنیٰ واضح ہیں اور متشابہ اس کی ضد ہے۔ یا یہ کہ محکم وہ ہے جس کی ایک ہی تاویل ہو سکتی ہے۔ اور متشابہ وہ ہے جس کی کئی تاویلیں ممکن ہیں۔

"مقدم و مؤخر قرآن کی پہچان کا علم"۔ ایک آیت کے معنیٰ بظاہر مشکل ہوتے ہیں۔ اس میں تقدیم و تاخیر کرنے سے معنیٰ واضح ہو جاتے ہیں مثلاً اَفَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ ھَوَاہُ سے مراد ہے ھَوَاہُ اِلٰھَہٗ اس لئے کہ الٰھہٗ کو ھویٰ بنانا مذموم نہیں۔ جملے میں مفعول ثانی کو اہمیت کی وجہ سے مقدم کر دیا گیا ہے۔

"ناسخ و منسوخ کا علم"۔ بیشمار لوگوں نے اس علم پر کتابیں لکھی ہیں مثلاً ابوعبیدؒ قاسم ابن سلام، ابوداؤد السجستانی، ابن الانباری، ابن العربی وغیرہم نے، اس علم کی اہمیت پر ائمہ نے بہت زور دیا ہے اور کہا ہے کہ کسی شخص کے لئے جائز نہیں ہے کہ کتاب اللہ

کی تفسیر کی بغیر ناسخ و منسوخ جاننے کے کرے۔

"حقیقت و مجازِ الفاظِ قرآن کا علم"۔ قرآنی تشبیہات و استعارات کا علم، قرآنی کنایات و تعریضات کا علم، ایجاز و اطناب کا علم، بعض علماء نے کہا ہے کہ بلاغت نام ہی ایجاز و اطناب کا ہے۔ اور زمخشری نے کہا ہے کہ جس طرح بلیغ کو واجب ہے کہ اجمال کے موقع پر اجمال سے کام لے، اسی طرح اسے واجب ہے کہ تفصیل کے موقع پر تفصیل سے کام لے۔ مثال کے طور پر ایجاز حذف کی ایک دو مثالیں سنیئے:-

وَلَهُ مَا سَكَنَ فِي اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ (اور اسی خدا کا ہے جو کچھ رات اور دن میں ساکن ہے۔ ۶ : ۱۳)

مگر مراد صرف ساکن سے نہیں، متحرّک سے بھی ہے۔ ساکن کا ذکر اس لئے ہُوا کہ حیوانی اور جمادی مخلوق پر حالتِ سکون غالب ہے۔ اور ہر متحرّک کیلئے آخر سکون ہے۔ یا مثلاً

اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ (جو غیب پر ایمان لائے ہیں)

یعنی اس پر جس کے ادراک سے انسان عاجز ہے، مگر مراد اس سے بھی ہے، جس کے ادراک سے انسان عاجز نہیں ہے۔ اس لئے کہ دونوں پر ایمان واجب ہے۔ اور غیب کا خصوصیت سے یوں ذکر ہُوا کہ ایمان بالغیب زیادہ قابلِ تعریف ہے اور ایمان بالشہادہ، ایمان بالغیب میں مضمر ہے نہ بالعکس۔ یا مثلاً وَرَبُّ الْمَشَارِقِ سے مراد ربِ مشارق و مغارب سے ہے۔

"قرآن کے بدائع کا علم"۔ علماء نے ۴۳ قسم کے بدائع یعنی Figures of Speech کی مثالیں قرآن مجید میں سے دی ہیں، مثلاً مجاز، استعارہ، تشبیہ، کنایہ، تمثیل وغیرہ کی "سورتوں کے فواتح، یعنی آغاز کا علم"۔ دس طرح سے سورتیں قرآن مجید

میں شروع ہوئی ہیں۔ مثلاً ثنائے باری تعالیٰ سے، حروفِ تہجی یعنی متشابہات سے، ندا سے، خبریہ جملوں سے، قسموں سے، شرط سے، وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح ہے "سورتوں کے خواتم" یعنی انتہا کا علم۔ "ربطِ آیات و سوَر کا علم یعنی ایک آیت اپنے ماقبل کی آیت کا تکملہ ہے یا مستقل ہے؟ اور اگر مستقل ہے تو اس کا اپنے ماقبل سے کیا تعلق ہے؟ اسی طرح ہر سورت کے بارے میں امر دریافت طلب ہوتا ہے کہ پچھلی صورت سے اس کی وجہ اتصال کیا ہے؟ اور کس بارے میں یہ سورت نازل ہوئی ہے "آیاتِ متشابہات کا علم"۔ اِس فن میں کئی کتابیں لکھی گئیں ہیں۔ یعنی ایک ہی قصہ مختلف صورتوں میں کیوں آیا ہے؟ کہیں اس میں زیادت ہے، کہیں نہیں وغیرہ وغیرہ۔ "معرفت اعجاز قرآن کا علم"۔ اس بارے میں ایک خلقت نے کتابیں لکھی ہیں۔ "قرآن سے جو علوم نکلے ہیں، اُن کا علم" — "امثالِ قرآن کا علم"، قرآن میں متعدد جملے ارسال المثل کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً آلآنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ — اَلَیْسَ الصُّبْحُ بِقَرِیْبٍ — لِکُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ — فَعَسٰۤی اَنْ تَکْرَهُوْا شَیْئًا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ وغیرہ وغیرہ۔ "اقسامِ قرآن کا علم" — "اُن اسماء اور کنیتوں اور القاب کا علم، جو قرآن میں مذکور ہیں"، قرآن مجید میں ۲۵ مشہور انبیاء اور مرسلین کا ذکر آیا ہے۔ "مبہماتِ قرآن کا علم" — اِس علم کا مرجع نقل محض ہے۔ اس میں رائے کا دخل نہیں۔ مبہمات کی مثال اس قسم کی آیات میں دیکھیے:۔ کَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَةٍ — وَاسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْیَةِ — وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖ وغیرہ وغیرہ۔

"اُن لوگوں کے نام کا علم" جن کے بارے میں آیاتِ قرآنی نازل ہوئیں"۔ "فضائلِ قرآن کا علم" — "مفرداتِ قرآن کا علم" — ا... کے احکام اور...

معانی کے متعلق بحث ہوتی ہے۔ "خواصِ قرآن کا علم" ۔ "قرآن کے رسم الخط اور آداب کتابت کا علم" ۔ "غرائب تفسیر کا علم" ۔ "طبقات مفسرین کا علم" ۔ صحابہؓ میں سے دس تفسیر کے لئے مشہور تھے۔ خلفائے اربعہ، ابن مسعود، ابن عباس، ابی بن کعب زید بن ثابت، ابوموسیٰ الاشعری، اور عبد اللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہم۔ تابعین میں سے مجاہد، عطاء بن ابی رباح وغیرہما۔ یہ علماء مکہ تھے۔ کوفہ میں اصحاب ابن مسعود، مدینے میں زید بن اسلم اور امام مالک۔ ان کے بعد ایک اور طبقہ آیا ہے جس نے اقوال صحابہ اور تابعین کو جمع کیا۔ مثلاً سفیان بن عُیَینہ، اور وکیع بن الجراح اور ابوبکر بن ابی شیبہ وغیرہم۔ ان کے بعد طبری ہیں اور ان کی کتاب عظیم الشان تفسیروں میں سے ہے۔ ان کے بعد اور لوگ ہیں، مگر ابن جریر ان سے فائق ہیں۔ اس لئے ان کی کتاب میں توجیہ اقوال اور ترجیح بعض بر بعض اور اعراب اور استنباط ہے۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ فروعِ علم تفسیر میں تقریباً ۸۰ علم شامل ہیں۔ ان میں سے بعض علوم بعض دوسرے علوم کے ساتھ مل گئے ہیں۔ اگر انہیں علیحدہ کر دیا جائے تو علوم کی تعداد تین سو ہو جائے۔ اس تفصیل سے مقصود یہ ہے کہ شروع اسلام سے اب تک علماء امت رحمہم اللہ اجمعین نے کتاب پاک کو سمجھنے اور اسے ہر نقطۂ نظر سے دیکھنے کی گراں قدر اور پیہم سعی کی ہے اور ہزاروں کتابیں ان علوم پر لکھی ہیں۔ فجزاہم اللہ عنا خیر الجزاء۔

حضورؐ کا مقصدِ عالی

سیرتِ نبویہؐ کے اجمالی مطالعہ کے بعد ہم نے قرآن مجید اور اس کے متعلقہ علوم کے بارے میں بعض اطلاعات حاصل کیں اور اس کی تلاوت کے شرائط و آداب کا ذکر سُنا۔ آج ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ مقصدِ عالی جو حضورؐ کے پیشِ نظر تھا اس کی تکمیل کیونکر اور کس حد تک ہوئی؟

۹ھ کا ذکر ہم کر چکے ہیں کہ اس سال عرب کے مختلف حصوں سے وفد مدینہ منورہ میں آئے، اور اپنے اپنے قبائل کی اطاعت کا اعلان کیا۔ اسی سال آپؐ نے قبائل کو خطوط بھیج کر انہیں اسلام پیش کیا۔ اسی سال کے موسم خزاں میں شمالی عرب کے خلاف مہم کا اہتمام کیا گیا۔ اس لئے کہ شاہِ غسان نے مخالفانہ رویہ اختیار کر رکھا تھا۔ منافقین اور مدینے کے گرد و نواح کے اعراب اس مہم میں شامل ہونے سے متامّل تھے۔ کبھی سرِ دست فائدہ نہ ہونے اور دُور دراز کے سفر کا عذر کرتے، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے
لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوكَ ، اور کبھی شدّتِ گرمی کا، جس کے جواب میں ارشاد ہوا۔ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرًّا۔ "کہہ دیجئے کہ جہنّم کی گرمی کی شدّت بہت زیادہ ہے۔"

غرض یہ مہم تبوک پہنچی اور نصاریٰ اور یہود کی ریاستیں جو شمالی عرب میں تھیں یعنی اَیْلَہ، اَذْرُح اور مَقْنَا نے جزیہ دینا قبول کیا اور خالد بن الولید نے دُومۃ الجندل کے اہم مقام پر قبضہ کر لیا۔ غزوۂ تبوک سے تھوڑی ہی مدّت بعد عبداللہ بن اُبَیّ مشہور منافق فوت ہوا۔ یہ وہ شخص ہے جو غزوۂ اُحد میں اسلامی لشکر کے ایک تہائی

آدمیوں کو لے کر الگ ہو گیا تھا۔ جو یہ کہتے تھے کہ "ہم نہیں جانتے، ہم کس لئے اپنے آپ کو قتل کرائیں"۔ اور غزوۂ تبوک میں اس نے منافقوں کے ساتھ رسول اللہؐ کے خلاف ایک گہری سازش کی تھی۔ اس کے مرنے کے بعد، مدینے میں کچھ امن ہو گیا اور منافقین کی ریشہ دوانیاں کم ہو گئیں۔ فتح مکّہ ہو چکی تھی۔ بدوی قبائل اطاعت قبول کر رہے تھے۔ مثلاً عامر بن صعصعہ، تمیم کے بعض لوگ، اسد اور اور شمال میں جائیں تو بکر و تغلب، بحرین اور عمان کے دُور افتادہ علاقوں میں بھی جو ایرانیوں کے زیر اثر تھے۔ اور اقیال یمن کے اندر اسلامی تعلیمات اور نیا نظامِ زندگی پہنچ چکا تھا، اور ان لوگوں نے اسے بہت گرمجوشی سے قبول کیا تھا۔ مگر بعض جماعتیں ان قبائل میں ایسی بھی تھیں، جو ابھی ایمان نہیں لائی تھیں۔ عربوں کے سوا عرب کے یہود اور نصاریٰ نے اور جنوبی اور مشرقی عرب کے مجوس نے بھی جزیہ دینا قبول کیا تھا۔

اب اُمّتِ اسلامی وجود میں آ چکی تھی۔ یعنی ایک نئی سوسائٹی جو مذہبی بنیادوں پر قائم تھی اور جس کے وجود میں لانے کیلئے جناب رسالت مآبؐ برسوں سے کوشاں تھے۔ قبائل کے پُرانے اور نہ ختم ہونے والے منافشات اور باہمی مخاصمات جس کی وجہ سے نت نئے فسادات کھڑے ہوتے رہتے تھے، حضورؐ کے طفیل اب ختم ہو گئے تھے۔ اور سب مومن بھائی بھائی بن چکے تھے:

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا (۳ : ۹۸)

"اور اللہ کا وہ احسان یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ پھر اللہ نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کر دی اور تم اس کے فضل سے بھائی (بھائی) بن گئے"۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ إِخْوَةٌ اور فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ کا مژدۂ جانفزا انہیں پہنچ چکا تھا۔ ایمان لانے والوں میں قوم و قبیلہ، خون اور رشتے، دولت و ثروت کے فرق مٹ چکے تھے۔ ابتداً ان اعتبارات سے تفاوت نہ تھا، بلکہ تقوٰے کے اعتبار سے تھا۔ فَإِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ أَتْقَاكُمْ۔

بدویوں میں پختگیٔ ایمان ابھی نہ تھی۔ قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا۔ قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلٰكِنْ قُوْلُوْا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيْمَانُ فِي قُلُوْبِكُمْ (۴۹: ۱۴) (عرب دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ (اے پیغمبر) ان سے کہدو کہ تم ایمان نہیں لائے، ہاں (یوں) کہو، کہ ہم مسلمان ہو گئے۔ اور ایمان کا تو ہنوز تمہارے دلوں میں گذر تک نہیں ہوا) لیکن انہیں موقع مل رہا تھا کہ وہ اپنی حالت بہتر بنائیں۔ اور ان کے ساتھ وعدہ تھا کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم پر چلیں تو اس صورت میں اللہ ان کے عملوں (کے اجر) میں سے کسی طرح کی کانٹ چھانٹ نہ کرے گا۔

۹ھ کے حج میں آنحضرتؐ خود شریک نہ ہوئے، اپنے بجائے آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو بھیجا اور انہوں نے امام بخاریؒ کی روایت کے مطابق ابوہریرہؓ کو چند آدمیوں کے ساتھ منیٰ میں بھیجا اور اس اہم بات کا اعلان کر دیا کہ "اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے اور کوئی برہنہ شخص طواف نہ کرے۔"

۱۰ھ میں آپؐ نے حجۃ الوداع کیا، اور اپنا مشہور خطبہ پڑھا۔ جس کے فوراً ہی بعد وحی کے ذریعے آپؐ کو تکمیلِ دین اور اتمامِ نعمت کا پیغام پہنچا۔ اس عظیم الشان موقع سے چند ماہ کے بعد آپؐ نے انتقال فرمایا۔

یہ حضورؐ ہی کے طفیل تھا کہ عربوں کی مذہبی حس بیدار ہوئی، انہیں بلند اخلاقیات

کا درس دیا گیا۔ اس کے ذریعے ان کی اصلاح کی گئی اور اسلام کا پیغام اہلِ عالم کو پہنچانے کے لئے انہیں تیار کیا گیا، ان مذہبی اور اخلاقی تصوّرات سے یہی نہیں کہ عرب سوسائیٹی کی روحانی تشنگی کو تسکین ہوئی، بلکہ جب وہ پیغام اسلام لے کر ممالک عجم میں پہنچے، تو بلا امتیازِ ملک و ملت ان قوموں کی روحانی تسلّی بھی انہیں مذہبی اور اخلاقی تصوّرات سے ہوئی اور اسلامی قدریں ان کی اپنی قدریں بن گئیں۔ اور ایک ایسی مضبوط، دُور رس اور دیرپا روحانی اور عقلی بیداری پیدا ہوئی کہ یہ قومیں اپنے قیمتی آثار سے جریدۂ عالم پر اپنے دوام کا نقش ثبت کر سکیں۔ اس تحریک کا، جس نے ایک دُنیا کو قرنوں تک متاثر کیا اور کر رہی ہے۔ محرّکِ اوّل کون تھا؟ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم جنہوں نے اسلام کا سبق سب کو پڑھایا اور پاک عقائد اور صحیح اعمال کا نظام اپنی امّت کی دائمی تربیت کیلئے ان میں چھوڑا۔ اور اس طرح دین و دُنیا کی فلاح و بہبود کا پائندہ سامان انہیں بہم پہنچایا۔

آخر میں ارکان اسلام میں سے صرف نماز اور حج کے متعلق ہم ایک انگریز مصنّف کی تحریر سے دو اقتباس آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر آرنلڈ لکھتے ہیں:-

"اسلامی سوسائیٹی کی مذہبی زندگی کا امتیازی پہلو ان کی نماز باجماعت ہے۔ اور سیّاح اور دوسرے لوگ جو مشرق میں گئے ہیں وہ اس سے اکثر بے حد متاثر ہوئے ہیں۔ بشپ لیفرائے LEFROY (جو اس صدی کے شروع میں لاہور کے بشپ تھے) لکھتے ہیں:- "جو شخص مسلمانوں سے پہلی دفعہ ملتا ہے۔ ان کے مذہب کے اس پہلو سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تم کہیں بھی ہو، گلی میں، ریلوے سٹیشن پر، کھیتوں میں یہ نہایت عام بات ہے کہ تمہیں کوئی نمازی نظر آئے جو نمائش ریا اور نمائش کے بغیر جس

کام میں وہ اس وقت لگا ہوا ہے، اسے عجلت اور انکسار کے ساتھ چھوڑ چھاڑ کر، وقت نماز پڑھنے کیلئے جا رہا ہے۔ اس سے بڑے پیمانے پر اسی بات کو دیکھئے۔ کوئی شخص جس نے دہلی کی عظیم الشان جامع مسجد کے صحن کو رمضان میں جمعۃ الوداع کے دن نمازیوں سے سر تا سر بھرا ہوا دیکھا ہو، جو تعداد میں شاید ۱۵ ہزار نفوس ہوں۔ جن میں سے ہر ایک نماز میں مشتغل ہے۔ جس کی ہر حرکت سے عمیق ترین تعظیم اور انکسار ظاہر ہوتا ہے۔ کوئی شخص جس نے یہ منظر دیکھا ہو اس منظر سے اور اس قوت سے جو اس نظام میں مضمر ہے، گہرا اثر قبول کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح مؤذن کی روزانہ مؤقت اذان کی باقاعدگی جو منہ اندھیرے فجر کے وقت یا کاروبار کے اوقات کے شور وغل کے باوجود ہوا میں گونجتی ہے، اسی ہیبت وجلال کی مظہر ہے۔"

(یہ تو سنئے بشپ لیفرائے) رینان لکھتا ہے کہ:۔ "میں کبھی کسی مسجد کے اندر داخل نہیں ہوا، مگر یہ کہ داخل ہوتے وقت ہی ایک کشش میرے دامن دل کو کھینچتی ہے بلکہ مجھے ایک قسم کا افسوس ہوتا ہے کہ میں کیوں مسلمان نہیں ہوں۔ حقیقت میں یہ نظارہ بارہا (غیر مسلموں کیلئے) تبدیلئ مذہب کا موجب بنا ہے۔ ایک یہودی جو اسکندریہ میں رہتا تھا ۱۲۹۸ء میں مسلمان ہو گیا۔ وہ لکھتا ہے کہ ایک شدید بیماری کے اثناء میں، میں نے خواب دیکھا جس میں مجھے کسی نے مسلمان ہو جانے کا حکم دیا۔ جب میں مسجد میں داخل ہوا اور میں نے مسلمانوں کو فرشتوں کی طرح صف باندھے دیکھا تو میرے دل نے کہا۔ بے شک یہی وہ اُمّت ہے جس کے پیدا ہونے کی خوشخبری پیغمبروں نے دی تھی۔ جب امام سیاہ لباس پہنے خطبہ دینے لگا تو مجھ پر ہیبت چھا گئی اور جب خطبہ ان الفاظ پر ختم ہوا کہ اِنَّ اللّٰہَ یَأْمُرُکُمْ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ

لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ٥ ("مسلمانو! اللہ انصاف کرنے کا حکم دیتا ہے اور (لوگوں کے ساتھ) احسان کرنے کا اور قرابت والوں کو (مالی) امداد دینے کا، اور بے حیائی (کے کاموں) اور ناشائستہ حرکتوں اور (ایک دوسرے پر) زیادتی کرنے سے منع کرتا ہے۔ تم لوگوں کو (ایسی ایسی) نصیحتیں کرتا ہے، تاکہ تم (ان باتوں کا) خیال رکھو") اور نماز شروع ہوئی تو مجھ پر عجیب کیفیت طاری ہوئی.... ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رکوع و سجود میں مؤمن اللہ پاک کا جلوہ دیکھ رہے ہیں اور میرے دل نے کہا کہ اگر قرونِ گذشتہ میں خدا نے دوبار اسرائیل سے تکلّم کیا، تو وہ اِس اُمّت کے ساتھ ہر نماز میں تکلّم کرتا ہے۔"

ڈاکٹر آرنلڈ حجّ کے متعلق لکھتے ہیں :-

"یہ عظیم الشان بین الاقوامی مجمع جس میں ہر سال ہزاروں حاجی نہ صرف متصلہ ممالک سے حجّ میں شامل ہوتے ہیں، بلکہ دُور دُور کے ممالک سے مثلاً چین، سینی گال، اور کیپ ٹاؤن سے آتے ہیں۔ اسلامی دُنیا کے اتحاد کا عجیب وغریب منظر پیش کرتا ہے۔ اور مسلمانوں میں اخوّت کے جذبات کو پیہم تازہ کرتا رہتا ہے۔ یہی جذبات ان مسلمانوں کے ذہن نشین بھی کئے جاتے ہیں جو خود کسی وجہ سے حجّ نہیں کر سکتے۔ اس طرح کہ جس دن شہر مکّہ سے باہر قربانی دی جا رہی ہوتی ہے، دُنیا کے تمام حصّوں میں مسلمان عید اضحیٰ مناتے ہوتے ہیں اور اپنے زیادہ خوش بخت حاجی بھائیوں کے ساتھ ایک ہی سلکِ ہمدردی میں منسلک ہوتے ہیں۔"

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ٥

تاریخ علمِ حدیث

ہر شخص جانتا ہے کہ علمِ دین، کتاب و سُنّت کے علم ہی کا نام ہے اور کتاب و سُنّت کی پیروی ہی میں دین و دُنیا کی بہتری ہمارے لئے متصوّر ہے؛ دلوں کی ہدایت، سعادت اور پاکیزگی، کتاب و سُنّت کے سمجھنے، اُن کے معانی میں غور و فکر کرنے، اور ان کے اتباع ہی میں مضمر ہے۔

سردست مقصود یہ ہے کہ ہم بتائیں کہ سُنّت یا حدیث سے مراد کیا ہے؟ صاحبِ رسالتؐ سے وہ ہم تک کس طرح پہنچی، پہلی چند صدیوں میں کن ادوار سے گذری، ان صدیوں میں حدیثوں کے اہم مجموعے کیونکر مدوّن و مرتّب ہوئے اور وہ کون کون سے ہیں؟ راویانِ حدیث کی جانچ پڑتال کے لئے اور دُوسرے علومِ حدیث کے بارے میں سلفِ صالحین نے کیا کیا خدماتِ جلیلہ سرانجام دیں؟

"سُنّت" لغت میں راہ و روش کو کہتے ہیں اور اصطلاح میں حدیث کے معنوں میں مستعمل ہے۔ حدیث کے لغوی معنی خبر کے ہیں، اور اس سے مراد ہے نبیؐ کے اقوال و افعال و احوال۔ افعال میں وہ امور بھی شامل ہیں۔ جنہیں آپؐ نے مسلمانوں کو کرتے دیکھا، یا ان کے عمل میں آنے کے متعلق آپؐ کو اطلاع ملی اور آپؐ نے ان امور کے متعلق ناپسندیدگی ظاہر نہ فرمائی۔ احوال میں اکثر وہ باتیں شامل ہیں جو آپؐ کی نسبت سیرت کی کتابوں میں درج ہیں۔

اب ہمیں پہلے یہ دیکھنا ہے کہ "احادیث رسول اللہؐ سے ہم تک کیونکر پہنچیں؟"

پہلی صدی ہجری میں یعنی صحابہؓ اور اکابر تابعین کے زمانے میں احادیث، کتابوں کی صورت میں مرتب نہیں ہوئی تھیں، بلکہ عموماً ان بزرگوں کے حافظوں میں محفوظ تھیں۔ اس زمانے میں تدوینِ حدیث اس لئے نہ ہوئی کہ رسول اللہؐ نے کتابتِ حدیث سے منع فرمایا اور صحابہؓ نے قرآن مجید کے سواء آپؐ سے جو کچھ سُنا، سیکھا، اسے تحریر میں نہ لائے۔ صحیح مسلم میں ابو سعید الخدری سے روایت ہے کہ "رسول اللہ نے فرمایا جو کچھ مجھ سے سُنا یا سیکھا ہے، اُسے نہ لکھو۔ جس نے قرآن کے سوا مجھ سے کچھ اور سُن کر لکھا وہ اسے مٹا دے۔ ہاں، میری حدیث بیان کیا کرو۔ اور جس نے ارادۃً جھوٹ بات میری طرف منسوب کی، وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنالے۔"

بہت سے علماء کا قول ہے کہ رسول اللہ نے کتابتِ حدیث سے اس لئے منع فرمایا کہ حدیث شریف قرآنِ مجید کے ساتھ مخلوط نہ ہو جائے۔ اسلام کا ابتدائی زمانہ تھا، نزولِ وحی کا دَور ابھی مکمل بھی نہ ہُوا تھا، لوگوں کے کان ابھی قرآنی عبارتوں سے اس حد تک مانوس نہ ہوئے تھے کہ سُنتے ہی قرآن اور حدیث کی عبارتوں میں فرق کر سکیں۔ اس دور میں وحی "متلو" اور "غیر متلو" کے اختلاط کا خوف تھا۔ اس وقت حدیث کے لکھنے کی ممانعت ہوئی، بعد میں یہ خوف نہ رہا، تو کتابتِ حدیث کی اجازت دی گئی۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ابتدائے اسلام میں کتابت جاننے والے بہت کم تھے۔ بلاذری نے "فتوح البلدان" میں ایک روایت دی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ اسلام آیا تو مکّے میں قریش کے صرف ۱۷ مرد لکھنا جانتے تھے اور پانچ عورتیں، یہ کُل ۲۲ آدمی ہوئے، مدینے شریف میں ان کی تعداد اور بھی کم تھی، یعنی صرف گیارہ۔ ایسی

صورت میں زیادہ ضروری تھا کہ لوگوں کو قرآنِ مجید کی کتابت میں مشغول رکھا جائے۔ ہاں جب کاتبوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہو گیا اور اسباب ممانعت رفع ہو گئے کتابتِ حدیث کی اجازت ہو گئی۔

چنانچہ اس اجازت سے فائدہ اٹھا کر چند لوگوں نے احادیث کو تحریری صورت بھی دی۔ ان میں ایک عبداللہ بن عمرؓ تھے۔ وہ رسول اللہ سے جو کچھ سُنتے تھے، اُسے قیدِ کتابت میں لاتے تھے۔ انہوں نے ایک صحیفہ لکھا، جسے "الصادقہ" کہتے ہیں۔ اس میں صحیح ترین حدیثیں درج تھیں اور چاروں اماموں نے ان احادیث کو بطورِ حجّت استعمال کیا ہے۔ مشہور قصّہ ہے کہ ایک صحابی ابو شاہ یمانی یومِ فتح میں حضورؐ کے خطبے کے بعد کھڑے ہوئے اور عرض کیا۔ "اے رسول اللہ، یہ میرے لئے لکھ دیں"۔ حضورؐ نے فرمایا "اکتبوا لابی شاہ" (ابو شاہ کو لکھ دو) یعنی خطبۂ فتح، ابن عبدالبرّ نے ایک روایت دی ہے کہ حضرت علیؓ کے پاس ایک صحیفہ تھا جس میں بعض باتیں درج تھیں۔ خود حضورؐ نے عمرو بن حزم وغیرہ کیلئے ایک تحریر جو صدقات، دِیات و فرائض و سنن سے متعلق تھی لکھوا کر دی، ایک اور روایت ہے کہ زید بن ثابتؓ نے علمِ فرائض پر کچھ لکھا، حضرت عبداللہ بن مسعود کے لڑکے کے پاس اپنے والد کی تحریر کردہ کتاب تھی حضرت سعیدؒ بن جبیر، حضرت ابنِ عباسؓ کے ہمراہ ہوتے، تو ان سے احادیث سُن کر "واسطۃ الرّحل" یعنی کجاوے کے سامنے کی لکڑی پر لکھ لیتے۔ اور جب اونٹ سے اترتے تو یہ احادیث نقل کر لیتے۔ عبد الرحمٰن بن ابی الزِناد اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ فرماتے تھے:۔ "ہم حلال و حرام کے متعلق احادیث لکھ لیا کرتے تھے"۔

حضرت ابو ہریرہ فرماتے تھے کہ: صحابیوں میں ان سے زیادہ حدیثیں کسی نے

روایت نہیں کیں، بجز عبداللہ بن عمرو کے۔ وہ حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے اور ابوہریرہ لکھنا نہیں جانتے تھے۔

مختصر یہ کہ صحابہ اور تابعین کے اول زمانے میں فی الجملہ صورت یہ رہی کہ حدیث کی روایت زبانی تھی، اس کی کتابت بہت ہی کم ہوتی تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب انتقال فرمایا تو صحابہؓ نے فوراً ہی اس بات کا اہتمام کیا کہ آیات و سُوَرِ قرآنی کو جو عہدِ رسالت میں لکھی جا چکی تھیں، یکجا لکھ لیا جائے۔ جب یہ یکجا لکھ لی گئیں تو اس کو مصحف کا نام دیا گیا۔ مگر قرآنِ مجید کی طرح حدیث کو یکجا جمع کرنے اور اس کو کتابی صورت دینے کی طرف ایک مدّت تک توجّہ نہ دی گئی، البتہ زبانی روایت کے ذریعے حدیث کی نشر و اشاعت برابر جاری رہی یہ احادیث حضور علیہ السّلام کے ان الفاظ میں بیان ہوتی رہیں جو سامعین کے ذہنوں میں محفوظ تھے۔ ورنہ ان الفاظ کا مطلب بیان ہوتا رہا، اس لئے کہ حدیث سے مقصود معنیٰ ہیں۔ بخلاف قرآن مجید کے کہ الفاظِ قرآنی میں اعجاز ہے، وہاں ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ نہیں آسکتا، گو اس کا ہم معنیٰ ہی کیوں نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ کتابت قرآن مجید کی واجب ہوئی اور حدیث کی نہ ہوئی۔

پہلی صدی کے آخر میں جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے کتابتِ حدیث کا حکم دیا۔ اس کا مفصّل بیان انشاء اللہ کل ہو گا۔

کل ہم نے پہلی صدی ہجری کے آخر تک، علم حدیث کی تاریخ بیان کی تھی اور عرض کیا تھا، کہ صحابہ کبار اور تابعین کے زمانے میں حدیث غیر مدوّن تھی، البتہ جب حضرت

عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے تو انہوں نے حکم دیا، کہ "حدیث لکھی جائے"۔ چنانچہ صحیح بخاری میں ہے کہ " انہوں نے ابوبکر بن حزم کو لکھا کہ حدیثِ رسول اللہ کو تلاش کر کے لکھ لو، اس لئے کہ مجھے علم کے مٹنے اور علماء کے جاتے رہنے کا ڈر ہے"۔ یہ ابن حزم، مدینے میں، خلیفہ کے نائب امیر اور نائب قاضی تھے اور بقول امام مالکؒ مدینے میں علم قضاء میں ان سے بڑھکر کوئی نہ تھا، یہ سنہ ۱۲۰ھ میں فوت ہوئے۔ انہیں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے حکم سے مدینے کے امام محمد بن مسلم زہریؒ نے، جو اہلِ حجاز و شام کے عالم اور ائمۂ اعلام میں سے ہیں" حدیث کی تدوین کی" یہ سنہ ۱۲۴ھ میں فوت ہوئے امام زہریؒ کے بعد کے طبقے میں تدوینِ حدیث کا رواج عام ہو گیا، علماء اس زمانے میں بلاد و امصار میں پھیل گئے تھے۔ اس لئے حدیث کی تدوین بھی شہروں میں شائع ہوئی مگر اس طرح سے کہ حدیث میں صحابہ کے اقوال اور تابعین کے فتوے ملے ہوئے تھے۔

ہشام بن عروہ (م سنہ ۱۴۶ھ) کی کتابیں یومِ حرّہ میں جل گئیں، تو وہ کہا کرتے تھے کہ کاش میرے اہل و عیال کے عوض میری کتابیں بچ جاتیں۔ چوتھی صدی کے مصنف اسحٰق الندیم صاحبِ کتاب الفہرست نے ایک کتاب خانے کا حال دیا ہے، جسے اُس نے خود دیکھا تھا۔ اس میں دُوسری صدی کے اصحابِ حدیث مثلاً سفیان بن عُیینہ، سفیان الثوری، اوزاعی وغیرہم کی تحریریں تھیں، جو اُس نے بچشم خود دیکھی تھیں۔ ان دونوں قصّوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ دُوسری صدی میں کتابتِ حدیث خاصی عام ہو چکی تھی۔ اور اس زمانے میں یہ نہ تھا کہ صرف متفرق حدیثوں ہی کی کتابت ہوتی ہو، بعض اکابر نے حدیث کو ابواب کی صُورت میں بھی جمع کرنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ مکّہ شریف میں ابواب میں جمعِ حدیث کی ابتداء ابن جُریج (م سنہ ۱۵۰ھ) نے کی۔ مدینے میں ابن اسحٰق (م سنہ ۱۵۱ھ) یا مالک بن انس (م سنہ ۱۷۹ھ)

نے، یمن میں سفیان ثوری (م ۱۶۱ھ) نے، شام میں اوزاعی (م ۱۵۷ھ) نے، یمن ہی میں معمر (م ۱۵۳ھ) نے، خراسان میں ابن المبارک (م ۱۸۱ھ) نے، اور اسی طرح دیگر بلاد و امصار میں ہوا۔

دوسری صدی کے ان اکابر نے جو حدیثیں جمع کیں، ان میں جیسا کہ ابھی ذکر ہوا اقوالِ صحابہ اور فتاوائے تابعین مخلوط تھے۔

اس صدی کی سب سے زیادہ مشہور اور مقبول کتاب حدیث "مؤطا امام مالک" ہے۔

امام دار الہجرۃ ابو عبد اللہ مالک بن انس الاصبحی بنو حمیر میں سے تھے۔ مدینے میں ۹۳ھ یا ۹۴ھ میں پیدا ہوئے، اور وہیں نشو نما پایا۔ ان کے چچا اور دادا، دونوں رُواۃِ حدیث میں سے تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے بھی حدیث کا مطالعہ شروع کیا، اور تابعین کے فقیہوں اور عابدوں کی خدمت میں حاضر ہو کر تحصیل اور جمع حدیث میں مشغول رہے۔ اور اتنا نام پیدا کیا کہ ان کا شاگرد ابنِ وہب کہتا ہے کہ میں نے مدینے میں منادی سُنی کہ:-

"سوا مالک بن انس اور ابن ابی ذئب کے کوئی فتوٰے نہ دے۔"

اور اس سے مثل بنی:- "لا یُفتیٰ و مالکٌ بالمدینۃ" "مالک (بن انس) کے مدینے میں موجود ہوتے فتوے نہیں دیا جا سکتا۔"

امام مالک کی زندگی کا ایک اہم واقعہ، محمد بن عبد اللہ بن حسن اور ان کے بھائی ابراہیم کا خروج ہے۔ ۱۴۴ھ میں خلیفہ منصور نے امام مالکؒ کے توسط سے ان دونوں بھائیوں کو جو اس وقت چھپے ہوئے تھے اہلِ مدینہ سے طلب کیا۔ ۱۴۵ھ میں محمد بن عبد اللہ مدینے پر قابض ہوئے تو امام مالک نے فتویٰ دیا کہ مجبور کی سوگند بے اثر ہے، اس فتوے

کی وجہ سے بہت سے لوگ جو بنو العباس کی بیعت کی وجہ سے اپنے آپ کو مجبور پاتے تھے، کھلے بندوں بنو حسن سے جا ملے۔ جب ۱۴۷ھ میں خلیفہ منصور نے فتح پائی تو اس کے چچا جعفر بن سلیمان والیِ مدینہ نے اس فتوے کی وجہ سے امام صاحب کو ستر کوڑے لگوائے اور ان کا بازو ایسی بری طرح سے کھینچا گیا کہ شانہ اُتر گیا۔ منصور کو پتہ لگا تو جعفر پر سخت ناراض ہوا۔ حج کے موقع پر آپ سے عذر کیا، معافی چاہی اور آپ سے درخواست کی کہ "جو روایات ان کے نزدیک ثابت ہیں انہیں کتاب کی صورت میں جمع کریں"۔ اس پر آپ نے "کتاب مؤطا" حدیث و فقہ میں تالیف کی۔ اس کے بعد مہدی حج کیلئے آیا تو کتاب سُنی اور ۵ ہزار دینار پیش کیے۔ ۱۶۰ھ میں مہدی نے حرم کی عمارات میں کچھ تبدیلیاں کرنا چاہیں تو ان سے مشورہ لیا۔ ۱۷۹ھ میں ہارون الرشید مع اپنی اولاد کے مدینہ مبارکہ میں آیا، تاکہ "مؤطا" سُنے۔ اور سُن کر انہیں انعام و اکرام سے مالا مال کیا۔ امام مالکؒ نے تقریباً اپنی تمام عمر مدینہ شریف میں گذار دی۔ اور یہیں ۸۵ برس کی عمر پا کر ۱۷۹ھ میں فوت اور بقیع میں دفن ہوئے۔

وہ دراز قد، کلاں سر، سپید رنگ تھے۔ ان کی پیشانی پر بال کم تھے۔ وہ خوش لباس تھے، ان کی انگوٹھی کا نقش تھا: "حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَکِیْل" اور ان کے دروازے پر لکھا تھا: "مَاشَآءَ اللّٰه"۔ یہ ماخوذ تھا اس آیۂ مبارکہ سے، جس میں ہے: "وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَکَ قُلْتَ مَاشَآءَ اللّٰه" ان کے سوانح نگار اُن کے کرم، ظرافت، وقار، تواضع اور حُبِ رسولؐ اللہ کے متعلق یک زبان ہیں۔ ادب کی وجہ سے باوجود ضعف اور بڑھاپے کے مدینہ شریف میں سوار نہیں ہوتے تھے اور کہتے تھے: "جس شہر میں رسولؐ اللہ کا جسّہ مدفون ہے اس میں مَیں سوار نہ ہوں گا" سوا موطا کے کچھ اور کتابیں بھی

امام صاحب کی طرف منسوب ہیں، جن میں ایک رسالہ بھی ہے جو انہوں نے ہارون الرشید کو لکھا۔ مگر اس کے انتساب کی صحت مشکوک ہے۔ ان کی تالیف "مؤطا" اسلامی فقہ کی تقریباً قدیم ترین کتاب ہے۔ "مؤطا" کے معنیٰ ہیں، نرم و آسان کردہ شدہ، گویا اِس سے مراد ہے "راہِ ہموار کردہ شدہ"۔ اس تالیف سے یہ مقصد تھا کہ فقہ و قضا و عبادات و سُنن فقہاء مدینہ کے اجماع کے مطابق بیان کئے جائیں۔ خلفائے بنو العباس کو ایک عظیم الشان سلطنت کے معاملات کیلئے شرعیات کے اس قسم کے مستند مجموعے کے مرتّب ہونے میں قدرتی طور پر بہت دلچسپی تھی۔ دورِ اوّل میں فقہ سادہ تھی، بعد کے دَور میں خالص علم حدیث وجود میں آیا۔ "مؤطا" سے اس دُوسرے دَور کی ابتداء ہوتی ہے۔

ان کے زمانے میں اور علماء نے بھی مؤطا لکھے، مگر ان سب سے زیادہ ان کے مؤطا کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ سمعانی نے لکھا ہے کہ امام صاحب وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے غیر ثقہ راویانِ حدیث سے اعراض کیا۔ وہ صرف صحیح حدیثوں کی روایت کرتے تھے۔ راویوں کی تنقید امام صاحب کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

امام صاحب جب تک قیدِ حیات میں رہے کتاب "مؤطا" مسودے کی حالت میں رہی۔ اس کا صاف نسخہ تیار نہ کیا گیا ایک راوی کے قول کے مطابق آپ نے پہلے اس میں دس ہزار حدیثیں جمع کیں۔ بعد میں آہستہ آہستہ ان کا انتخاب کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کے نسخے بہت ہیں اور ہر نسخے کی ترتیب الگ ہے۔ امام صاحب کے شاگردوں نے اپنی اپنی استعداد کے مطابق اپنے اپنے نسخے ترتیب دیئے اور انہیں نسخوں نے رواج پایا۔ چنانچہ احادیث میں تھوڑا تھوڑا تفاوت ہے یعنی ان میں تقدیم و تاخیر اور زیادت و نقص ہے۔

۱۶،۱۵ نسخے جو رائج تھے، ان میں سے اب مکمل صورت میں دو نسخے باقی ہیں، اگرچہ بارھویں صدی میں شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی کے قول کے مطابق ۱۶ نسخے ملتے تھے۔ ان دو میں سے ایک نسخہ یحییٰ بن یحییٰ مصمودی کی روایت ہے، دوسرا نسخہ امام محمد بن الحسن الشیبانی (م ۱۸۹ھ) کا ایڈیشن ہے۔ اس کے اکثر بابوں کے آخر میں انہوں نے مختلف مسائل کے متعلق اپنی اور امام ابوحنیفہ کی رائیں دی ہیں۔ یہ دونوں ایڈیشن کئی دفعہ طبع ہو چکے ہیں۔

مالکی مذہب خصوصیت سے مغرب میں یعنی تونس، الجیریا، مراکش اور اندلس میں بہت پھیلا۔ افریقہ کے باقی علاقوں میں بھی مالکی بہت ہیں۔ الصعید (بالائی مصر) بھی مالکی ہے۔ گو زیرین مصر شافعی ہے۔

موطا کی شرحیں اور مختصرات بہت سے ہیں، جو تیسری صدی سے لے کر تیرھویں صدی تک برابر لکھے جاتے رہے ہیں۔ تیسری صدی اور اس کے بعد جو کام علم حدیث میں ہوا، اس کا ذکر انشاء اللہ اگلی مجلس میں ہو گا۔

کل ہم نے دوسری صدی ہجری کے آخر تک علم حدیث کی تاریخ بیان کی تھی خصوصاً موطا امام مالکؒ کے متعلق جو ائمۂ اربعہ کی تصانیفِ حدیث میں سے واحد کتاب، اور اب موجود ہے۔ بعض ضروری باتیں عرض کی تھیں۔ تیسری صدی ہجری تاریخِ علم حدیث میں نہایت اہم زمانہ ہے، اس صدی میں اکابر محدثین اور ہوشیار ترین ناقدانِ حدیث محوِ عمل ہوئے اور چھ مشہور کتابیں، جن کو "صحاح ستہ" کہتے ہیں تالیف ہوئیں۔ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابن ماجہ، سنن ابی داؤد، جامع ترمذی اور سنن نسائی۔ تمام صحیح حدیثیں

سوا چند کے ان کتابوں میں جمع ہو گئیں اور استنباط احکام کا مواد یکجا ہو گیا۔

اِس صدی سے پہلے راویانِ حدیث نے حدیث کو جمع کرنے کا یہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا کہ اقوالِ صحابہ اور فتاویٰ تابعین حدیث میں ملا دیتے تھے۔ اس صدی کے شروع میں یہ طریقہ بدل دیا گیا اور اب حدیث کو اقوال و فتاویٰ سے علیحدہ کر کے جمع کرنے لگے۔ بعض ائمہ نے تو یہ کیا کہ آنحضرت سے جو کچھ مروی تھا اُسے جمع کیا، مگر اس میں صحیح اور علیل کی تمیز نہ کی اور بعض نے یہ کیا کہ صرف صحیح مجرّد کو لیا تاکہ قاری کتاب کو اس بحث میں نہ پڑنا پڑے کہ کسی حدیث کے راویوں کا مرتبہ کیا ہے اور وہ عِلل سے بری ہے یا نہیں۔

پہلے مصنف جس نے صحیح مجرّد حدیثوں کو جمع کیا، ان کا نام نامی امام ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل بخاری ہے۔ ان کے بعد اُن کے شاگرد امام ابوالحسین مسلم بن حجاج نیشاپوری نے بھی یہی طریق اختیار کیا۔ ان دونوں اماموں کی کتابیں کتبِ حدیث میں سے صحیح ترین کتابیں ہیں۔ امام شافعیؒ نے موطّا کی نسبت کہا تھا کہ "کتاب اللہ کے بعد روئے زمین پر کتابِ مالک سے صحیح تر کتاب موجود نہیں" تو یہ اُس وقت کہا تھا جب صحیح بخاری و مُسلم وجود میں نہیں آئی تھیں، مختصر یہ کہ تیسری صدی جمع و تدوینِ حدیث کے نقطۂ نظر سے نہایت اہم صدی ہے، اس صدی کے آخر میں جمع و تدوین کا کام تقریباً ختم ہو گیا اور اس کے بعد ترتیبِ حدیث کا دور شروع ہوا، جس میں طالبِ علم کے لئے ہر طرح کی سہولتیں پیدا کی گئیں۔

علماء نے جمع حدیث کے وقت کبھی تو یہ طریق اختیار کیا ہے کہ ابواب میں احادیث کو جمع کیا ہے، یعنی احکامِ فقہ وغیرہ کے مطابق ان کی تخریج کی ہے اور انہیں اقسام میں

منقسم کیا ہے، مثلاً صلوٰۃ کے باب میں نماز کے متعلق، اور باب صیام میں روزوں کے متعلق مواد جمع کیا ہے، وعلیٰ ہذا القیاس۔ صحیحین میں تو اس شرط کے ساتھ کہ صرف صحیح حدیثیں درج ہوں اور بعض اور مثلاً ترمذی، نسائی وغیرہما میں اس شرط کے بغیر۔ ایک دوسرا طریقہ جمع حدیث کا یہ ہے کہ مسانید کے اعتبار سے حدیث جمع کی جائے۔ یعنی ہر صحابی کی مسند میں جو حدیثیں اس سے مروی ہیں انہیں جمع کیا جائے، خواہ وہ صحیح ہوں یا سقیم، خواہ باب کے اعتبار سے وہ ایک قسم کی ہوں یا دوسری قسم کی۔ کتب مسانید کا مرتبہ کتب سنن سے کم سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے کہ ہر صحابی کی مسند میں اس کی حدیثیں جمع کی جاتی ہیں اور صحیح و سقیم کا فرق نہیں کیا جاتا۔ البتہ مسند امام احمد بن حنبل کو بعض محدثین نے مستثنیٰ کیا ہے۔ اب ہم ان امام صاحبؒ اور ان کی مسند کا کچھ حال بیان کرتے ہیں ان کا ذکر پہلے اس لئے کیا ہے کہ امام بخاریؒ اور مسلمؒ نے ان سے علم حدیث حاصل کیا ہے۔

امام احمد بن محمد بن حنبل، جو عام طور پر ابن حنبل کہلاتے ہیں، بنو شیبان بن ذہل سے ہیں۔ اصلاً وہ مرو سے تھے۔ بغداد میں ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے، وہیں علم حاصل کیا پھر طلب حدیث میں سفر شروع کیا۔ عراق و شام و حجاز ہوتے ہوئے یمن تک گئے اور وہاں کے علماء اور شیوخ سے حدیث سنی اور لکھی۔ واپس بغداد پہنچ کر ۱۹۵ھ سے تا ۱۹۷ھ میں امام شافعیؒ کے درس فقہ و اصول میں شامل ہوئے، تا آنکہ امام شافعیؒ مصر کو گئے اور کہا: "میں بغداد سے نکلا تو میں نے ان سے (احمد بن محمد بن حنبل سے) زیادہ متقی اور زیادہ فقیہہ وہاں نہ چھوڑا۔" عقائدِ محدثین نے ان کا نقطۂ نظر پختہ اور ثابت اور غیر متغیر بنا دیا۔ ۲۱۸ھ اور ۲۳۴ھ کے درمیان وہ ایک سخت امتحان سے گذرے

یہ زمانہ مامون، معتصم اور واثق کی خلافت کا تھا، اس زمانہ میں معتزلی عقائد کو حکومت کی امداد حاصل ہوئی اور جو لوگ خلق قرآن کے قائل نہ تھے اُن پر سختی ہوئی چنانچہ جب انہیں بھی قول بہ خلق قرآن کی طرف دعوت دی گئی تو انہوں نے یہ دعوت قبول نہ کی اس پر انہیں پابجولاں طرسوس کو روانہ کیا گیا، جہاں خلیفہ مامون اُس وقت تھا جب یہ رقہ میں پہنچے، تو خلیفہ کے مرنے کی خبر آئی۔ مگر ان کی تکلیف ابھی ختم نہ ہوئی۔ عہد معتصم، جانشین مامون میں بدستور ایذا اور قید کا سلسلہ جاری رہا، امام صاحب صبر بالغ کیساتھ یہ تمام سختیاں برداشت کرتے رہے۔ اور عقائد سلف کو نہ چھوڑا۔ آخر عہد متوکل میں دولت عباسیہ نے پھر مذہب اعتزال سے مذہب اہل سُنّت کی طرف رجوع کیا، اور خلیفہ نے مختلف طریقوں سے تلافی مافات کی کوشش کی۔ انہیں دربار میں بلایا اور ان کے علم کے بغیر ان کے خاندان والوں کا وظیفہ لگادیا، وغیرہ وغیرہ۔

زمانہ علم حدیث اور فقہ، زہد اور ورع عبادت اور سُنّت سے اُن کے شدید تعلق کا معترف ہوا۔ آخر ۲۴۱ھ میں وہ بغداد میں فوت ہوئے۔ اور وہاں کے قبرستان مقابر الشہداء میں دفن ہوئے۔ ساتویں صدی کے آخر میں دجلے کی طغیانی میں یہ قبریں تلف ہوگئیں۔

امام احمدؒ کے فرزند رشید عبداللہ نے ان کے دروس سے "مسند امام احمدؒ" مرتب کی۔ ان احادیث میں انہوں نے بعض زوائد کا اضافہ بھی کیا۔ مسند میں مکرّرات کو نکال کر ۲۸، ۲۹ ہزار حدیثیں ہیں۔ اس "مسند" کے متعلق، جس میں ۳۰۰ سے اوپر ایسی حدیثیں ہیں، جن کے راوی اور آنحضرتؐ کے درمیان فقط تین راوی ہیں، بہت سے رسائل لکھے گئے اور بہت سے مختصرات تیار کئے گئے۔ مرادی نے "سلک الدرر" میں لکھا ہے، کہ:

"بارھویں صدی میں اہلِ تقویٰ کے ایک گروہ نے اس کتاب کو نبیؐ کی قبر کے پاس ۵۶ جلسوں میں پڑھا۔"

سوا "مسند" کے چند اور کتابیں بھی امام صاحب کی تصنیف سے ہیں۔ ان کے معاصر ان کے حفظِ حدیث کی بہت تعریف کرتے تھے۔ ان کے زمانے میں ان کی کتاب "اصول دارمی" اعلیٰ و ارفع و اجمع کتب تھی۔ چونکہ اصولِ فقہ کی نسبت وہ اسانیدِ حدیث کا زیادہ تتبع کرتے تھے۔ اس لئے بعض فقہاء مثلاً طبری انھیں مسائلِ فقہ کے لئے حجت نہیں مانتے۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے فقہ میں کوئی مذہب خاص پیدا نہیں کیا لیکن ان کے تلامذہ نے ان سے فقہی مسائل پوچھے تو انہوں نے اپنا نقطۂ نظر واضح کیا، اور بعض تلامذہ نے ان کے فقہی انظار کو کتابی صورت میں بھی مرتب کر دیا۔ امام احمدؒ کے فتووں کے پانچ اصول "اتحاف النبلاء" میں دیئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ضعیف حدیث کو بھی قیاس پر فائق سمجھتے تھے۔ اگر اس باب میں کوئی اثر دافع یا قولِ صحابی نہ ہو، یا اس کے خلاف اجماع ثابت نہ ہو۔

امام صاحبؒ کے انظار کی بناء پر جن تعلیمات نے نشو ونما پائی۔ انہیں مذہب حنبلی کہتے ہیں اور اجماعِ اہلِ سنت کے مطابق وہ چار مسلمہ مذہبوں میں سے ایک ہے، چونکہ امام صاحبؒ محدّث تھے، رائے سے صرف بوقتِ ضرورت ہی کام لیتے تھے، اور اس وقت بھی تا حدِّ امکان احکام کو نصوص سے استخراج کرتے تھے، اہلِ سنت میں کسی نے ردِّ بدعت پر اتنا زور نہیں دیا، جتنا انہوں نے۔

آٹھویں صدی تک مذہب حنبلی کا بہت رواج رہا۔ مقدسی نے ایران کے شہروں مثلاً اصفہان، رَیّ، شہر زُور وغیرہا میں حنبلیوں کی کثرت، خصوصاً حبِّ امیر

معاویہؓ میں ان کے غلو کا بہت ذکر کیا ہے۔ شام میں پانچویں صدی میں مذہب حنبلی رائج ہوا، اور نویں صدی تک رہا۔ یہیں امام "ابن تیمیہؒ" اور ان کے شاگرد "ابن قیمؒ" نے اس کی ترویج کے لئے ساتویں اور آٹھویں صدی میں زور دیا، اور تاویل کا رد کیا ۔۔۔ اور زیارتِ قبور، اور توسّل باولیاء سے روکا، اور انہیں تعلیمات کا اثر وہابیہ پر بھی پڑا۔

اس کے بعد ہمیں دیکھنا ہے کہ "صحیح بخاری" اور "صحیح مسلم" کا مرتبہ ارتقاء علم حدیث میں کیا ہے۔

کل ہم نے بعض کتبِ سُنّت کا ذکر کیا تھا، جو تیسری صدی ہجری میں تالیف ہوئی تھیں اور خصوصیت کے ساتھ "مسند احمد بن محمد حنبلؒ" کا حال بیان کیا تھا۔ آج ہم "صحیحین" یعنی امام بخاریؒ کی "جامع الصحیح" اور امام مسلمؒ کی "جامع الصحیح" کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔

امام ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل الجعفی البخاری کے پردادا، جو ایرانی الاصل تھے، والیٔ بخارا کے ہاتھ پر مجوسیت ترک کر کے مسلمان ہوئے۔ اس لئے امام صاحبؒ جعفی بالولاء تھے، وہ شوال ۱۹۴ھ میں بخارا میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ان کے بچپن ہی میں فوت ہو گئے۔ ان کی والدہ نے ان کو پالا پوسا۔ ۲۰۵ھ میں جب ان کی عمر ۱۱ برس کے قریب تھی۔ انہوں نے سماعِ حدیث شروع کیا۔ ۲۱۰ھ میں جب یہ سولہویں برس میں تھے انہوں نے ابن المبارک اور وکیع کی کتابیں حفظ کیں اور اسی سال اپنے بڑے بھائی اور والدہ کے ہمراہ مکہ تشریف گئے۔ حج سے فارغ ہونے کے بعد ان کے بھائی تو وطن کو واپس ہوئے مگر یہ سماعِ حدیث کے لئے وہیں ٹھہرے رہے۔ اٹھارھویں برس میں انہوں نے کتاب "قضایا الصحابہ والتابعین و اقاویلہم" تصنیف کی، اور "التاریخ الکبیر"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس بیٹھ کر چاندنی راتوں میں تصنیف کی،
فی الجملہ وہ چھ سال تک حجاز میں مقیم رہے۔ اس کے بعد طلب علم کے لیئے مصر گئے
اور پھر ١٦ سال تک مختلف شہروں میں اسی مطلب کے لیئے چکر لگاتے اور حدیث
لکھتے رہے۔ علاوہ حجاز و مصر کے انہوں نے بلخ، مرو، نیشاپور، جبال، رَی، بغداد،
بصرہ، کوفہ، واسط، دمشق، قیساریہ، عسقلان اور حمص میں حدیث سُنی۔ وہ خود فرماتے
ہیں کہ "میں نے ١٠٨٠ محدثوں سے حدیث لکھی"۔ یہ بھی فرمایا کہ "میں شام، مصر اور الجزیرہ
میں دو بار گیا، بصرے میں چار بار، اور میں کوفہ و بغداد میں محدثین کے ہمراہ بے شمار مرتبہ
گیا۔ انہوں نے حدیث صرف سُنی ہی نہیں، عراق، حجاز، خراسان اور ماوراء النہر میں سُنائی
بھی تھی۔ حمیدی نے "جذوۃ" میں اور خطیب نے "تاریخ بغداد" میں لکھا ہے کہ "جب
وہ طلب علم کے سفر سے بغداد آئے، تو وہاں کے محدث بعد امتحان ان کی فضیلت
کے معترف ہوئے اور علم روایت میں ان کے تفرد پر انہوں نے گواہی دی"۔ کہتے ہیں
کہ "انہوں نے سو حدیثوں کو برابر برابر بانٹ لیا۔ اور ان کے متون اور اسانید کو
الٹ پلٹ کر انہیں سُنایا۔ ایک حدیث کا متن لیا، ایک کی اسناد، اور خلط ملط کر کے
انہیں سُنا دیا۔ یہ سُنتے رہے اور ساتھ ساتھ کہتے رہے "میں اسے نہیں پہچانتا"۔ پھر
ہر متن کو اس کی اسناد کی طرف، اور ہر اسناد کو اس کے متن کی طرف لوٹایا"۔ لوگ ان کے
فضل اور حفظ کے قائل ہو گئے۔ اس پر ابن خلدون نے "مقدمے" میں کہا ہے کہ اس
قصے سے ثابت ہوتا ہے کہ "ائمہ حدیث کو احادیث مع طرق و اسانید یاد ہوتی تھیں۔
اگر حدیث اپنی سند اور طریق کے بغیر روایت کی جاتی تھی تو فوراً سمجھ لیتے تھے کہ حدیث
کو اپنی وضع سے پلٹ دیا گیا ہے۔

جب یہ اپنے وطن بخارا کو واپس گئے تو اہلِ بخارا نے تین چار میل تک خیمے لگا کر ان کا استقبال کیا۔ وطن پہنچ کر یہ ایک مدّت تک درسِ حدیث میں مشغول رہے، سوءِ اتفاق سے خالد ذہلی نے، جو خلافتِ عباسیہ کی طرف سے بخارا میں متعین تھا، لوگوں کے اُکسانے پر ان سے چاہا کہ ان کے قصر میں آکر "کتاب الصحیح" سنائیں۔ یہ اکرامِ علم کے خیال سے اس پر راضی نہ ہوئے، امیر نے انہیں شہر بدر ہونے کا حکم دیا۔ سمرقند والوں کی دعوت پر امام صاحب سمرقند روانہ ہوئے، جب سمرقند سے دو فرسخ پر قریہ خرتنگ میں پہنچے، تو انہیں اطلاع ملی کہ شہر سمرقند کے لوگ دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں، کچھ چاہتے ہیں کہ یہ سمرقند آئیں، کچھ چاہتے ہیں کہ نہ آئیں۔ امام صاحبؒ کے کچھ اعزّہ خرتنگ میں تھے۔ یہ ان کے پاس ٹھہر گئے، کہ بات صاف ہو جائے، تو سمرقند جائیں، کچھ دن کے بعد وہ بیمار ہو گئے۔ اتنے میں سمرقندیوں کا قاصد بلانے کے لئے آیا۔ یہ تیار ہو گئے۔ موزہ اور عمامہ پہن کر سواری تک کوئی بیس قدم چلے ہوں گے کہ ضعف طاری ہو گیا۔ انہوں نے دُعا مانگی اور لیٹ گئے، اور جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ یہ ۲۵۶ ہجری کی عید الفطر کی رات کی بات ہے۔ بعد نماز ظہر عید الفطر کے دن خرتنگ میں مدفون ہوئے۔

امام صاحب کی حیا، شجاعت، سخاوت، ورع اور زہد کی بہت تعریف کی گئی ہے۔ "جامع الصحیح" میں متروک یا ساقط شخص کی نسبت فقط اتنا کہتے ہیں: "فیہ نظر، سکتوا عنہ" اس کے بارے میں تأمّل ہے، اس کے بارے میں خاموش رہے ہیں" یعنی یہ نہیں کہنا چاہتے کہ کذّاب ہے۔" علمائے مصر کہتے تھے کہ معرفت و صلاح میں یہ دُنیا میں بے مثل ہیں۔"

ان کی کتاب "جامع الصحیح" کی نسبت جمہور علماء کو اتفاق ہے کہ کتاب اللہ کے بعد اسلام کی اجلّ و افضل و اصحّ کتاب ہے۔ اس کی ترتیب ابواب فقہ پر ہے، ہر حصّے کا نام کتاب اور کل ۹۷ کتابیں، اس میں ہیں، عبادات، معاملات، سیرت، مغازی، معجزات، تفسیر آیات وغیرہا۔ خود امام صاحب فرماتے ہیں، کہ "انہوں نے اس کتاب کی حدیثوں کو ۶ لاکھ کے قریب حدیثوں میں سے لیا اور ۱۱ سال میں اسے تصنیف کیا ہے"۔ الحاکم ابواحمد کہتے ہیں: "ان کے بعد جس نے کام کیا اس نے انہیں کی کتاب سے لیا، جو کچھ لیا"۔ مثلاً مسلم بن الحجاج نے۔ حدیث صحیح "مجرّد" کی یہ پہلی کتاب ہے، امام صاحب نے اس میں یہ شرط ملحوظ رکھی ہے کہ وہ وہی حدیث درج کریں گے۔ جس کے راویوں کے ثقہ ہونے پر اتفاق ہے، جو کسی مشہور صحابی سے روایت کرتے ہیں اور جس کی اسناد متصل غیر مقطوع ہے۔ اگر صحابی سے دو شخص راوی ہیں، یا زیادہ تو خوب ہے، لیکن اگر اس کا ایک ہی راوی ہے اور طریق صحابی تک صحیح رہے تو یہ بھی کافی ہے۔ کتاب میں صحت کا بھی التزام ہے کہ سوا حدیث صحیح کے کوئی حدیث کتاب میں درج نہیں کی۔ پھر فقہ کے فوائد اور حکمت کے نکتے بھی نصوص سے علیحدہ کر کے بیان کر دیئے ہیں، اور متون سے بہت معانی اپنے فہم سے نکال کر ابواب میں مناسب مقامات پر لکھ دیئے ہیں، مختصر یہ کہ انتخاب احادیث میں انہوں نے تحقیق دقیق اور براعت فائقہ کا ثبوت دیا اور متن کے ضبط اور درج کرنے میں امانت عظیم دکھائی ہے۔ پھر تفقہ اور کتاب و سنّت کے معانی کا فہم، غامض اس پر مستزاد ہے۔

"صحیح بخاری" کے متداولہ نسخے کی روایت حافظ محمد الیونینی الحنبلی (م ۶۵۸ھ)

نے کی۔ انہوں نے قاہرہ کے ایک مدرسے کے وقف نسخے کا چار نسخوں سے مکرر مقابلہ کیا، جن میں سے ہر ایک ایک جیّد فاضل نے سُنا تھا، دمشق کے مشہور نحوی جمال الدین ابن مالک (م ۶۷۲ھ) کی اعانت سے یہ مقابلہ ہوا، اور معنوں کے متعلق مفید باتیں بھی اس میں لکھی گئیں۔ حافظ ذہبیؒ نے حافظ یونینیؒ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے ایک سال میں اپنے نسخے کا مقابلہ گیارہ مرتبہ کیا۔

"صحیح بخاری" کی بے شمار شرحیں لکھی گئیں، حاجی خلیفہ نے ۸۲ سے زائد شرحیں گنوائی ہیں، مگر ان میں سے مشہور تر حافظ ابن حجر عسقلانی، محمود عینی اور قسطلانی کی ہیں۔ اور فارسی کی شرحیں، ان شروح کے علاوہ ہیں۔ کتاب کے کئی مختصرات لکھے گئے۔ اس کے اسماء رجال، رجال کی تعدیل و تجریح پر کئی کتابیں لکھی گئیں۔

"جامع صحیح" کے علاوہ امام بخاری نے اور بھی کتابیں لکھیں "التاریخ الکبیر" کا ذکر ابھی آیا تھا۔ یہ "جامع الصحیح" کے مقدمے کے طور پر لکھی گئی۔ اس سے مختصر "التاریخ الصغیر" ہے۔ اسی طرح چند اور کتابیں بھی ان کی طرف منسوب ہیں۔

جو شرط "جامع صحیح" میں امام بخاری نے ملحوظ رکھی تھی وہی شرط امام مسلم ابن حجاج القُشیری النیشاپوری نے ملحوظ رکھی۔ امام مسلم ۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے بچپن سے حدیث سُنی، امام بخاری کے اُستادوں سے، خود امام بخاریؒ سے اور دیگر محدثین سے بھی سُنی۔ وہ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں سے ان کی "صحیح" سب سے زیادہ اہم ہے۔ ۲۶۱ھ میں فوت ہوئے، قبر نیشاپور میں ہے، ان کی "صحیح" "کتب ستہ" میں دُوسرے درجے پر ہے۔ "صحیح بخاری" کو اس لئے ترجیح دیتے ہیں کہ اس میں صحت کی شرائط مکمل تر ہیں، مثلاً امام بخاریؒ نے شرط کی

ہے کہ راوی، اور جس سے اس نے روایت کی، ان کی ملاقات ثابت ہو۔ "صحیح مسلم" میں ان کا ہم زمان ہونا کافی ہے۔ اسی طرح راویوں کے عدل کے اعتبار سے بھی راویانِ احادیثِ "صحیح بخاری" کو فوقیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ جو استنباطاتِ فقہیہ اور دقائقِ حکمیہ امام بخاریؒ کی کتاب میں ہیں "صحیح مسلم" میں نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ بخاریؒ اُستاد ہیں اور مسلمؒ شاگرد۔ اور علوم و صناعت حدیث میں شاگرد، اُستاد کے مرتبہ کو نہیں پہنچتا۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ "صحیح مسلم" میں ہر حدیث کی ایک ہی جگہ ہے، اور اس کے سارے طرق یکجا ہیں، حالانکہ "صحیح بخاری" میں وہ مختلف ابواب میں پھیلے ہوئے ہیں۔ غرض سہولت مراجعت "صحیح مسلم" میں زیادہ ہے۔ "صحیح مسلم" کی بھی کئی شرحیں ہیں۔ حاجی خلیفہ نے ۱۵ کا ذکر کیا ہے۔ مختصرات بھی کئی ہیں۔

پرسوں ہم نے صحیحین کا حال بیان کیا تھا، اب ہم چھ کتبِ سُنّہ میں سے باقی چار کا حال اختصار سے بیان کرتے ہیں۔ وفیات کے اعتبار سے پہلے ابوداؤد صاحبِ "سُنن ابی داؤد" ہیں۔ جن کا پورا نام ابوداؤد سلیمان بن اشعث السجستانی ہے۔ وہ ۲۰۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۷۵ھ میں بصرے میں فوت ہوئے۔ امام احمد بن حنبل ان کے استاد تھے۔ اور ترمذی اور نسائی ان کے شاگردوں میں سے تھے۔ اپنی کتاب "سنن" کو انہوں نے اپنے استاد امام احمدؒ کے سامنے پیش کیا۔ انہوں نے اسے پسند فرمایا۔ ابوسلیمان خطابی کہتے ہیں کہ وضع اور فقہ کے اعتبار سے "کتاب سنن" صحیحین سے بہتر ہے۔ اور غزالیؒ کہتے ہیں کہ احادیثِ احکام کے بارے

ہیں وہ مجتہد کے لیے کافی ہے۔ ابوداؤدؒ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی پانچ لاکھ حدیثیں لکھیں۔ ان میں سے ۴ ہزار ۸ سو انتخاب کیں، جو اس کتاب (سنن) میں درج ہیں۔ میں نے اس میں صحیح حدیث، مشابہ بہ صحیح، اور قریب بہ صحیح کا ذکر کیا ہے۔ پھر کہتے ہیں: "میں نے اپنی کتاب میں اس حدیث کا ذکر نہیں کیا جس کے ترک پر لوگوں کا اجماع ہو اور اس میں اگر ایسی حدیث جس میں سخت کمزوری ہو آ گئی ہے تو میں نے اسے واضح کر دیا ہے۔ اس میں ایسی حدیث بھی ہے جس کی سند صحیح نہیں ہے۔" اگر اس کے بارے میں میں نے کچھ نہیں کہا تو وہ صالح ہے اور ان میں سے بعض حدیثیں، بعض سے زیادہ صحیح ہیں۔" یہ ایسی کتاب ہے کہ نبی کی کوئی سنت تمہیں نہیں ملے گی، مگر یہ کہ وہ اس میں موجود ہو۔ قرآن مجید کے بعد مجھے کوئی ایسی بات معلوم نہیں جس کا سیکھنا لوگوں کے لیے اس کتاب سے زیادہ لازم ہو، اور ایک شخص کو اس کتاب کے لکھ لینے کے بعد یہ امر ضرر نہیں دیتا کہ وہ علم کی کوئی بات نہ لکھے۔"

"سنن ابی داؤد" کے شروح و مختصرات متعدد لکھے گئے۔

۲۔ "ابوداؤد" کے بعد ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی ہیں۔ جو ۲۰۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۷۹ھ میں ترمذ میں فوت ہوئے۔ انہوں نے امام بخاریؒ اور بخارا کے دیگر مشائخ سے حدیث سنی۔ ان کی "جامع الصحیح" "جامع الترمذی" بھی کہلاتی ہے۔ شاہ عبدالعزیز دہلویؒ "بستان المحدثین" میں فرماتے ہیں کہ یہ جامع بہترین کتابوں میں سے ہے، بلکہ بعض حیثیتوں میں سب کتب حدیث سے بہتر ہے۔ ایک تو ترتیب اور عدم تکرار کی وجہ سے، دوسرے اس لیے کہ اس میں مذاہب فقہا کا ذکر ہے اور ہر مذہب کے وجوہ و استدلال دیئے ہیں۔ تیسرے اس میں انواع حدیث مثل صحیح، حسن، ضعیف، غریب، معلق

دیئے ہیں۔ جو تھے اس میں راویوں کے نام، القاب، ان کی کنیتیں سب بیان ہوئی ہیں۔ اور علمِ رجال کے اور فوائد درج ہوئے ہیں۔ "صحیح ترمذی" کی متعدد شرحیں اور مختصرات مرتب ہوئے۔

۲۔ ان کے بعد النسائی ہیں، یعنی ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب الحافظ ۲۱۵ھ میں پیدا ہوئے۔ خراسان، حجاز، عراق، مصر، شام اور جزیرہ کے ائمۂ حدیث سے حدیث سُنی، اور علمِ حدیث میں کمال پیدا کیا۔ وہ اتقان اور علوِّ اسناد میں فرد تھے اور حفظ میں امام مسلم بن الحجاج سے بھی بہتر تھے، ان کی "سنن" میں، اور کتبِ سنن سے ضعیف حدیثیں کم ہیں۔ ۳۰۳ھ میں وہ رملہ میں فوت ہوئے۔ ان کی قبر بیت المقدس میں ہے۔ روایت ہے کہ جب نسائی "سنن کبیرہ" تصنیف کر چکے تو اس کو امیرِ رملہ کے سامنے پیش کیا۔ اُس نے پوچھا: "جو (حدیث) اس میں ہے صحیح ہے؟" انہوں نے کہا: "اس میں صحیح بھی ہیں اور حسن بھی، اور جو اس سے قریب ہے، وہ بھی۔" اس نے کہا: "صحیح کو میرے لئے غیر صحیح سے علیحدہ کر دیجئے۔" اس پر انہوں نے "السنن الصغریٰ" تصنیف کی اور اس کا نام "المجتبیٰ من السنن" رکھا۔ جب اہلِ حدیث کہتے ہیں: "رواہ النسائی" تو مراد اس سے "المجتبیٰ" ہوتی ہے۔ یہ کتاب ترتیب کے لحاظ سے طریقۂ امام بخاریؒ اور طریقۂ امام مسلمؒ کو جمع کرتی ہے۔ اور عللِ حدیث بھی بیان کرتی ہے۔ اس کا درجہ صحیحین کے بعد ہے۔ کیونکہ ان دو کے بعد سنن کی کتابوں میں سے ضعیف حدیثیں اس میں سب سے کم ہیں۔ بعض مصنفین نے اس کی بھی شرحیں لکھی ہیں۔

۱۔ کتبِ ستّہ میں "سنن ابن محمد بن یزید بن ماجہ القزوینیؒ" بھی شامل ہے، ابن ماجہ ۲۰۷ھ میں پیدا ہوئے، علمِ حدیث پڑھا اور اس کی تلاش میں ملکوں ملکوں میں پھرے، تاآنکہ

اصحابِ مالک اور لیث سے حدیث سُنی اور ایک خلقت نے اُن سے۔ ان کا انتقال ۲۷۳ھ میں ہُوا۔ ان کی "سنن" کی خصوصیت حسنِ ترتیب اور عدمِ تکرار ہے۔ اس سنن میں ۳۲ کتابیں اور احادیث کی تعداد چار ہزار ہے۔ باقی کتبِ صحاح کی طرح "سنن ابن ماجہ" کی بھی متعدد شرحیں لکھی گئیں۔

علاوہ کتبِ ستّہ کے درجنوں مسانید اور دیگر کتبِ حدیث تیسری صدی میں لکھی گئیں۔ چوتھی صدی میں بھی چند کتابیں "مسند صحیح" اور "مصنّف" کے نام سے لکھی گئیں، مگر تیسری صدی کے آخر کو راویانِ حدیث کے متقدمین اور متأخرین کے درمیان حدِّ فاصل سمجھنا چاہئے۔ تیسری صدی کے بعد خدمتِ حدیث، اس کی پڑتال، اس کے راویوں کی پرکھ کا کام جس نے بھی کیا، باستثنائے چند اس نے متقدمین کے اعتماد پر کیا۔ چوتھی صدی سے یہ کوشش کی گئی کہ جو مواد جمع ہو چکا تھا، اس کے تناول میں آسانیاں پیدا کی جائیں۔ سہولتِ مراجعت کیلئے حدیث کے متعدد ایسے مجموعے اکٹھے کئے گئے، جن میں اسناد کو حذف کیا گیا تھا۔ مثلاً بغوی کی "مصابیح السنہ"۔ تبریزی کی "مشکوٰۃ المصابیح" بھی ایک مشہور مجموعہ ہے۔ اسی طرح کی کتبِ حدیث میں سیوطی کی "جمع الجوامع" اور "الجامع الصغیر" شامل ہیں۔

یہاں تک تو ہم نے تاریخِ حدیث، الفاظِ حدیث کے جمع کے اعتبار سے بیان کی لیکن شیوخ محدثین رحمہم اللہ نے جس طرح ضبط متونِ حدیث کے ضبط کی طرف توجہ دی۔ اسی طرح اس کے مشکل، اور غریب، اور مُضمِرت الفاظ و کلمات کا حال بھی بیان کیا، اس کے علل، اس کے ناسخ و منسوخ کی کیفیت، اس کے رجال کا حال، ان کی وفیات، ان کے اسماء و کُنیٰ و القاب، ان اسماء کے موتلف و مختلف، متفق

ومفترق ومشتبہ، ان رُواۃ کی جرح و تعدیل، اصطلاحاتِ حدیث کی تشریح۔ یہ سب کچھ علماء کا محلِّ توجہ واعتناء بنا۔ اور بیسیوں تصانیف ان موضوعات پر مرتّب ہوئیں۔ "مقدمۂ ابن خلدون" میں ہے کہ اس عہد میں تخریج احادیث منقطع ہے۔ اس لئے کہ ائمہ کی تعداد اور اُن کے زمانے کا قرب اور ان کی کفایت و اجتہاد سے عادۃً ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سنّت کے کسی حصے سے غافل ہونے والے نہ تھے، نہ اسے اس طرح سے چھوڑنے والے تھے، کہ متأخّر ان کو پالے، یہ ان بزرگوں سے بعید تھا۔ اس عہد میں تو توجہ اس طرف ہے کہ امہّاتِ مکتوبہ کی تصیح کی جائے اور ان کے مصنفوں سے روایت کے ذریعے ان کے متون کو ضبط کیا جائے۔

علومِ حدیث کی تعداد، الحاکم ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ الحافظ المعروف بابن البیّع نیشاپوری (المتوفی ۴۰۵ھ) نے "کتاب المعرفۃ فی اصول الحدیث" میں ۵۲ دی ہے۔ ان کی تفصیل کے بیان کرنے کا یہ محل نہیں، مگر ان میں سے صرف علمِ جرح و تعدیل کے متعلق چند باتیں بیان کی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی حدیث پر عمل کرنے سے پہلے یہ ظنّ غالب ہونا ضروری ہے کہ خبر صحیح طور پر آنحضرتؐ سے مروی ہے۔ اس ظنِ غالب کو حاصل کرنے کے لئے راویانِ حدیث کا عدالت اور ضبط سے متّصف ہونا ضروری ہے۔ یہ بات وہ اعلامِ دین ہی بتا سکتے ہیں، جنہوں نے ان راویوں کے "عدل" ہونے کو پہچانا اور ان کو جرح و غفلت سے بری کیا۔ علمائے متقدمین نے راویوں کے حالات دریافت کرنے کے متعلق بے حد زحمت اٹھائی، صرف راویوں کے نام، کنیتیں، احوال ہی تحقیق نہیں کئے، بلکہ یہ بھی ڈھونڈا کہ وہ کہاں رہتے تھے، کب ہو گذرے ہیں۔ راوی اور مروی عنہ میں ملاقات ثابت ہے یا نہیں، وہ ثقہ

قابلِ اعتماد، راستی باز اور صحتِ روایت کے عادی تھے یا نہیں؛ ان پر کوئی ایسا زمانہ تو نہیں گذرا جس میں بڑھاپے یا صحت کی خرابی کی وجہ سے سوءِ حفظ پیدا ہو گیا ہو؟ یہ جرح و تعدیل تھی، اور معرفۃِ رجال کا علم، طالبِ حدیث کیلئے لازم تھا۔ شروحِ کتبِ حدیث میں رواۃ کا حال تفصیل سے دیتے ہیں، اور کتبِ رجال میں بھی یہ مواد مفصل ملتا ہے۔ اسی ذیل میں کتبِ طبقات ہیں، مثلاً "طبقاتِ ابن سعد" اور "طبقات الحفّاظ ذہبی" وغیرہما۔ اسی ذیل میں وہ کتابیں بھی شامل ہیں جو صحابہ پر لکھی گئیں، مثلاً ابن الاثیر کی "اُسد الغابہ" اور ابن حجر کی "اِصابہ"۔ وہ کتابیں جو ضعفاء پر لکھی گئیں، وہ بھی اسی علمِ رجال سے تعلّق رکھتی ہیں، مثلاً امام بخاری کی "کتاب الضعفاء" اور نسائی کی "الضعفاء والمتروکین" وغیرہما۔

جو کچھ ہم نے کہا ہے، اس کا خلاصہ حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی کی ایک عبارت میں یوں آیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"ہجرت سے سو سال تک علمِ حدیث مدوّن نہ ہوا، سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہا۔ سو سال کے بعد مدوّن ہونا شروع ہوا، اور دیگر سو سال میں درجہ بدرجہ مستحکم ہوتا رہا۔ اور تصانیف مرتّب ہوتی رہیں۔ دو سو سال کے بعد بخاری نے حدیث کا جھنڈا اٹھایا، اور اس فن میں مرجعِ عالم بنے۔ سب سے پہلے جو چیز بخاری نے سرانجام دی وہ اعلیٰ قسم کی حدیث کو اس کے غیر سے متمیز کرنا ہے، باقی محدّثوں نے ان کی پیروی کی، والفضل للمتقدم۔"

خطبات

صدرِ اسلام کے خطبے اور وصیتیں

ابتدائے عہد اسلام کے متعدد خطبے اور وصیتیں کتب حدیث و ادب میں محفوظ ہیں۔ ان میں موعظۂ حسنہ اور دینی اور اخلاقی تعلیمات تو ہیں ہی، ان کے علاوہ اسلامی تاریخ، خصوصاً تاریخِ تبلیغ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی ہے اور گو عربوں کے بیان کی فصاحت و روانی اور اُن کے کلام کی شیرینی و لطافت کا پورا مزا تو اصل عربی عبارتوں ہی سے آتا ہے جو یہاں پیش نہیں کی جا سکتیں۔ تاہم ترجمہ سے بھی ان کی عربی بلاغت کا کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔ اور بہرحال اصل چیز مطالب و معنیٰ ہے جو ترجمہ آپ کی خدمت میں پیش کرنے سے شاید قاصر نہ رہے گا

حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے خطبے

یوں تو بیسیوں چھوٹے چھوٹے متفرق جملے جو حضورؐ نے مختلف مواقع پر فرمائے ــــ اور وہ ادب اور حکمت کی جان ہیں ــــ کتبِ احادیث و ادب میں درج ہیں۔ مثلاً آپؐ نے فرمایا:-

"میں اللہ کے پاس پناہ مانگتا ہوں، اس دُعا سے، جو سُنی نہ جائے اور اُس

دل سے، جس میں خشوع نہ ہو اور اُس علم سے جو نفع نہ دے۔"

یا مثلاً آپؐ نے فرمایا:۔

"تھوڑا مال، جو کفایت کرے اُس کثیر مال سے بہتر ہے جو ایک دھندا بن جائے۔"

غرض، اس طرح کے بیسیوں جواہر پارے کتابوں میں موجود ہیں، مگر چند مسلسل خطبے بھی آپؐ سے مروی ہیں۔ جو آپ کی حیاتِ پاک کے مختلف ادوار سے تعلّق رکھتے ہیں، ان میں تبلیغ بھی ہے، وعظ و نصیحت بھی۔ بشارت بھی ہے، اور انذار بھی۔ مگر وہ ہر حال میں فصیح و بلیغ ہیں۔ مطلب واضح اور موقع و محل کے عین مناسب۔ چنانچہ مشہور عرب ادیب جاحظ آپؐ کے کلام کی نسبت "کتاب البیان" میں لکھتا ہے:۔

"آپ کا کلام ایسا ہے کہ اس کے حروف کا شمار کم اور اس کے معانی کا شمار زیادہ ہے، یہ کلام بناوٹ سے دُور اور تکلّف سے بری ہے۔ آپ فی الحقیقت ایسے ہی تھے، جیسا اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا" اے محمدؐ! کہدے کہ میں تکلّف کرنے والوں میں سے نہیں"۔ اور یہ کیوں نہ ہوتا، جب آپؐ نے خود متکلّفانہ فصاحت کو معیوب قرار دیا۔ اور بتکلّف فصاحت نمائی کرنے والوں سے آپ الگ رہے۔ آپؐ نے تفصیل کے مقام پر تفصیل برتی، اور اختصار کے مقام پر اختصار۔ غیر مستعمل وحشی، اجنبی، غریب الفاظ کو ترک کیا، معیوب اور سوقیانہ الفاظ سے پرہیز کیا۔ بولے تو میراثِ حکمت سے بولے، اور بات کی تو ایسی، جو

عصمت سے گھری ہوئی، تائیدِ الٰہی سے مضبوط اور توفیقِ ایزدی سے موفّق، اور یہ وہ کلام ہے کہ اللہ نے اسے محبوب و مقبول بنایا۔ اور ہیبت و شیرینی اور حسنِ افہام اور قلّتِ کلام کو اس میں جمع کیا، وہ تھوڑا کلام طویل خطبوں پر سبقت لے جاتا ہے اور مدّعی کو خاموش کرنے کے لئے وہی مواد استعمال کرتا ہے، جسے مدّعی جانتا ہے۔ دلیل لانے کیلئے آپ صرف سچ سے کام لیتے ہیں اور کامیابی حاصل کرنے کیلئے صرف حق کی طرف رجوع کرتے ہیں (زبان سے) فریفتہ کرنے کیلئے آپ زبان سے اعانت طلب نہیں کرتے نہ مکر و فریب سے کام لیتے ہیں، نہ آنکھ سے اشارہ کرتے ہیں، نہ بہت آہستگی سے کام لیتے ہیں، نہ تیزی سے، نہ کلام کو ضرورت سے زیادہ طول دیتے ہیں نہ اس کو ضرورت سے کم کرتے ہیں۔ لوگوں نے ہرگز ایسا کلام نہیں سنا جس کا نفع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کثیراً کے کلام سے عام تر، جس کا توازن اس سے بہتر، جس کا مذہب اس سے زیادہ جمیل، جس کا مقصد اس سے زیادہ بلند، جس کا موقع اس سے حسین تر، جس کا مخرج اس سے آسان تر، جس کے معنیٰ اس سے فصیح تر اور جس کا مطلب اس سے واضح تر ہو۔"

اب آئیے، آپؐ کے بعض خطبے آپ کو سنائیں:۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تبلیغی خطبوں میں پہلا خطبہ، جس میں آپؐ نے اپنی قوم کو اسلام کی طرف دعوت دی یہ ہے:۔

آپؐ نے حمد و ثنا کے بعد ایک مثل کہی کہ: ان الرّائد لایکذب اھلہ" "پانی اور گھاس چارے کا ڈھونڈنے والا اپنے اہل سے جھوٹ نہیں بولتا۔" یعنی وہ شخص،

جیسے اُن کے گھر کے لوگ پانی اور چارے کی تلاش میں بھیجتے ہیں، وہ واپس آکر اپنے گھر کے لوگوں کو جھوٹی اطلاع نہیں دیتا۔ پھر فرمایا:۔ بخدا، اگر بفرض میں سارے جہان سے غلط بات کہتا، تب بھی میں تم سے غلط نہ کہتا۔ اور اگر بفرض میں سب کو دھوکا دیتا، تب بھی تمہیں دھوکا نہ دیتا۔ قسم اُس خدا کی، جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں، میں خدا کا رسُول ہوں، جو تمہاری طرف خصوصاً اور سب لوگوں کی طرف عموماً بھیجا گیا ہوں، واللہ تمہیں موت اسی طرح سے آئے گی جس طرح سے نیند آ لیتی ہے، اور تمہیں مرنے کے بعد اُسی طرح سے زندہ کیا جائے گا جس طرح سے تم سونے کے بعد جاگتے ہو اور تمہارے اعمال کا حساب ہو گا۔ نیکی کے بدلے تمہیں نیک جزا ملے گی اور بُرائی کے عوض بُرا بدلہ ملے گا۔ پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جنت ہو گی، یا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دوزخ "۔

(۲)

۱۰ رمضان ۸ھ کو آپؐ دس ہزار کی فوج لے کر مکّے کی طرف بڑھے، ہر مزاحمت دُور کر دی گئی اور مسلمان مکّے کے مختلف دروازوں سے شہر میں داخل ہوئے۔ حضورؐ بابِ کعبہ پر کھڑے ہوئے اور فرمایا:۔ " لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ۔" سوا اللہ کے اور کوئی معبود نہیں (وہ) یکتا ہے، اس کا کوئی ساجھی نہیں، اس نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا، اپنے بندے کی مدد کی اور اس نے خود تنہا لشکروں کو شکست دی۔ آگاہ رہو! کہ سب مکرمت، خون اور مال، جس کا دعویٰ کیا جائے وہ میرے ان دو قدموں کے نیچے ہے۔ سوا سدانت یعنی خانہ کعبہ کی خدمت اور سقایت یعنی حاجیوں کی آب خورانی کے، آگاہ رہو کہ کوڑے، یا عصا سے خطاً قتل کرنا، ایسے ہی ہے، جیسے عمداً قتل کرنا؛ دونوں کے لئے دیتِ مغلظہ دینا ہوگی۔

جس میں چالیس حاملہ اونٹنیاں شامل ہوں گی۔ جن کے پیٹ میں ان کی اولاد ہو،
اے معشر قریش! اللہ نے جاہلیّت کی نخوت تم سے دُور کردی، وہ تکبّر بھی دُھلا
کر دیا جو جاہلیت میں باپ دادا کی وجہ سے کیا جاتا تھا۔ سب آدمی آدم کی اولاد
ہیں، اور آدم مٹّی سے پیدا کیا گیا تھا۔" ــــ پھر آپؐ نے یہ آیت شریفہ پڑھی:۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَّ أُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا
وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ أَتْقَاكُمْ ط

ترجمہ:۔"لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد (آدم) اور ایک عورت (حوّا) سے پیدا
کیا، اور پھر تمہاری ذاتیں اور برادریاں ٹھہرائیں، تاکہ ایک دُوسرے کو شناخت کر
سکو (ورنہ) اللہ کے نزدیک تم میں بڑا شریف وہی ہے جو تم میں زیادہ پرہیزگار ہے"

اے معشرِ قریش! تم کیا خیال کرتے ہو کہ میں تم سے کیا سلوک کرنے کو ہوں؟" ــــ
ــ وہ بولے:۔" اچھا سلوک، آپ صاحب کرم بھائی ہیں، اور صاحب کرم بھائی
کے بیٹے" ــــ آپؐ نے فرمایا: "جاؤ، تم آزاد ہو!"

ــــــــــ (۳) ــــــــــ

آپؐ کا ایک اور خطبہ "صبح الاعشیٰ[۱]" (جلد ۱ ص ۲۱۳، مطبع دار الکتب المصریہ
بالقاہرہ ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۲ء) میں درج ہے، وہ یہ ہے:۔

" لوگو! گویا موت دُنیا میں ہمارے لئے لازم نہیں، اَوروں کے لئے ہے اور
دُنیا میں حق ہم پر واجب نہیں، اَوروں پر ہے۔ اور وہ مُردے، جن کے ساتھ جاکر
ہم انہیں وداع کرتے ہیں، گویا مسافر ہیں کہ تھوڑی مدّت کے بعد ہمارے پاس
لوٹ آئیں گے، ہم انہیں قبروں میں لٹاتے ہیں اور ان کا ورثہ کھاتے ہیں، گویا ہم

اُن کے بعد ہمیشہ یہیں رہیں گے۔ اور ہر قسم کی ہلاکت سے امن میں ہوں گے؟

خوشحال ہے وہ شخص، جسے اس کے اپنے عیب لوگوں کی عیب چینی سے ہٹائے رکھیں، خوشحال ہے وہ، جس نے ایسا مال صرف کیا، جو اس نے گناہ کے بغیر کمایا، جو اہلِ فقہ و حکمت کی صحبت میں بیٹھا، اور جو خواری والوں اور فقر و حاجت والوں سے ملا جُلا۔ خوشحال ہے وہ، جس کی طبیعت پاک اور نیک ہے، اور جس کا باطن پاکیزہ ہے، اور جو اپنے شرّ کو لوگوں سے دُور رکھتا ہے، اور اپنے فالتُو مال کو صرف کرتا ہے، اور اپنے فالتُو کلام کو روکے رکھتا ہے جسے سُنّت نے گھیرے رکھا اور جسے بدعت نے مدہوش نہ کر دیا۔"

(۴)

ایک اَور مرتبہ آپؐ نے فرمایا:۔

"آگاہ رہو اے لوگو! گناہوں سے باز آؤ، اس سے پیشتر کہ موت تمہیں آلے اور نیک عملوں کی طرف سبقت کرو، قبل اس کے کہ تمہاری فرصت ختم ہو جائے۔ اپنے ربّ سے، جو تمہارا مُعبد ہے۔ اسے اللہ کا ذکر بکثرت کرنے سے، اور پوشیدہ اور کھُلے بندوں صدقہ دینے سے رفع کرو، تمہیں رزق ملے گا، اجر ملے گا، نُصرت ملیگی، اور جان لو کہ اللہ عزّ و جلّ نے تم پر، میرے اس مقام میں، میرے اس سال میں، میرے اس مہینے میں، میری زندگی میں، اور میرے بعد قیامت تک جُمعہ فرض کر دیا۔ جس نے امام کے ہوتے ہوئے جُمعے کو ترک کیا۔ اس کی پراگندگی کو خدا نہ جمع کرے! اور اس کے کام میں برکت نہ دے! آگاہ رہو کہ اس کا حج نامنظور ہے، آگاہ رہو، کہ اس کا روزہ نامنظور ہے، آگاہ رہو کہ اس کا صدقہ نامنظور ہے، آگاہ رہو کہ اس کی نکوئی

نامنظور ہے (آگاہ رہو کہ بدوی مہاجر کا امام نہیں بن سکتا، آگاہ رہو کہ فاجر مؤمن کا امام نہیں بن سکتا) اس کے سوا کہ اسے سلطان مغلوب کرے، جس کی تلوار، یا جس کے کوڑے کا اُسے ڈر ہو۔"

(۵)

ایک خطبے میں آپؐ نے فرمایا :-

"سب تعریف اللہ کو ہے، میں اس کی تعریف کرتا ہوں اور اس سے مدد مانگتا ہوں۔ ہم اپنے نفسوں کی شرارتوں اور عملوں کی بُرائیوں سے اللہ کے پاس پناہ مانگتے ہیں۔ اللہ جسے ہدایت دے اسے گمراہ کرنے والا کوئی نہیں، اور جسے وہ گمراہ کرے، اسے ہدایت دینے والا کوئی نہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ سوا اللہ کے اور کوئی معبود نہیں، یکتا، جس کا کوئی ساجھی نہیں۔ بلاشبہ بہترین کلام اللہ کی کتاب ہے۔ وہ شخص نیکی میں ثابت قدم رہا جس کے دل کو اللہ نے یہ کتاب بھلی کر دکھائی اور جسے اس نے کفر کے بعد اسلام میں داخل کیا۔ اور جس نے کتاب اللہ کو لوگوں کی باتوں پر ترجیح دی اور اسے پسند کر لیا۔ اس لئے کہ یہ نہایت سچی بات ہے، تمام بامراد، اللہ سے پیار کرنے والوں سے محبّت کرو۔ اللہ کے کلام اور اس کے ذکر سے نہ اکتاؤ۔ اور اس پر دلوں کو سخت نہ کرو۔ اللہ کی عبادت کرو، اور کسی کو اس کا ساجھی قرار نہ دو۔ اللہ سے ڈرو، جس طرح کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ اور جو نیک عمل تم کرو، اپنی باتوں سے بھی اسے سچّا ثابت کرو۔ اور ایک دوسرے سے ذاتِ الٰہی کے واسطے محبّت کرو۔ تم پر سلامتی اور اللہ کی رحمت ہو۔"

— (۶) —

ایک اور خطبے میں جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

"لوگو! تمہارے لئے نشاناتِ راہ (یعنی حدودِ شریعت) ہیں، پس اپنے نشاناتِ راہ پر ٹھہر جاؤ (ان سے تجاوز نہ کرو) اور یہ تمہارے لئے انتہا ہے۔ اس انتہا پر رک جاؤ، اس لئے کہ بندہ دو خوفوں کے درمیان ہے۔ ایک تو وہ مہلت جو گذر چکی، بندہ نہیں جانتا کہ اللہ اس کے بارے میں کیا کرے گا، اور ایک وہ مہلت جو باقی ہے، بندہ نہیں جانتا کہ اللہ اس کے متعلق کیا حکم فرمائے گا۔ پس بندے کو لازم ہے کہ خود اپنے نفس کے فائدے کے لئے اپنے نفس سے حصّہ لے اور اپنی آخرت کے فائدے کے لئے اپنی دُنیا سے حصّہ لے اور بڑھاپے کے آنے سے پہلے جوانی سے کام لے اور موت کے آنے سے پہلے زندگی سے کام لے۔ قسم اُس خدا کی، جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے، موت کے بعد اللہ کی رضا جوئی کا کوئی موقع و محل نہیں، اور دُنیا کے بعد جنّت و دوزخ کے علاوہ اور کوئی گھر نہیں۔"

— (۷) —

آنحضرتؐ مکّے سے مدینے کو ہجرت فرمانے کے بعد جب مدینے پہنچے تو آپؐ نے خطبہ دیا جو ابنِ ہشام کی سیرتِ رسول اللہؐ میں درج ہے۔ ابتداء میں آپؐ نے اللہ کی حمد و ثنا ان الفاظ میں کی، جن کا وہ اہل ہے۔ پھر فرمایا:۔

"لوگو! اپنے لئے بھلائی کو ذخیرۂ عاقبت بنا کر آگے بھیجو۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے، کہ تم میں سے ایک پر بجلی گرے گی، تب وہ اپنے گلّے کو ایسی حالت میں چھوڑے گا کہ اس کا کوئی رکھوالا نہ ہوگا۔ تب اس کا ربّ بغیر ترجمان اور بغیر حاجب

کے توسط کے اس سے کہے گا :۔ کیا میرا رسول تیرے پاس نہیں پہنچا تھا؟ اس نے تجھے تبلیغ نہیں کی تھی؟ میں نے تمہیں مال دیا اور تمہارے ساتھ نیکی کی، تو تم نے کونسی بھلائی ذخیرۂ آخرت بنا کر آگے بھیجی؟ وہ شخص دائیں بائیں دیکھے گا، اور کوئی چیز موجود نہ پائے گا۔ پھر آگے دیکھے گا اور سوا جہنم کے کچھ نہ پائے گا، سو جس کے امکان میں ہے کہ اپنے مُنہ کو آگ سے بچائے وہ ضرور بچائے۔ گو وہ آدھا چھوہارا ہی دینے سے ہو۔ اور جسے یہ بھی میسّر نہ آئے تو اچھی بات ہی سے سہی، اس لئے کہ وہاں ایک نیکی کے بدلے دس گُنے سے سات سو گُنے تک بدلہ ملیگا، والسّلام علیکم و علیٰ رسول اللہ و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔

(۸)

پہلا خطبہ جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے پہلے جُمعے کو مدینے شریف میں دیا، وہ "تاریخ طبری" میں محفوظ ہے، اس کا ترجمہ یہ ہے:۔

"سب تعریف اللہ کیلئے ہے، میں اس کی تعریف کرتا ہوں، اُس سے مدد مانگتا ہوں، اس سے معافی چاہتا ہوں۔ اس سے راہِ ہدایت طلب کرتا ہوں، اس پر ایمان لاتا ہوں، حق ناشناسی نہیں کرتا بلکہ جو حق ناشناسی کرے، اسے دُشمن رکھتا ہوں اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد اس کا بندہ اور رسُول ہے، جسے اُس نے ہدایت، نُور اور نصیحت کے ساتھ ایسے زمانے میں بھیجا جبکہ رسُولوں کا آنا مدّتوں تک بند رہ چکا تھا۔ علم کم ہو گیا، لوگ گمراہ ہو گئے، زمانہ منقطع ہو گیا۔ قیامت قریب آگئی اور وقتِ مقررہ قریب آلگا۔ جس نے اللہ اور اس کے رسُول کی اطاعت کی، وہ ٹھیک راستے پر چلا۔ اور جس نے اللہ اور اس کے رسُولؐ کی نافرمانی کی وہ گمراہ ہوا۔ اُس نے

تقصیر کی اور راہِ راست سے بڑی دُور بھٹک گیا۔ میں تمہیں اللہ کے عقاب سے ڈرانے کی وصیّت کرتا ہوں، اس لئے کہ ایک مُسلم دُوسرے مُسلم کو بہترین وصیّت یہی کر سکتا ہے، کہ اسے آخرت کیلئے آمادہ کرے اور اسے اللہ کے عقاب سے ڈرانے کا حکم دے، پس اللہ نے اپنے عزّ و جلال سے تمہیں ڈرایا ہے لہٰذا اس سے ڈرو۔ اس سے افضل کوئی خیر خواہی نہیں، نہ اس سے بہتر کوئی ذکر ہے .... جو شخص اللہ اور اپنے درمیان کے معاملے کے ظاہر و باطن میں اصلاح کرے گا اور اس سے سوائے وجہ اللہ کے اور کسی بات کو پیشِ نظر نہ رکھے گا تو زندگی میں اسے نامِ نیک حاصل ہو گا اور زمانۂ بعد موت میں یہ بات اس کے لئے ذخیرہ بنے گی۔ اس وقت، جب آدمی ہر اُس چیز کا محتاج ہو گا۔ جسے وہ (ذخیرۂ عاقبت بنا کر) آگے بھیجتا ہے اور اس کے علاوہ ہر چیز کی نسبت وہ آرزو کرے گا، کہ کاش اس کے اور اس چیز کے درمیان زمانہ دراز (حائل) ہوتا اور اللہ تمہیں اپنے (جلال) سے ڈراتا ہے اور اللہ (اپنے) بندوں پر حد درجے کی شفقت (بھی) رکھتا ہے (وہ اللہ) جس نے اپنا قول سچ کر دکھایا اور جس نے اپنا وعدہ پورا کیا وہ (آئندہ بھی) اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرے گا۔ اس لئے کہ وہ عزّ و جلّ فرماتا ہے: ہمارے ہاں (جو ایک) بات قرار پا چکتی ہے پھر) نہیں بدلی جایا کرتی، اور ہم تو بندوں پر ذرّہ بھر ظلم نہیں کرتے، پس اللہ سے ڈرو، اس جہان کے معاملے کے متعلق اور اُس جہان کے معاملے کے متعلق، ظاہر میں، اور باطن میں، اس لئے کہ جو اللہ سے ڈرتا ہے۔ اللہ اس کے گناہ (اس) سے دُور کر دے گا، اور اسے اجرِ عظیم دے گا اور جو اللہ سے ڈرا اُس نے بڑی کامیابی حاصل کی۔ اللہ کا ڈر، اس کی بیزاری سے بچاتا ہے، اس

کے عتاب سے بچاتا ہے، اس کے خشم سے بچاتا ہے۔ اور اللہ کا ڈر سرخروئی کا موجب بنتا ہے۔ خوشنودیِ خدا اس سے حاصل ہوتی ہے اور درجہ بلند ہوتا ہے۔ اپنا حصّہ لو اور جو اللہ کا حق ہے اس میں تقصیر نہ کرو، اس نے تمہیں اپنی کتاب سکھائی، تمہارے لئے اپنے راستے کو راہِ روشن و کشادہ بنایا، تاکہ سچّے اسے جان لیں۔ پس نکوئی کرو، جس طرح کہ اللہ نے تم سے نکوئی کی۔ اور اس کے دُشمنوں سے دُشمنی کرو، اور اللہ (کی راہ) میں کوشش کرو، جیسا کہ اس کی راہ میں کوشش کرنے کا حق ہے۔ اس نے تمہیں (دُنیا کے لوگوں میں سے) انتخاب فرمایا، اسی (خدا) نے (اگلی کتابوں میں) پہلے تمہارا نام مُسلم رکھا (یعنی فرمانبردار بندے) تاکہ جو شخص ہلاک ہونے والا ہے، وہ حجّت تمام ہونے کے بعد ہلاک ہو، اور جو زندہ رہنے والا ہے وہ بھی حجّت تمام ہونے کے بعد زندہ رہے۔ خدا کی مدد کے بغیر (کسی میں) کچھ بھی طاقت نہیں، پس اللہ کا ذکر کثرت سے کرو، اور آج سے بعد آنے والے وقت کے لئے عمل کرو۔ اِس لئے کہ جس نے اپنے اور اللہ کے درمیان کا معاملہ درست کر لیا، اللہ اس کے اور لوگوں کے درمیان کے معاملے کو خود درست کرے گا، یہ اس لئے کہ اللہ کا حکم لوگوں پر چلتا ہے اور لوگوں کا حکم اللہ پر نہیں چلتا، وہ لوگوں کا مالک ہے اور لوگ اس کے مالک نہیں ہیں، اللہ اکبر ولاحول ولا قوۃ الّا باللہ العلیّ العظیم۔"

(۹)

خَیفِ مِنیٰ مکّہ شریف سے چند میل کے فاصلے پر ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے وہاں ایک مرتبہ لوگوں کو مخاطب کیا اور فرمایا:۔

"تروتازہ رکھے خدا اس بندے کو، جس نے میری بات کو سُنا اور اسے یاد رکھا،

پھر اُسے اُس تک پہنچایا، جس نے اُسے نہ سُنا تھا۔ علم شریعت کے بہت سے حامل ایسے ہیں کہ خود اُسے نہیں سمجھتے اور بہت سے علم شریعت کے حامل ایسے ہیں جو علم کو اپنے سے زیادہ جاننے والے تک پہنچاتے ہیں۔ تین باتیں ہیں جن سے متمسک ہو کر مؤمن کا دِل خیانت، دھوکے اور شر سے پاک ہو جاتا ہے (اوّل) عمل کا خالصۃً لِلّٰہ کرنا (دُوسرے) جو لوگ برسرِ حکومت ہیں، ان کی خیر خواہی کرنا (تیسرے) جماعت سے وابستہ رہنا۔ بے شک جماعت کی دُعا، مؤمن کو گھیرے رہتی ہے۔ اور اس کی حفاظت کرتی ہے۔ جس کا مقصود آخرت ہو اس کی پریشانی کو اللہ جمعیّت میں بدل دیتا ہے۔ اس کے دل کو غنی کر دیتا ہے۔ دُنیا اس کی طرف حقیر و خوار ہو کر آتی ہے اور جس کا مقصود دنیا ہو، اللہ اس کے امر کو بکھیر دیتا ہے۔ اس کے فقر کو اُس کی آنکھوں کے سامنے رکھتا ہے، مگر دُنیا میں سے اتنی ہی ملتی ہے جتنی اس کے لئے لکھی گئی ہے۔

(۱۰)

حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ نبی علیہ السّلام نے اپنے ایک خطبے میں فرمایا:-

"لوگو! اللہ نے اپنی کتاب محکم میں، جو کچھ حلال ہے اور جو کچھ حرام ہے وہ تم پر واضح کر دیا، اب تم اس کے حلال کو حلال سمجھو اور اس کے حرام کو حرام جانو۔ کتاب میں جو کچھ متشابہ ہے۔ اس پر ایمان لاؤ، جو کچھ محکم ہے اس پر عمل کرو اور جو امثال اس میں بیان ہوئی ہیں، ان سے عبرت حاصل کرو۔"

اب ہم آپ کو اس سلسلے میں رسولؐ اللہ کے اس خطبے کا ترجمہ سُناتے ہیں، جو آپؐ نے حجّۃ الوداع میں دیا۔ یہ ۱۰ھ کی بات ہے۔ ہزاروں مسلمان مدینۂ منورہ وغیرہ سے آپؐ کے ہمراہ حج کیلئے آئے۔ ۵ ذی الحجہ کو مکّۂ شریف میں داخل ہوئے، اور

۸ ذی الحجہ کو آپؐ نے وہ بلیغ اور اہم تاریخی خطبہ دیا، جس میں اگرچہ زیادہ تر احکام ہی بیان ہوئے ہیں۔ لیکن اس سے دلوں پر گہرا اثر پڑا، اس لئے کہ اُس میں آپ نے اس امر کی طرف اشارہ کیا تھا کہ شاید اس سال کے بعد، اس جگہ اور اس مہینے میں آپؐ پھر کبھی تشریف نہ لاسکیں۔ یعنی آپ کی عمر مبارک اب قریب الختم تھی۔ آپؐ نے فرمایا:۔

(۱۱)

"سب تعریف اللہ کے واسطے ہے، ہم اسی کی حمد بجالاتے، اللہ ہی سے مدد مانگتے، پچھلے گناہوں کی معافی چاہتے اور آئندہ کے لئے اسی کی جناب میں توبہ کرتے ہیں۔ اپنے نفسوں کی شرارتوں اور اپنے بُرے عملوں سے اللہ کے پاس پناہ مانگتے ہیں۔ جسے اللہ ہدایت دیتا ہے اُسے گمراہ کرنے والا کوئی نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں یگانہ، جس کا کوئی ساجھی نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اس کا بندہ اور رسُول ہے۔ میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ اللہ سے ڈرو، تمہیں اس کی اطاعت پر ابھارتا ہوں اور اس سے نصرت طلب کرتا ہوں جو خیر (محض) ہے۔ حمد و ثنا کے بعد، اے لوگو! میری بات سنو، جو میں تمہیں کھول کر بتاتا ہوں، اس لئے کہ مجھے معلوم نہیں کہ اس سال کے بعد، اس مقام پر، میں تم سے مل سکوں، یا نہ مل سکوں۔ اے لوگو! تمہارے خون اور تمہارے مال اب سے اس وقت تک، جب تم اپنے پروردگار سے ملاقات کروگے اسی طرح حرام ہیں، جس طرح تمہارے اس دن کی اس مہینے میں، اس مقام پر حُرمت ہے۔

لوگو! میں نے تمہیں یہ بات پہنچا دی ہے! اے اللہ گواہ رہیو! جس کے پاس کوئی امانت ہو وہ اُسے، جس نے یہ امانت اُس کے پاس رکھی ہے، واپس دے اور

جاہلیت کا "ربا" یعنی سود موقوف ہے، پہلا سود، جس سے میں شروع کرتا ہوں، میرے چچا عباس بن عبد المطلب کا سود ہے۔ اور یہ کہ جاہلیت کے خون موقوف ہیں۔ پہلا خون جس سے ہم شروع کرتے ہیں عامر بن ربیعہ بن الحرث بن عبد المطلب کا خون ہے۔"

حضورؐ نے جس واقعے کی طرف اشارہ کیا، وہ یہ تھا کہ: عامر کو دودھ پلانے کے لئے بنو لیث کے سپرد کیا گیا تھا، بنو ہذیل نے اسے قتل کر دیا۔

پھر آپؐ نے فرمایا:-

"جاہلیت کی موروثی بزرگواریاں موقوف ہیں، البتہ سدانہ یعنی خدمت کعبہ، اور سقایہ یعنی حاجیوں کی آب خورانی، اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اور قتل عمد موجب قصاص ہے، لاٹھی اور پتھر سے قتل کرنا ارادۃً قتل کرنے کے مشابہ ہے۔ اس کے عوض میں سو اونٹ دینے ہوں گے، جو اس تعداد کو بڑھائے وہ اہل جاہلیت میں سے ہے۔ لوگو! شیطان اس سے تو مایوس ہو گیا ہے کہ اس کی پوجا تمہاری اس سرزمین میں ہوگی، لیکن وہ اس پر راضی ہے کہ اس کی پوجا کے ماسوا اپنے جن اعمال (بد) کو تم حقیر سمجھتے ہو، ان کے بارے میں اس کی اطاعت کی جائے۔"

اس کے بعد آپ نے "نسئی" کے متعلق بعض باتیں بیان فرمائیں۔ جاہلیت کے زمانے میں عرب سال کے چار مہینوں میں جنگ و جدال کو حرام سمجھتے تھے۔ مگر ان چار مہینوں کی گنتی ان کے نزدیک اہم تھی۔ خاص مہینوں کی خصوصیت نہ تھی۔ مثلاً اگر محرم میں وہ لڑائی میں مصروف ہوتے تھے تو وہ حج کے موقع پر اعلان کر کے محرم کو ماہِ حلال اور ربیع الاول کو ماہِ حرام قرار دے دیتے تھے۔ اس طرح سے سال کے مختلف مہینوں میں تحریم چکر لگاتی رہتی تھی۔ اور اگر وہ مناسب سمجھتے تو سال کے تیرہ یا چودہ مہینے بھی کر لیتے تھے

اِس بارے میں اپنے خطبے میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے فرمایا :۔

" مہینوں کا سرکا دینا بھی ایک کفر مزید ہے۔ جس کی وجہ سے کافر (دین کے راستے کو) گُم کرتے رہتے ہیں۔ ایک برس ایک مہینے کو حلال سمجھ لیتے ہیں اور اسی کو دُوسرے برس میں حرام۔ (ان کی غرض) یہ ہے کہ اللہ نے جو چار مہینے حرام کیے ہیں (اپنی گنتی سے) اس گنتی کو مطابق کر کے اللہ کے حرام کیے ہوئے (مہینوں) کو حلال کر لیں۔"

قدرتی طور پر عہدِ جاہلیت میں مہینوں کے سرکانے کی وجہ سے حج کا وقت بھی بدل جاتا تھا۔ چنانچہ ۹ھ میں جب حضرت ابوبکرؓ امیر حج تھے تو حج ذی قعدہ میں پڑا۔ اور حجۃ الوداع ذی الحجّہ میں۔ یعنی اُس مہینے میں، جس میں حضرت ابراہیمؑ اور دُوسرے انبیاء علیہم السّلام کے زمانوں میں حج ہوا کرتا تھا۔ اس لیے حضورؐ نے اسی خطبہ میں فرمایا :۔

" زمانہ چکّر کھا کر اس طرح ہو گیا ہے، جس طرح وہ اس وقت تھا جب اللہ نے آسمان و زمین پیدا کیا تھا۔ اور جس دن خدا نے آسمان و زمین پیدا کیے (تبھی سے) خدا کے یہاں مہینوں کی گنتی کتاب اللہ (یعنی لوحِ محفوظ) میں بارہ مہینے لکھی چلی آتی ہے، ان میں سے چار مہینے ادب کے ہیں۔ تین متواتر اور ایک علیحدہ۔ ذوالقعدہ، ذوالحجّہ، محرّم اور رجب، جو جمادی اور شعبان کے درمیان ہے۔ سُنو! کیا میں نے یہ بات تمہیں پہنچا دی ہے؟ اے اللہ، گواہ رہیو!"

پھر آنحضرتؐ نے ان حقوق کا ذکر فرمایا جو عورتوں اور مردوں کو ایک دُوسرے پر حاصل ہیں اور اس سلسلے میں فرمایا :۔

" تم نے انہیں صرف اللہ کی امانت سمجھ کر بیوی بنایا ہے اور خدا کے کلام سے انہیں اپنے آپ پر حلال کیا ہے۔ اِس لیے عورتوں کے بارے میں خدا سے ڈرو، اور

ان کے متعلق نیک وصیّت قبول کرو۔ سنو! کیا یہ بات میں نے تمہیں پہنچا دی ہے؟ اے اللہ گواہ رہیو! ـــــ لوگو! مؤمن ایک دُوسرے کے بھائی ہیں۔ کسی شخص کے لئے اس کے بھائی کا مال حلال نہیں ہے۔ سوا اس صُورت کے کہ وہ بھائی خوشی سے کوئی مال اُسے دے دے۔ سُنو! کیا یہ بات میں نے تمہیں پہنچا دی ہے؟ اے اللہ! گواہ رہیو! ـــــ میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ ایک' دُوسرے کی گردن مارے' اس لئے کہ میں نے تمہارے درمیان وہ چیز چھوڑی ہے کہ اگر تم اس سے متمسّک رہے تو میرے بعد گمراہ نہ ہوگے۔ یعنی اللہ کی کتاب! سُنو! کیا یہ بات میں نے تمہیں پہنچا دی ہے؟ اے اللہ گواہ رہیو!"

"اے لوگو! تمہارا رب ایک ہے' اور تمہارا باپ ایک ہے۔ تم سب آدمؑ کی اولاد ہو' اور آدم مٹی سے تھے۔ خدا کے نزدیک تم میں سے شریف ترین وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔ ایک عربی کو ایک عجمی پر سوا التقویٰ کے اَور کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ سُنو! کیا یہ بات میں نے تمہیں پہنچا دی ہے؟ ـــ اے اللہ گواہ رہیو" لوگوں نے کہا" آپ نے پہنچا دی ہے" ـــــ آپؐ نے فرمایا: "جو یہاں موجُود ہے' وہ یہ بات اُسے پہنچا دے' جو یہاں موجود نہیں ہے"۔

"اے لوگو! اللہ نے ہر وارث کیلئے میراث میں اس کا حصّہ مقرر کیا ہے ـــ وارث کیلئے وصیّت جائز نہیں' نہ تہائی سے زیادہ کے متعلق وصیّت جائز ہے"۔

اس کے بعد جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے چند اَور مسائل بیان فرما کر "والسّلام علیکم ورحمۃ اللہ" کہہ کر یہ عظیم الشان خطبہ ختم کیا۔

(۱۲)

اس حج سے واپسی کے کچھ عرصہ بعد آنحضرتؐ کی طبیعت ناساز ہوگئی۔ چنانچہ فضل بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ میرے ہاں تشریف لائے۔ میں باہر نکلا تو معلوم ہوا کہ آپؐ کو بخار ہے اور آپؐ کے سر میں پٹی بندھی ہوئی ہے۔ مجھ سے فرمایا "اے فضل! میرا ہاتھ پکڑو"۔ میں نے آپؐ کا ہاتھ پکڑا اور آپؐ منبر پر بیٹھ گئے۔ پھر فرمایا "لوگوں کو خبر کرو"۔ لوگ اکھٹے ہوگئے تو فرمایا:-

"حمد و ثنا کے بعد اے لوگو! میں تمہیں اللہ کی حمد سناتا ہوں، جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ تم سے میرے رخصت ہونے کا وقت قریب آگیا ہے۔ اگر میں نے کسی کی پیٹھ پہ کوڑا لگایا ہے تو یہ ہے میری پیٹھ' وہ اپنا قصاص لے۔ اگر میں نے گالی سے کسی کے حسب و شرف پہ حملہ کیا ہے تو میرا حسب و شرف موجود ہے' وہ اس سے بدلہ لے۔ اگر میں نے کسی کا مال لیا ہے تو میرا مال موجود ہے' وہ اس میں سے لے لے۔ اور میری طرف سے دشمنی کا خوف نہ رکھے کہ یہ میرا طریق نہیں ہے۔ آگاہ رہو کہ تم میں سے میرا محبوب ترین وہ شخص ہے جو مجھ سے اپنا حق لے۔ اگر یہ حق واجب ہے۔ یا وہ میرے لئے اسے حلال کردے، تاکہ میں اپنے ربّ سے خوشدلی کے ساتھ ملاقات کروں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ مفید نہ ہوگا، جب تک میں بار بار تمہارے درمیان اس اعلان کے لئے کھڑا نہ ہوں گا۔"

پھر آپؐ نے منبر سے اتر کر ظہر پڑھی۔ پھر واپس آکر منبر پر بیٹھے اور پہلی بات دہرائی۔ اس پہ ایک آدمی نے تین درہم کا دعویٰ کیا۔ آپؐ نے اسے ان کا عوض عطا کیا۔ پھر فرمایا:-

"لوگو! جس کے ذمّے کچھ چیز نکلتی ہو وہ ادا کرے اور یہ نہ کہے:" اس میں دُنیا کی رُسوائی ہے"۔ آگاہ رہو کہ دُنیا کی رُسوائی عاقبت کی رُسوائی سے آسان تر ہے"۔

پھر آپؐ نے اصحابِ اُحد کے لئے رحمت چاہی اور ان کے لئے دُعائے مغفرت پڑھی۔ پھر فرمایا:۔

"ایک بندے کو اللہ نے اختیار دیا کہ دُنیا لے، یا جو کچھ اس کے پاس ہے وہ لے۔ بندے نے وہ اختیار کیا جو اللہ کے پاس ہے۔"

اس پر ابوبکر صدیقؓ رو دیئے اور کہا" آپؐ پر ہماری جانیں اور ہمارے آباؤ اجداد قربان۔

یہ خطبہ آنحضرتؐ کی زندگی کا آخری خطبہ تھا۔

صدیقِ اکبرؓ کے خُطبے!

آپ نے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے خطبوں کا ترجمہ سُنا، اب ہم آپ کو حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے چند خطبوں کا ترجمہ سناتے ہیں۔

جب یکم ربیع الاوّل ۱۱ھ کو آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی روحِ پاک عالمِ قدس کو سدھاری تو جناب صدیق حجرۂ مبارک میں آئے۔ نبیؐ کو کپڑے سے ڈھک دیا گیا تھا۔ آپ نے حضورؐ کے رُوئے مطہر سے کپڑا ہٹایا اور کہا:

"میرا باپ اور میری ماں آپ پر قربان، آپ زندگی میں بھی پاک تھے اور موت میں بھی پاک ہیں۔ آپ کی موت سے نبوّت اس طرح سے منقطع ہو گئی۔ جس طرح نبیوں میں

سے کسی نبی کی موت سے نہ ہوئی تھی۔ آپ وصف و بیان سے بالاتر ہیں اور اس سے جلیل تر کہ آپ پر رو کر دل کی بھڑاس نکالی جا سکے۔ گو (مناقبِ نبوّت سے) آپ نے خصوصیّت پائی، تاہم (موت سے مفر نہ تھا) اس سے آپ اَوروں کی تسلی کا موجب بنے، آپ کی جدائی کی مصیبت نے سب کو گھیر لیا اور آپ کے غم میں آپ کے اقربا اور ہم سب برابر ہو گئے۔ اگر آپ نے خود موت کو اختیار نہ کیا ہوتا تو آپ کی موت کی وجہ سے ہم اپنی جانیں قربان کر دیتے۔ اور اگر آپ نے عود رونے سے منع نہ کیا ہوتا تو ہم آنسو بہانے والی رگوں کا پانی (رو رو کر) ختم کر دیتے۔ تاہم جس چیز کو ہم دُور نہیں کر سکتے وہ اندوہِ نہانی ہے۔ اور جانکاہ صدمۂ جُدائی۔ اس نے ہمیں گھیر لیا ہے۔ یہ ہمیں ترک نہیں کرتا۔ اے اللہ! آپؐ کو ہمارا اسلام پہنچا دیو! اور اے محمدؐ! اپنے ربّ کے پاس ہمیں بھی یاد رکھیو۔ جو تسکین آپؐ نے پیچھے چھوڑی، وہ نہ ہوتی تو جو وحشت آپ کے بعد یہاں موجود ہے۔ ہم اس کا مقابلہ نہ کر سکتے۔ اے اللہ! اپنے نبی کو ہمارا پیغام پہنچا دیجیو اور آپؐ کو ہمارے درمیان محفوظ رکھیو!"

اس والہانہ خطاب کے بعد آپ حجرۂ مبارک کے باہر آئے۔ صحابہ کو یقین نہ آتا تھا کہ حضورؐ نے دُنیا کو الوداع کہا ہے۔ خصوصاً حضرت عمرؓ اس حد تک بیتاب تھے کہ انھوں نے تلوار کھینچ لی اور کہا کہ اگر کوئی کہے گا کہ حضورؐ نے وفات پائی تو میں اس کا سر اُڑا دوں گا۔ دُوسرے صحابی بھی شدید کیب و اضطراب اور انتہائی تب و تاب میں مبتلا تھے۔ حضرت صدیقؓ نے لوگوں کو مخاطب کیا اور کہا:۔

"اشہد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ و اشہد ان سیّدنا محمّدًا عبدہٗ و رسولہٗ۔ (میں گواہی دیتا ہوں کہ سوا اللہ کے اور کوئی معبود نہیں، یگانہ جس کا

کوئی ساجھی نہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ ہمارا سردار محمد اس کا بندہ اور رسول ہے، میں گواہی دیتا ہوں کہ کتاب (اللہ) ویسی ہے جیسی وہ نازل ہوئی اور یہ کہ دین کی راہ اسی طرح ہے جس طرح رسولؐ اللہ نے اسے دکھایا۔ اور حدیث اسی طرح ہے جس طرح آپؐ نے کہی، اور بات وہی ہے جو آپؐ نے فرمائی اور یہ کہ اللہ حق مبین ہے۔"

اِس کے بعد آپؓ نے اور بہت کچھ کہا۔ پھر فرمایا:۔

" اے لوگو! جو محمدؐ کو پوجتا تھا اُسے معلوم ہو کہ محمدؐ فوت ہو گئے۔ ہاں، جو اللہ کی عبادت کرتا تھا تو اسے معلوم ہو کہ اللہ حیّ لا یموت ہے۔ زندہ جو کبھی نہیں مرتا، اور اللہ نے آپؐ کے بارے میں تمہیں پہلے سے آگاہ کر دیا تھا۔ اِس آگاہی کو ناصبوری کی وجہ سے نظر انداز نہ کر دو۔ اللہ نے اپنے نبی کے لئے وہ نعیم اُخروی پسند کی ہے جو اس کے پاس ہے۔ اور اسے ان چیزوں پر ترجیح دی ہے جو تمہارے پاس ہیں اور تمہارے درمیان اپنی کتاب اور اپنے نبی کے طریق (یعنی آپؐ کی سنّت) کو چھوڑا ہے جو ان سے متمسک ہُوا، اس نے حق کو پہچانا، اور جس نے اُن کے درمیان فرق کیا وہ منکر ہُوا (اور اس نے حق کو نہ پایا) یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا کُوْنُوْا قَوَّامِیْنَ بِالْقِسْطِ (اے ایمان والو! عدل پر قائم رہنے والے بنو!) شیطان تمہارے نبی کی وفات کی وجہ سے تمہیں الجھن میں نہ پھنسا دے۔ اور فتنے میں اُلجھا کر تمہیں تمہارے دین سے غافل نہ کر دے۔ جس بات سے تم اسے عاجز کر سکتے ہو، اسے بعجلت تمام ظہور میں لاؤ اور اسے اتنی مہلت نہ دو کہ وہ تمہارے پاس آ جائے۔"

(۲)

پہلی ربیع الاوّل ۱۱ھ کو یعنی اُسی دن، جس روز حضورؐ کا وصال ہوا، سقیفۂ بنی ساعدہؓ

میں حضرت ابوبکرؓ سے لوگوں نے بیعت کی۔ بنو ساعدہ انصار کے قبیلہ خزرج کی ایک شاخ ہیں۔ سقیفہ صفّے کو کہتے ہیں، یعنی مکان کے دروازے کے آگے کا مسقف برامدہ سا، کبھی اُس صُفّے کی کڑیاں مقابل کے مکانوں کے اوپر رکھی ہوتی ہیں اور اس سے گلی کا وہ حصہ جو کسی مکان کے آگے ہو پاٹا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ بنو ساعدہ کے بیٹھنے اُٹھنے کی جگہ اس صُفّے میں تھی اور اسی میں پیر کے روز بیعت ہوئی۔ پھر اگلے دن منگل کو بیعتِ عام منعقد ہوئی۔ بیعت کے بعد آپ نے تقریر کی۔ جس میں حمد و ثنا کے بعد فرمایا:-

" لوگو! میں تمہارا والی قرار دیا گیا ہوں، گو میں تم سے بہتر نہیں ہوں، اگر تم دیکھو کہ میں حق و راستی پر ہوں تو میری مدد کرو، اور اگر دیکھو کہ میں غلطی پر ہوں تو مجھے راہِ صواب دکھاؤ۔ جب تک میں تمہارے بارے میں اللہ کی اطاعت کروں میری اطاعت کرو، اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو میری اطاعت تم پر واجب نہیں۔ آگاہ رہو کہ کمزور شخص میرے نزدیک قوی ترین شخص ہے۔ جب تک کہ میں اس کا حق اس کو نہ لے دوں، اور تم میں سے قوی شخص میرے نزدیک ضعیف ترین شخص ہے۔ جب تک میں اُس سے کسی کا واجب حق دِلوا نہ لوں، میں یہ بات کہتا ہوں اور اللہ سے اپنے لئے اور تمہارے لئے گناہوں کی معافی چاہتا ہوں۔"

(۳)

ایک اور خطبے میں حمد و ثنا اور تشہّد کے بعد کہا:-

" میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے بندے اور رسُول تھے جنہیں اُس نے ہدایت اور دینِ حق دے کر تمام لوگوں کی طرف بھیجا تاکہ اس (دین) کو (اور) تمام دینوں پر غالب رکھے۔ مشرکین کو بُرا ہی دکھائی دے، نہ لگے، اسے لوگوں کیلئے رحمت بنا کر

بھیجا، اور ان کے خلاف حجت بنا کر بھیجا۔ لوگ اُس وقت جاہلیت کی تاریکیوں میں بُرے حال میں گرفتار تھے۔ ان کا دین بدعت، ان کا دعوٰے جھوٹا تھا۔ اللہ نے (اپنے) دین کو محمدؐ سے معزز کیا اور "تمہارے دلوں میں اُلفت پیدا کی اور تم ان کے فضل سے (بھائی) بھائی ہو گئے۔ اور تم آگ کے گڑھے (یعنی دوزخ) کے کنارے (آ گئے) تھے، پھر اس نے تمہیں اس سے بچا لیا۔ اسی طرح اللہ اپنے احکام تم سے کھول کھول کر بیان کرتا ہے، تاکہ تم راہِ راست پر آ جاؤ"۔ پس اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو، کیونکہ اللہ عزّوجل نے فرمایا: "جس نے رسولؐ کا حکم مانا، اُس نے اللہ ہی کا حکم مانا، اور جو پھر بیٹھا تو (اے پیغمبر تم سے اس کی کچھ بازپرس نہ ہوگی، کیونکہ) ہم نے تمہیں کچھ ان لوگوں کا پاسبان (بنا کر) نہیں بھیجا" (۴ (النساء): ۸۰) اس کے بعد لوگو! میں تمہیں ہر باب میں اور ہر حال میں اللہ بزرگ و برتر کے تقوے کی وصیت کرتا ہوں اور یہ بھی، کہ ہر معاملے میں حق کو چمٹے رہو، خواہ وہ معاملہ تمہیں پسند ہو یا ناپسند، کیونکہ جو بات سچ کے مرتبے سے فروتر ہے، اس میں کوئی بھلائی نہیں، جو شخص جھوٹ بولتا ہے وہ حق سے روگردانی کرتا ہے اور جو حق سے روگردانی کرتا ہے وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔ اور فخر سے بچو، وہ کیا فخر کرے گا جو مٹی سے پیدا کیا گیا اور مٹی ہی کی طرف اسے لوٹ کر جانا ہوگا، وہ آج زندہ تو کل مُردہ، پس (نیک) عمل کرو اور اپنا شمار مُردوں میں کرو۔ جو بات تم کو ملتبس معلوم ہو اس کے علم کو اللہ کی طرف لوٹاؤ اور اپنے لئے بھلائی کو آگے بھیجو، اسے تم موجود پاؤ گے اس لئے کہ اللہ عزّوجلّ نے فرمایا: "لوگو! اس دن کو پیش نظر رکھو جبکہ ہر شخص جو کچھ بھلائی (دُنیا میں) کر گیا ہے (خدا کے ہاں چل کر) اسے موجود پائے گا اور (علیٰ ہذا القیاس) جو کچھ بُرائی کر گیا ہے (اسے بھی موجود پائے گا)۔ اور آرزو کرے گا کہ اے کاش اس میں اور

اس (دن) میں زمانۂ دراز حائل ہوتا۔ اور اللہ تمہیں اپنے (جلال) سے ڈراتا ہے اور اللہ (اپنے) بندوں پر حد درجے کی شفقت (بھی) رکھتا ہے"۔ پس اے اللہ کے بندو! اللہ کے عقاب سے ڈرو، اور اس کا خوف (دل میں) رکھو۔ اور جو لوگ تم سے پہلے گذرے ہیں ان سے عبرت حاصل کرو اور جان لو کہ اپنے پروردگار کے سامنے حاضر ہونے سے کوئی چارہ نہیں اور تمام چھوٹے اور بڑے اعمال کا بدلہ ملنے سے کوئی مفر نہیں، سوا ان اعمال کے جو اللہ بخش دے۔ بے شک وہ معاف کرنے والا مہربان ہے۔ پس اپنے نفسوں کو بچاؤ! اور وہ ذات جس سے اعانت طلب کرنا چاہئے۔ وہ اللہ پاک ہی کی ذات ہے، سوا اللہ کی مدد کے نہ کوئی حیلہ ہے نہ توانائی، بے شک اللہ اور اس کے فرشتے پیغمبرؐ پر درود بھیجتے رہتے ہیں (تو) مسلمانو! (تم بھی) پیغمبرؐ پر درود اور سلام بھیجتے رہو"۔ بارِ الہا! محمدؐ پر جو تیرے بندے اور رسول ہیں، درود بھیج! اپنی مخلوق میں سے کسی پر جو درود تُو نے بھیجا، اس سے افضل اور اعلیٰ درود، اور ہمیں بھی ان پر درود بھیجنے سے پاکیزہ بنا۔ اور ہمیں ان سے ملا۔ اور آپؐ کے زمرے میں ہمیں محشور کر، اور آپؐ کے حوض پر ہمیں حاضر کر! بارِ خدا! اپنی اطاعت پر ہمیں مدد دے، اور اپنے دشمنوں کے خلاف ہمیں نصرت دے!"

آپ نے حضرت ابوبکرؓ کے خطبے سُنے، آج ہم آپ کو ان کی چند وصیتیں سناتے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کی کل مدّت ۲ سال ۳ مہینے اور کچھ دن تھی۔ یہ مدّت تو بالکل کم تھی، مگر اس میں نہایت اہم واقعات پیش آئے۔ بہت سے عرب قبائل آنحضرت کے وصال کے بعد مرتد ہو گئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان کے خلاف جہاد کیا۔ اور انہیں راہِ راست پر واپس لائے۔ یمامہ میں مُسیلمہ کذّاب اور اسود عنسی کی بغاوت کو دبایا۔

یمامہ فتح ہوا۔ سنہ ۱۲ھ کے حج کے بعد مدینہ شریف میں واپس آکر آپ نے حضرت اسامہ بن زید کی سرکردگی میں شام کو ایک مہم روانہ کی۔ حضرت اسامہ کے والد زید بن حارث موالی رسول میں سے تھے۔ آنحضرتؐ نے انہیں امیر جیش بنا کر شام کی طرف بھیجا تھا، وہ سنہ ۸ھ میں اُبنیٰ میں شہید ہوئے۔ جو مُوتہ کے قریب شام کے مشرقی علاقے میں واقع ہے۔ حضورؐ نے اب اسامہؓ کو امیر جیش بنا کر موتہ کی طرف بھیجنے کی تیاری کی مگر ان کی روانگی سے پہلے حضورؐ نے انتقال فرمایا۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے اسامہ کو اس مہم پر روانہ کیا، گو اُن کی عمر اس وقت ۲۰ یا ۱۸ برس کی تھی۔ اِس لشکر کی روانگی کے وقت حضرت ابوبکر نے اسامہ اور ان کے لشکر کو یہ وصیتیں کیں:۔

آپ نے فرمایا: "لوگو! ٹھہرو! میں تمہیں دس نصیحتیں کرنا چاہتا ہوں۔ وہ مجھ سے سنو اور یاد رکھو: خیانت نہ کرنا، مالِ غنیمت کے معاملے میں ناراستی نہ برتنا اور غدر نہ کرنا کشتوں کے ناک کان نہ کاٹنا، چھوٹے بچوں کو قتل نہ کرنا، نہ کسی بڑے بوڑھے کو اور نہ کسی عورت کو۔ کسی کھجور کے درخت کو جڑ سے نہ کاٹنا۔ بکری، گائے، اونٹ کو خوراک کی ضرورت کے سوا ذبح نہ کرنا۔ عنقریب تمہارا گذر ایسے لوگوں یعنی نصاریٰ پر ہوگا جنہوں نے خود کو ہر چیز سے ہٹا کر صومعوں کیلئے وقف کر رکھا ہے۔ انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر اپنے شغل میں مشغول رہنے دینا۔ اور عنقریب تم ایسے لوگوں کے پاس جاؤ گے، جو (تمہارے لئے) طرح طرح کے کھانے برتنوں میں رکھ کر لائیں گے۔ جب تم ان میں سے مختلف کھانے کھاؤ گے تو بسم اللہ پڑھنا، اور تم ایسے لوگوں کو بھی پاؤ گے۔ جنہوں نے سر کو بیچ میں سے منڈوا رکھا ہے اور گرداگرد بال سر بندوں کی شکل میں چھوڑ رکھے ہیں۔ انہیں تلوار مارو۔ اب اللہ کا نام لے کر سدھارو۔" (یہ سر کو بیچ سے منڈوانے والے

وہ راہب تھے جو رومیوں کی فوج کی کمک کے لئے آئے تھے۔ اور لوگوں کو عربوں کے خلاف مشتعل کرتے تھے)۔

حضرت خالدبن الولیدؓ کو آپ نے یوں مخاطب کیا:۔

"اللہ کی برکت کے ساتھ روانہ ہو، جب تم دشمن کے علاقے میں داخل ہو، تو حملے سے دُور رہو۔ اس لئے کہ مجھے کھٹکا ہے کہ شکست خوردہ دُشمن واپس لوٹ کر تم پر دوبارہ حملہ نہ کر دے۔ زادِ راہ سے قوّت حاصل کرو اور راستہ بتانے والوں کی مدد سے راستہ طے کرو۔ کسی زخمی سپاہی سے نہ لڑو۔ اس لئے کہ اس کے بدن کا ایک حصّہ بے کار ہو گیا ہے۔ شبخون سے چوکنا رہنا چاہیئے۔ اس لئے کہ عرب غافل ہو جایا کرتے ہیں۔ بات کم کرو۔ اِس لئے کہ تمہاری کی ہوئی بات صرف وہی ہے جو سُننے والے کو یاد رہ سکے، لوگ اپنے آپ کو جس طرح سے ظاہر کرتے ہیں وہ قبول کرو اور ان کے باطن کے بارے میں انہیں اللہ کے سپرد کرو۔ اب میں تمہیں اللہ کو سونپتا ہوں، وہ ذات جس کو سونپی ہوئی چیزیں ضائع نہیں ہوتیں"

خالدبن سعید بن العاص کی جگہ شام کو فتح کرنے کیلئے حضرت ابوبکرؓ نے یزید بن ابی سفیان کو بھیجا، جن کو یزید الخیر بھی کہتے ہیں۔ انہیں یہ وصیّت کی:۔

"میں نے تمہیں یہ مہم سپرد کی ہے اس لئے کہ تمہیں آزماؤں اور تجربہ سے تمہارا حال معلوم کروں، اور تمہیں مشق کا موقع دوں۔ اگر تم امتحان میں پورے اترے تو تم نہ صرف اپنے عہدے پر قائم رہو گے بلکہ اس میں اضافہ بھی کیا جائے گا۔ لیکن اگر تم کامیاب ثابت نہ ہوئے تو میں تمہیں علیحدہ کر دوں گا۔ پس اللہ کا تقویٰ اپنے لئے لازم جانو، اِس لئے کہ وہ تمہارے باطن کو اسی طرح دیکھتا ہے جس طرح تمہارے ظاہر کو، وہ آدمی اللہ سے

نزدیک تر ہے جو اسے اوروں سے زیادہ دوست رکھتا ہے اور وہ آدمی اللہ سے زیادہ قریب ہے جو اپنے عمل کی وجہ سے
اس سے زیادہ تقرب رکھتا ہے۔ میں نے تمہیں خالد (ابن سعید بن العاص) کا عہدہ سپرد
کیا ہے۔ پس جاہلیت کے کبر و فخر سے بچتے رہنا۔ اس لئے کہ اللہ کو اس سے اور
کبر والوں سے دشمنی ہے۔ جب تم اپنے لشکریوں میں آؤ تو ان سے خوش صحبتی سے پیش
آؤ۔ ان سے نیک سلوک کرنے میں پہل کرو۔ اور نیک سلوک کا ان سے وعدہ بھی کرو۔
انہیں نصیحت کرو تو اختصار برتو، اس لئے کہ طول کلام کا ایک حصّہ دوسرے حصّے کو
بھلا دیتا ہے۔ اپنی اصلاح کرو، لوگوں کی اصلاح آپ سے آپ ہو جائے گی۔ نمازیں وقت
پر ادا کرو اور پورے رکوع سجود اور خضوع و خشوع کے ساتھ ادا کرو۔ دشمن کے قاصد
آئیں تو ان کے ساتھ عزّت سے پیش آؤ۔ مگر انہیں زیادہ نہ ٹھہراؤ تاکہ تمہارے لشکر
سے جائیں تو احوالِ لشکر سے بے خبر جائیں۔ زیادہ ٹھہریں گے تو تمہارے لشکر کی کمزوریوں
سے واقف ہو جائیں گے اور تمہیں پوری طرح سے جان لیں گے۔ انہیں وہاں ٹھہراؤ
جہاں تمہارے لشکر کی کثرت ہے۔ ان سے بات چیت خود کرو۔ یہ کام اپنے آدمیوں
کے سپرد نہ کرو۔ اپنے اسرار ظاہر نہ کرو تاکہ تمہارے کام بگڑ نہ جائیں۔ جب لوگوں سے
مشورہ کرو تو سچ بولو، مشورہ دینے والے بھی سچّا مشورہ دیں گے۔ مشیروں سے خبریں نہ
چھپاؤ۔ ورنہ اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کرلو گے۔ رات کو دوستوں کے ساتھ مجلس جماؤ
تمہیں اِدھر اُدھر کی خبریں خود بخود پہنچ جائیں گی اور پردے اُٹھ جائیں گے۔ پہرہ داروں
کی تعداد بڑھاؤ اور انہیں لشکر میں پھیلا دو اور ان کی چوکیوں پر ناگہانی طور پر ان کو اطلاع
دیئے بغیر خود پہنچ جاؤ۔ جسے پہرے میں غافل پاؤ اسے خوب سرزنش کرو۔ مگر حد سے
زیادہ نہیں۔ اور رات کو ان کے درمیان عقب سے آؤ، رات کے ان پہرہ داروں کو

جو نوبتِ اوّل میں پہرے پر کھڑے ہوتے ہیں۔ نوبتِ دوم والوں سے لمبی ڈیوٹی دو۔ اس لیے کہ ان کی ڈیوٹی دن سے قریب ہے۔ مستحقِ عقوبت کو سزا دینے میں تشدد نہ ان میں اصرار اور جلدی کرو، نہ عقوبت کے جاری کرنے میں ڈھیل دکھاؤ۔ لشکر والوں سے غافل نہ ہو کہ وہ بگڑ جائیں مگر اتنا تجسس بھی نہ کرو کہ انہیں رُسوا کر دے۔ لوگوں کے بھیدوں کا بھانڈا نہ پھوڑو اور ان کے ظاہر کو کافی سمجھو، ہرزہ گو بے ہُودہ لوگوں کی صحبت میں نہ بیٹھو، اہلِ صدق و وفا کی مجلس میں بیٹھو۔ دلیری سے جنگ کرو، بُزدلی نہ دکھاؤ کہ اس سے سب کو بُزدل بنا دو گے۔ خیانت کاروں سے بچو، ایسا آدمی مفلسی کو قریب لاتا ہے اور نصرتِ الٰہی کو پرے ہٹاتا ہے۔ عنقریب تمہیں ایسے نصرانی لوگ ملیں گے جو دُنیا سے مُنہ موڑ کر اپنے صومعوں میں گوشہ نشین ہو چکے ہیں۔ انہیں اپنے شغل میں مصروف رہنے دو، اور ان سے تعرض نہ کرو۔"

جب اُن کی (حضرت ابوبکرؓ کی) وفات کا وقت آپہنچا تو انہوں نے حضرت عمرؓ کو یوں وصیّت کی :-

"میں اپنے بعد آپ کو اپنا جانشین بناتا ہوں اور آپ کو اللہ کے تقوے کی وصیّت کرتا ہوں۔ اللہ کے لئے ایک عمل رات کو کیا جاتا ہے، جسے وہ دن میں قبول نہیں کرتا۔ اور دن میں ایک عمل کیا جاتا ہے جسے وہ رات کو قبول نہیں کرتا۔ نفل قبول نہیں ہوتے جب تک فرض ادا نہ کئے جائیں۔ پلڑے صرف انہیں کے بھاری ہوں گے جن کے پلڑے قیامت کے دن دُنیا میں حق کی پیروی کرنے اور حق کے بوجھ سے بھاری ہونگے اور پلڑے کے لئے یہ طے شدہ ہے کہ اس میں سوائے حق کے اور کوئی ایسی چیز رکھی نہیں جا سکتی جو وزن دار ہو، اور پلڑے قیامت کے دن صرف اُنہیں کے ہلکے ہونگے

جنہوں نے باطل کی پیروی کی اور وہ باطل ان کے پلڑے کے ہلکے ہونے کا باعث بنا۔ اور پلڑے کے لئے یہ طے شدہ ہے کہ اس کے ہلکے ہونے کے لئے سوا باطل کے اور کوئی چیز نہیں۔ اللہ نے جنتیوں کا ذکر کیا تو ان کے اعمال کی خوبیوں کا ذکر کیا، اور ان کی برائیوں سے تجاوز کیا، جب میں اہلِ جنت کو خیال میں لاتا ہوں تو میں کہتا ہوں مجھے ڈر ہے، مبادا میں ان میں سے ہوں۔ اللہ نے دوزخیوں کا ذکر کیا، تو ان کی بڑی بڑی بداعمالیوں کا ذکر کیا۔ اور ان کے اعمالِ خوب کا ذکر نہیں کیا۔ جب میں انہیں خیال میں لاتا ہوں تو میں کہتا ہوں: مجھے اللہ سے اُمید ہے کہ میں اُن میں سے نہ ہوں گا اور اللہ نے جہاں عذاب کی آیات بیان فرمائیں تو اس کے ساتھ رحمت کی آیات بھی بیان فرمائیں تاکہ بندہ رغبت بھی کرے اور خوف بھی۔ اور اللہ سے راستی اور حق کے سوا کسی چیز کی تمنا نہ کرے۔ اور اپنے ہاتھوں اپنے تئیں ہلاکت میں نہ ڈالے اگر آپ نے میری وصیت کو یاد رکھا تو کوئی غائب آپ کے نزدیک موت سے زیادہ محبوب نہیں ہونا چاہیئے۔ وہ ضرور آئے گی، اور اگر آپ نے میری وصیت کو ضائع کیا تو کوئی غائب آپ کے نزدیک موت سے زیادہ خوار و بد نظر نہ آئے گا، اور آپ اللہ تعالیٰ کو عاجز و ناتواں نہ پائیں گے۔"

"کتاب العقد" میں ہے کہ جب حضرت ابوبکر صدیق کا آخری وقت آپہنچا، تو آپ نے ایک وصیت نامہ لکھا اور اسے حضرت عثمانؓ اور ایک انصاری کے ہاتھ بھیجا کہ لوگوں کو پڑھ کر سنائیں۔ لوگ اکٹھے ہوئے تو انہوں نے کہا: یہ وصیت نامہ ابوبکرؓ ہے۔ اگر تمہیں یہ منظور ہے تو ہم بھی اسے منظور کریں گے۔ اگر تمہیں یہ منظور نہیں تو ہم اسے لوٹا دیں گے۔ وہ وصیت نامہ یہ ہے: "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یہ ابوبکر بن

ابی قحافہ کا وصیت نامہ ہے۔ ان آخری لمحوں میں جب وہ دُنیا سے نکل رہا تھا، اور ان اوّلین لمحوں میں جب وہ آخرت میں داخل ہو رہا تھا۔ اور یہ وہ وقت ہے جس میں کافر ایمان لاتا ہے، فاجر شقاوت محسوس کرتا ہے اور جھوٹا بھی سچ بولتا ہے۔ میں نے عمر ابن الخطاب کو تم پر امیر مقرر کیا ہے۔ اگر وہ عادل و تقوے پر کاربند رہے تو اسکی نسبت مجھے یہی گمان اور یہی امید ہے اور اگر اس نے خود کو بدلا اور متغیر کیا تو میری نیّت نیک ہے اور غیب کا علم سوا خدا کے کسی کو نہیں۔"

خطبات عمر فاروقؓ

آج ہم آپ کو حضرت عمر بن الخطاب کے چند خطبوں کا ترجمہ سُنانا چاہتے ہیں، جو انہوں نے اپنی خلافت کے زمانے میں دیئے۔ مگر پہلے ہم نہایت اختصار سے ان کے حالات بیان کرتے ہیں۔

آپ جب اسلام لائے تو مسلمانوں کی تعداد مردوں اور عورتوں کو ملا کر ۳۹ تھی۔ ان کے اسلام لانے کے بعد یہ تعداد چالیس ہو گئی۔ ان سے پہلے لوگ اپنے اسلام کو چھپاتے تھے۔ انہوں نے اپنے اسلام کا علی الاعلان اظہار کیا (اور آشکارا ایمان لائے) اس لحاظ سے انہوں نے حق و باطل میں فرق پیدا کر دیا اور فاروق کہلائے۔ مدائنی نے ان کا حلیہ یوں بیان کیا ہے:۔

آپ کا رنگ گندم گوں مائل بسرخی تھا۔ وہ طویل القامت تھے۔ سر کا اگلا حصّہ بے مُو تھا اور سر کے دونوں طرف بالوں کے طُرّے تھے۔ اُن کے گال، ناک

اور آنکھیں خوبصورت تھیں۔ ہاتھ پاؤں موٹے موٹے تھے۔ پٹھے گٹھے ہوئے جسم کی بناوٹ خوب اور اعضا پُر گوشت تھے۔ وہ دائیں اور بائیں دونوں ہاتھوں سے برابر کام لے سکتے تھے۔ چلتے تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا سوار جا رہے ہیں۔ جمادی الآخر ۱۳ھ میں آپ کی خلافت شروع ہوئی۔ وہ بیت المال سے فقط دو درم روزانہ تنخواہ لیتے یعنی تقریباً ۱۴ آنے روز۔ بازاروں میں چکر لگاتے، قرآن پڑھتے جاتے اور جہاں کسی نے مقدمہ پیش کیا وہیں مدعی مدعا علیہ کا بیان سُن کر فیصلہ دے دیتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے انہیں دیکھا کہ اونچا کرتا اور نیچی ازار جس سے پنڈلیاں نظر آتی تھیں پہنے ہوئے تھے اور کھجوروں کے پتوں کا بنا ہوا جوتا پاؤں میں تھا، مگر یہی تھے جنہوں نے قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیئے، کیونکہ شام اور ایران انہیں کے عہدِ خلافت میں فتح ہوئے۔ حسن بصری سے روایت ہے کہ صحابہ میں آپ سب سے زیادہ لمبی نمازیں پڑھتے زیادہ روزے رکھتے۔ وہ دُنیا کی طرف اوروں سے زیادہ بے رغبت اور اللہ کے کاموں میں اوروں سے زیادہ سخت تھے۔ وہ ذی الحجہ ۲۳ھ میں شہید ہوئے۔ ۵۵ سال عمر پائی۔ ان کی خلافت کی مدت ۱۰½ سال سے کچھ زیادہ تھی۔

زمانۂ خلافت میں آپ نے جو خطبے دیئے اور وصیتیں کیں اُن میں سے بعض طبری، جاحظ، ابن عبد ربہ اور ابن اثیر کی کتابوں میں درج ہیں:۔

(۱)

خلافت پانے پر آپ نے ایک خطبہ دیا۔ آپ منبر پر چڑھے۔ اللہ کی حمد و ثنا بیان کی۔ پھر فرمایا:۔

"لوگو! میں دُعا مانگتا ہوں، تم آمین کہو۔ خدایا! مجھ میں درشتی ہے، مجھے اپنے اہل

طاعت کے لئے حق کی موافقت میں نرم کر، تاکہ تیری رضا اور دارِ آخرت کو پاسکوں اور اے خدا! اپنے دشمنوں، نافرمانوں، اور منافقوں کے خلاف درشتی اور شدت عطا کر، لیکن نہ اس طرح کہ میں ان پر ظلم یا زیادتی کروں۔ الٰہی مجھ میں بخل ہے۔ مجھے نکوئی کے دشوار کاموں کیلئے سخی بنا۔ لیکن میانہ روی کے ساتھ، اسراف، فضول خرچی اور اس خواہش کے بغیر کہ لوگ میری سخاوت کو دیکھیں اور اس کا ذکر سنیں، اور توفیق دے کہ اس سے میں تیری رضا اور دارِ آخرت طلب کروں۔ الٰہی! مجھے مومنوں کے لئے تواضع اور نرمی ارزانی کر! الٰہی مجھ میں غفلت اور فراموشی بہت ہے۔ ہر حال میں اپنی یاد میرے دل میں ڈال اور ہر وقت موت کی یاد بھی میرے دل میں ڈال! الٰہی میں تیری طاعت گذاری میں عمل کے لحاظ سے کمزور ہوں۔ اس میں نشاطِ کار روزی کر، اور اس باب میں قوت دے۔ نیت نیک کے ہمراہ، جو تیری قوت اور توفیق کے بغیر وجود میں نہیں آتی! الٰہی: مجھے یقین، نیکی اور تقوے میں ثابت قدم رکھ، اور تیرے دربار میں جو حاضر ہونا ہے اس کی یاد بھی میرے ذہن میں ہمیشہ تازہ رکھ، اور اپنی ذات سے حیا میں بھی پختہ رکھ۔ اور جن باتوں سے تو مجھ سے راضی ہو اُن میں مجھے استقلال روزی فرما، اور محاسبۂ نفس اور اصلاح ساعات اور خوفِ شبہات عطا فرما۔ الٰہی! تیری کتاب میں سے میں جو کچھ پڑھتا ہوں اس میں غور و فکر اور اس کا فہم روزی کر، اور اس کے معانی کی پہچان عطا فرما، اور اس کے عجائبات میں نظر دے اور زندگی بھر اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق بخش۔ بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے۔"

ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ خلیفہ بننے پر آپ نے منجملہ اور باتوں کے کہا:۔

"قرآن پڑھو، اس سے تم پہچانے جاؤ گے۔ اس پر عمل کرو اس سے تم اہلِ قرآن بنو گے۔ کسی شخص کا حق جو تم پر واجب ہے اس حد کو نہیں پہنچتا کہ اس کی اطاعت میں خدا

کی نافرمانی کی جائے۔ آگاہ رہو کہ مال خدا کے متعلق میرا وہی مقام ہے جو یتیم کے سرپرست کا ہوتا ہے۔ اگر میں غنی ہوا تو مالِ خدا سے پرہیز کروں گا۔ اگر حاجت مند ہوا تو اس میں سے نیکی اور اللہ کی اطاعت کے طریق سے کھاؤں گا"۔

(۲)

اپنی خلافت کے ابتدائی دنوں میں آپ نے ایک خطبہ دیا۔ جس میں پہلے اللہ پاک کی حمد و ثنا کہی۔ پھر لوگوں کے دل میں یادِ خدا اور یادِ روزِ قیامت تازہ کی، پھر کہا:

"لوگو! مجھے تمہارا والی مقرر کیا گیا ہے۔ اگر مجھے یہ امید نہ ہوتی کہ میں تمہارے لئے اَوروں سے بہتر اور ضبط قائم رکھنے کے لئے اَوروں سے قوی تر، اور اہم امور جو واقع ہوں گے، ان پر قابو پانے کے لئے اَوروں سے مضبوط تر ثابت ہوں گا، تو میں اس عہدے کو قبول ہی نہ کرتا۔ عمرؓ کے لئے یہ سخت اور غم آور دھندا کافی ہے کہ وہ اس حساب کا سامان بہم پہنچنے کا منتظر رہے کہ تمہارے واجبات اس نے تمہیں کس طرح دلائے اور ان کا پایہ کیا قرار دیا۔ اور تمہارے درمیان اس کی روش کیسی رہی۔ اللہ ہی سے اس بارے میں مدد مانگتا ہوں۔ اس لیے کہ عمرؓ کا حال یہ ہے کہ اسے کسی قوت اور حیلے پر بھروسہ نہیں۔ اگر اللہ عزّوجلّ اپنی رحمت، اعانت اور تائید سے اس کی دستگیری نہ کرے"۔

(۳)

آپ کا ایک اور خطبہ ہے۔ جس میں حمد و ثنا اور نبی پر درود بھیجنے کے بعد آپ نے فرمایا:۔

"لوگو! بعض قسم کی طمع فقر ہے اور بعض قسم کی مایوسی دولتمندی ہے۔ تم وہ مال جمع

کرتے ہو جو تم کھا نہیں سکتے۔ اور ایسی اُمیدیں لگا بیٹھتے ہو جو پُوری نہیں ہوتیں۔ حالانکہ تمہیں بیہودہ امیدوں کے گھر میں صرف ایک مقررہ وقت تک مہلت ملی ہے۔ عہدِ رسول اللہ میں تم پر وحی سے گرفت ہوتی تھی۔ جس نے دل میں بات چھپائی وہ اپنی اس چھپی ہوئی بات کی وجہ سے پکڑا گیا اور جس نے بات ظاہر کی وہ اپنی ظاہر بات کی وجہ سے پکڑا گیا۔ لیکن ہمارے سامنے تمہیں اپنے بہترین اخلاق پیش کرنے چاہئیں۔ تمہارے دل کی باتوں کو خدا جانتا ہے۔ جس نے ظاہراً خوب ہمارے سامنے پیش کیا اور زبانی زبانی کہا کہ میرا باطن اچھا ہے۔ اسے ہم سچا نہ جانیں گے۔ لیکن اگر کسی نے ظاہر خُوب ہمارے سامنے پیش کیا۔ اس کی نسبت ہم حسنِ ظنّ رکھیں گے۔ اور جان لو کہ بعض قسم کی حرص نفاق کی ایک شاخ ہے، لہٰذا اپنی جانوں پر مال صرف کرنے میں دریغ نہ کیا کرو۔ وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (اور جو شخص اپنی طبیعت کے بخل سے بچا رہا تو ایسے ہی لوگ فلاح پائیں گے) لوگو! اپنا ٹھکانہ درست بناؤ، اپنے امور کی اصلاح کرو۔ اللہ اپنے ربّ سے ڈرو۔ عورتوں کو قباطی یعنی سفید مصری کتان کے باریک کپڑے نہ پہناؤ (اس لئے کہ ایسے کپڑے اگر وہ شفاف نہ بھی ہوں تو بھی بیانِ حال کرتے ہیں) لوگو! میں چاہتا ہوں کہ میرا حسابِ خلافت بے باق رہے یعنی اگر میں کچھ کماؤں نہیں تو کچھ گنواؤں بھی نہیں (نہ میں نے کچھ کھایا نہ گنوایا) مجھے تمہارے درمیان مدّت تھوڑی ملے یا زیادہ، مجھے امید ہے کہ میں تمہارے معاملے میں، خدا نے چاہا تو حق پر کاربند رہوں گا۔ اور اس کا التزام بھی کروں گا کہ کوئی مسلمان، خواہ اپنے گھر ہی میں بیٹھا ہو، ایسا نہ ہو کہ مالِ خدا سے اس کا حق اور اس کا حصّہ اسے نہ ملے۔ گو اُس نے اس کے حصُول کے لئے خود کوئی کوشش نہ کی ہو، اور اپنے آپ کو اس کے

لئے تکلیف میں نہ ڈالا ہو، جو مال تمہیں اللہ نے عطا کیا ہے اس کی اصلاح کرو۔ آسائش والا تھوڑا مال اُس کثیر مال سے بہتر ہے جس کے ساتھ شدّت اور سختی ہو۔ اور قتل تو موت کی ایک صورت ہے، جس میں نیک اور بد دونوں مبتلا ہو سکتے ہیں لیکن شہید وہ ہے جس نے اللہ کے اَجر کی امید میں اپنی جان قربان کر دی ہو۔"

(۴)

ایک اور خطبے میں آپ نے فرمایا:۔

" آگاہ رہو کہ میں نے تمہارے پاس اپنے عامل صرف اس لئے بھیجے ہیں کہ تمہیں دین سکھائیں اور تمہیں سُنّت بتائیں۔ میں نے اُنہیں اس لئے نہیں بھیجا کہ وہ تمہاری پیٹھ پر کوڑے لگائیں اور تمہارا مال چھینیں۔ دیکھو! اس قسم کی ناپسندیدہ بات اگر کسی کو پیش آئے تو وہ میری طرف رجوع کرے۔ قسم ہے اُس ذات کی، جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ میں تمہیں اس سے بدلہ دلاؤں گا۔"

اس پر عمرو بن العاص کھڑے ہوئے اور کہا: " اے امیر المومنین! اگر آپ اپنے عاملوں میں سے کسی کو کہیں بھیجیں اور وہ آپ کی رعیّت میں سے کسی کو تادیب کرے اور مارے تو کیا آپ اس سے بدلہ (قصاص) لیں گے؟"

آپ نے فرمایا:" بے شک! قسم ہے اُس ذات کی، جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں اس سے بدلہ (قصّاص) لوں گا۔ میں نے رسولُ اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نے اپنی ذات سے قصاص دلوایا۔"

(۵)

حضرت عمرؓ نے ایک خطبے میں فرمایا:۔ " سب تعریف اُس خدا کو ہے، جس

نے ہمیں اسلام سے معزّز اور ایمان سے مکرّم کیا اور اپنے نبیؐ کی وجہ سے ہم پر رحم کیا' ہم گمراہ تھے' اُن کے ذریعے ہمیں گمراہی سے نکال کر راہِ ہدایت پر ڈالا۔ ہم بکھرے ہوئے تھے اُنؐ کے ذریعے ہمیں جمع کیا اور ہمارے دِلوں میں اُلفت پیدا کی۔ ہمیں ہمارے دُشمنوں کے خلاف نصرت دی اور ہمیں بلاد میں متمکّن کیا اور اسلام کے ذریعہ ہمیں ایک دُوسرے کا محبّت کرنے والا بھائی بنایا۔ اس نعمت پر اللہ کا شکر کرو، اور اس سے درخواست کرو کہ اس نعمت میں اضافہ کرے۔ پھر اس پر مزید شُکر کی توفیق مانگو' اِس لئے کہ اللہ نے تم سے جو وعدہ کیا تھا' وہ پُورا کیا اور تمہیں تمہارے مخالفوں کے خلاف مدد دی۔ گناہوں کے ارتکاب اور کفرانِ نعمت سے بچو۔ اس لئے کہ کم ہی ایسا اتفاق ہُوا ہے کہ ایک قوم نے کفرانِ نعمت کیا اور توبہ کی طرف مائل نہ ہوئے اور وہ اپنا غلبہ کھو نہ بیٹھے اور ان کے دُشمن اُن پر مسلّط نہ کر دیئے گئے۔ لوگو! اللہ نے اس امّت کی دعوت کو معزّز اور ان کے کلمے کو متّحد کیا' اور اس کی کامیابی کو ظاہر کیا اور اسے مدد دی اور شرف عنایت کیا۔ اے بندگانِ خدا! اس کی نعمتوں پر اس کی ستائش کرو اور اس کے احسانوں پر اس کا شکر بجالاؤ۔ اللہ ہمیں تمہیں اپنے شُکر گزاروں کے زُمرے میں داخل فرمائے!"

(۶)

ایک اَور خطبے میں فرمایا:۔

▪ اللہ عزّ وجلّ نے مجھے تمہارا والی مقرّر کیا' مجھے خوب معلوم ہے کہ تمہارے ہاں تمہارے لئے سب سے زیادہ نفع بخش چیز کون سی ہے۔ میں اللہ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس کے بارے میں میری مدد کرے۔ اور جس طرح اَور باتوں میں میری نگہبانی

کی ہے اس بارے میں بھی میری نگہبانی کرے اور تمہاری عطا کے متعلق عدل کو میرے دل میں اسی طرح ڈالے جس طرح مجھے اس کا حکم ہے۔ میں مرد مسلمان ہوں اور عبد ضعیف۔ اللہ عزّوجلّ مدد دے تو اور بات ہے۔ تمہاری خلافت جو مجھے ملی ہے۔ وہ انشاء اللہ میرے برتاؤ میں کوئی تبدیلی نہ کرے گی۔ عظمت اللہ عزّوجلّ ہی کے لئے ہے۔ اور بندوں کو اس میں سے کچھ نہیں ملا۔ پس تم میں سے کوئی نہ کہے کہ عمر کو جب سے خلافت ملی ہے وہ بدل گیا ہے۔ میں اپنے دل میں حق کو موجود پاتا ہوں اور آگے بڑھ کر اپنا معاملہ کھول کر تمہیں بتاتا ہوں جس کسی کو بھی کوئی ضرورت ہو یا اس پر ظلم کیا گیا ہو، یا میری کسی بات پر اسے مجھ پر غصہ آئے تو وہ مجھ سے کہے، اس لئے کہ میں تمہیں میں سے ایک آدمی ہوں۔ اپنے باطن و ظاہر میں اور اپنی آبرو، اور عزّت کے معاملے میں اللہ کے تقوے کو لازم کر لو، اور جو حق تم پر واجب ہے، اپنے جی جان سے ادا کرو، تم میں سے کوئی شخص کسی دوسرے کو اس بات پر نہ اُبھارے کہ وہ خصم کو ہمراہ لے کر میرے پاس چلا آئے۔ اس لئے کہ مجھے کسی کی دور رعایت منظور نہیں۔ تمہاری صلاح و فلاح مجھے عزیز ہے۔ اور سختی اور رنج میں تمہارا مبتلا ہونا مجھ پر گراں گزرتا ہے۔ تم میں سے اکثر بیابانوں اور شہروں میں بستے ہیں۔ اور کچھ ایسے شہر یعنی مکّے میں رہتے ہیں، جس میں نہ کھیتی ہے نہ مویشی ہیں۔ سوا اس مال کے، جو اللہ ان کو پہنچا دے۔ مگر اللہ عزّوجلّ نے وعدہ فرمایا ہے کہ تمہیں بہت سی بزرگی اور ارجمندی دے گا۔ میں اپنی امانت اور اپنے شغل کے بارے میں جواب دہ ہوں۔ جو کچھ میرے یہاں ہوتا ہے اس کی اطلاع تو میں شخصی طور پر حاصل کروں گا۔ اسے کسی پر نہ چھوڑوں گا البتہ جو جگہیں دور ہیں اُن کے بارے میں اس سے چارہ نہیں ہے کہ امانت دار شخصوں

اور ایسے لوگوں کو کام سپرد کیا جائے جو عوام کے خیر خواہ ہوں۔ خدا نے چاہا تو سوا ان کے میں کسی شخص کو اپنی امانت سپرد نہ کروں گا۔"

(۷)

فتوحاتِ عہدِ عمری میں جب زر و مال افراط سے مدینہ شریف میں پہنچنے لگا تو حضرت عمرؓ نے اس میں سے عطایا پنشنیں مہاجرین و انصار کو دینا شروع کیں۔ دیوان مرتب کیا۔ اس میں لوگوں کے نام درج کئے۔ اس کے متعلق لوگوں کو ایک خطبہ دیا اور یوں مخاطب فرمایا۔

"لوگو! جو شخص قرآن کے متعلق کچھ پوچھنا چاہے وہ اُبیؓ بن کعب کے پاس جائے۔ فرائض کے متعلق کچھ پوچھنا چاہے تو زید بن ثابت کے پاس جائے۔ فقہ کے متعلق کچھ پوچھنا چاہے تو معاذ بن جبل کے پاس جائے اور مال کے متعلق کچھ پوچھنا ہو تو میرے پاس آئے۔ اس لئے کہ اللہ نے مجھے مال کا خزانہ دار اور تقسیم کنندہ مقرر کیا ہے۔ میں یہ تقسیم ازواج رسول اللہ سے شروع کروں گا اور پہلے انہیں اُن کا حصّہ دوں گا۔ پھر مہاجرینِ اوّل کو دوں گا، جنہیں اپنے گھر بار اور مال و منال سے بیدخل کر دیا گیا یعنی میں اور میرے ساتھی۔ پھر انصار کو دوں گا۔ جو (مہاجرین کے مدینے آنے سے پہلے) مدینے میں رہتے تھے اور اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ (قرآن مجید میں ہے: وہ مال جو بے لڑے مفت میں ہاتھ لگا ہے منجملہ اور حقداروں کے اس میں محتاج مہاجرین کا بھی حق ہے جو (کافروں کے ظلم سے) اپنے گھر اور اپنے مالوں سے بے دخل کر دیئے گئے (اور اب وہ) خدا کے فضل اور (اس کی) خوشنودی کی طلبگاری میں لگے ہیں اور خدا اور اس کے رسولؐ کی مدد کو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہی سچے

(مسلمان ہیں) اور (اِس مال میں) ان کا (بھی حق) ہے کہ (مہاجرین نے ابھی ہجرت نہیں کی تھی اور وہ) ان سے پہلے مدینے میں رہتے اور اسلام میں داخل ہو چکے ہیں، جو ان کی طرف ہجرت کر کے آتا ہے، اس سے محبّت کرنے لگتے ہیں۔ سورۂ حشر: للفقراءِ المهاجرین الذین اُخرجوا ... الی ــــ یُحبّون من هاجر الیهم)"......

سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے آپ نے فرمایا:۔

"پھر جس نے ہجرت کرنے میں جلدی کی، عطا بھی اسے جلدی ملے گی، اور جس نے ہجرت کرنے میں دیر کی، عطا بھی اُسے دیر سے ملے گی۔ اب اگر کوئی شخص ملامت کرتا ہے تو اپنی اونٹنی کی جائے خواب کو ملامت کرے۔ میں اپنے دو ساتھیوں کے بعد تم میں رہ گیا۔ اور مجھے تم سے پالا پڑا اور تمہیں مجھ سے۔ اگر تمہارے امور میں سے کوئی ایسے ہونگے جن کے لئے میں شخصی طور پر موجود نہیں ہو سکتا، تو اُنہیں میں ایسے لوگوں کے سپرد کروں گا جو جزاء کے مستحق اور امانت والے لوگ ہوں گے۔ اگر انہوں نے اچھا کام کیا تو میں بھی ان سے نیک سلوک کروں گا۔ اور اگر اُنہوں نے کچھ خرابی کی تو اُنہیں سزا دوں گا۔"

———(۸)———

ایک اور خطبے میں فرمایا:۔

"لوگو! ایک وقت مجھ پر ایسا بھی گذرا ہے جس میں مجھے خیال تھا کہ جو شخص کبھی قرآن پڑھتا ہے اس سے اس کا مقصود خدا ــــ اور وہ اجر ہے جو خدا دیتا ہے۔ آگاہ رہو کہ (اب) مجھے خیال ہُوا ہے کہ کچھ لوگ قرآن پڑھتے ہیں اور ان کا مقصود وہ معاوضہ ہے جو لوگ دے سکتے ہیں۔ دیکھو! اپنی قرآن خوانی کا مقصد خدا کو بناؤ۔ اور اپنے ہر نیک عمل کا مقصود خدا کو بناؤ........ جس نے اچھی بات ظاہر کی، ہم

اس کی نسبت حسنِ ظن رکھتے ہیں اور اس اچھی بات کی وجہ سے اس کی تعریف کرتے ہیں اور جس نے بُری بات ظاہر کی اُس بُری بات کی وجہ سے ہم اس سے بدظن ہوتے ہیں اور اس کی وجہ سے اُسے بُرا سمجھتے ہیں۔ اپنے نفسوں کو خواہشاتِ نفسانی سے روکو، اس لئے کہ نفس مائل بہ ہوا ہیں اگر تم انہیں نہ روکو گے تو وہ تمہیں بُرے انجام تک کھینچ لے جائیں گے۔ حق بھاری اور ناگوار ہے اور باطل ہلکا مگر بدعاقبت ہے۔ خطا کا چھوڑنا توبہ کی مزاولت سے بہتر ہے۔ نظرِ بد بارہا خواہشِ بد کا بیج دل میں بوتی ہے اور ایک لمحے کی خواہشِ بد غمِ طویل کا وارث بناتی ہے۔"

(۹)

حضرت ابوبکرؓ نے مرتے دم حضرت عمرؓ کو وصیّت کی تھی کہ جیشِ عراق کے امیر مُثنّیٰ کی امداد کے لئے فوجیں بھیجیں۔ لیکن اہلِ فارس کا رُعب دلوں میں بہت تھا اُن کی حکومت کا دبدبہ اور شان و شوکت اور قوموں پر ان کے غلبے کی وجہ سے لوگ کچھ رُکتے تھے۔ تین دن تک حضرت عمرؓ اعلان کرتے رہے اور لوگ رُکے رہے۔ چوتھے دن ابوعُبید بن مسعود ثقفی آگے آئے اور ان کے بعد لوگ پے در پے آنا شروع ہوئے۔ ابوعُبید ہی کو حضرت عمرؓ نے اس فوج کا امیر بنایا اور ان سے کہا:

"اصحاب رسُولُ اللہ (جو تمہارے ہمراہ ہیں) ان کی بات سُننا اور انہیں شریکِ امر رکھنا اور جلدی نہ کرنا، جب تک معاملہ واضح نہ ہو جائے۔ اِس لئے کہ یہ لڑائی ہے اور لڑائی کے ساتھ بھاری بھر کم آدمی کے سوا دُوسرا پُورا نہیں اُتر سکتا جو یہ پہچانتا ہو کہ آگے کب بڑھنا چاہیئے اور رُکنا کب چاہیئے۔"

(۵)

حب آپ مجاہدین کو جھنڈا دیتے تو کہتے :-

"اللہ کے نام کے ساتھ اور اللہ کی حفاظت میں (اسے تھامو) اور اللہ کی مدد کے ساتھ۔ اللہ کی تائید کے ہمراہ روانہ ہو جاؤ۔ اللہ کی مدد کے سوا اور راستی و صبر کے بغیر فتح نہیں ملتی۔ جو اللہ سے کفر کرتا ہے اس سے راہِ خدا میں جنگ کرو۔ مگر کسی پر زیادتی نہ کرنا۔ اللہ کسی طرح زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا، اور لڑائی میں بزدلی نہ دکھانا، اور قابو پانا تو عقوبت نہ دینا، اور غلبہ پانا تو حد سے نہ نکل جانا۔ اور بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کو قتل نہ کرنا، خصوصاً جب دونوں فوجوں میں ٹکر ہو، یا دشمن پر غارت ڈالو تو ایسے وقت میں احتیاط ضروری ہے، کہ بوڑھے، عورتیں اور بچے قتل نہ ہوں۔"

تاریخ دعوت و تبلیغ

تاریخ دعوت و تبلیغِ اسلام

کوئی مذہب دعوت و تبلیغ کے بغیر وسیع الاشاعت نہیں ہو سکتا۔ نہ کسی مذہب کا وجود دعوت و تبلیغ کے بغیر دیرپا ہو سکتا ہے۔ اسی لئے اسلام میں دعوت و تبلیغ پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اگر اس بارے میں ابتدائے اسلام سے اب تک مساعیٔ جمیلہ عمل میں نہ آتیں تو اسلام چار دانگِ عالم میں کس طرح اشاعت پذیر ہوتا؟ آج عالمِ اسلام کے حدود جنوب مغرب سے شمال مشرق کو جائیں تو ایک طرف سرالیون اور دوسری طرف سائبیریا ہیں اور شمال مغرب سے جنوب مشرق کو جائیں تو ایک طرف بوسنیہ اور دوسری طرف نیوگنی ہیں، اس میں وہ خطہ بھی بڑھالیں، جو مراکش سے زنگبار تک پھیلا ہوا ہے، یہ تو مسلسل اسلامی خطے کے حدود ہیں۔ غیر مسلسل اور منقطع خطوں میں لتھوانیا کے پولوں اور کیپ کالونی کی مسلمانوں کی آبادیاں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ انگلستان، شمالی امریکہ، آسٹریلیا اور جاپان کی متفرق اسلامی آبادیاں بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئیں۔

مسلمانانِ عالم کی صحیح تعداد کا علم ہمیں یوں نہیں کہ بہت سے اسلامی ممالک میں مردم شماری نہیں ہوتی۔ اور اس لئے یہ تعداد محض حدس و تخمین کی بنا پر بتائی جاتی ہے۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں ایک فرنگی مصنف کا اندازہ تھا کہ مسلمانانِ عالم کی تعداد ۲۷ کروڑ سے

۲۷ کروڑ تک کے مابین ہو گی۔ یہ اندازہ شاید اس وقت بھی کم ہو، مگر اب تو تقریباً پچاس برس اور گذر چکے ہیں۔ اِس لئے یہ تعداد یقیناً کم ہے۔ مگر ہمارا مقصد اس تعداد کے ذکر سے فقط یہ ہے کہ اُمّتِ محمّدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام کا دُنیا کے اتنے طویل وعریض خطّے میں پھیلنا اور ان کی تعداد کی یہ کثرت بجز داعیانِ اسلام کی پیہم اور مسلسل خستگی ناپذیر کوششوں کے جو تقریباً چودہ سو سال سے جاری ہیں، ممکن نہ تھی۔

ہم چاہتے ہیں کہ دعوت الی الحق کے اس مقدس کام کی تاریخ پر نظر ڈالیں اور اس فریضے کی یاد تازہ کریں۔ مبادا یہ فریضہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو جائے۔

دعوتِ اسلام کے داعی اوّل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں، قرآن مجید کی بہت سی آیاتِ شریفہ میں اس دعوت کا ذکر آیا ہے۔ جن سے اس کی اہمیّت واضح ہوتی ہے، اور اس کی کیفیّت اور اس کا طریقہ معلوم ہوتا ہے۔ ان میں سے چند آیات یہ ہیں:۔

سُورۂ النحل میں ہے:۔ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ ط

"(یعنی اے پیغمبر لوگوں کو) عقل کی باتوں اور اچھی اچھی نصیحتوں سے اپنے پروردگار کے راستے کی طرف بُلا اور ان کے ساتھ بحث (بھی کرو) تو ایسے طور پر کہ وہ (لوگوں کے نزدیک) بہت ہی پسندیدہ ہو۔"

سورۂ عنکبوت --- کی ایک آیت کا ترجمہ یہ ہے:۔

"اور (مسلمانو) اہلِ کتاب کے ساتھ جھگڑا نہ کیا کرو۔ مگر ایسی طرح پر کہ وہ نہایت ہی عمدہ (اور شائستہ) ہو، ہاں جو لوگ ان میں سے زیادتی کریں (تو ان سے جدال

کا مخالفہ نہیں)"۔

سورۂ حج میں ہے کہ :۔ "(اے پیغمبر) ہم نے ہر ایک اُمت کے لئے عبادت کے طریقے قرار دیئے کہ وہ ان پر چلتے ہیں تو (تمہارے زمانے کے) ان لوگوں کو چاہیئے کہ اس طریقے (اسلام) میں تم سے کسی طرح کا جھگڑا نہ کریں اور تم اپنے پروردگار کی طرف (لوگوں کو) بلائے چلے جاؤ، کچھ شک و شبہ نہیں کہ تم سیدھے راستے پر ہو، اور (اس پر بھی یہ لوگ) تم سے جھگڑا کریں تو (ان سے) کہہ دو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے بخوبی واقف ہے"۔

بہت سی آیات میں یہ فرمایا گیا ہے کہ پیغمبروں کا فرض یہ ہے کہ احکامِ الٰہی کو واضح طور پر خلقِ خدا کو پہنچا دیں۔ اور بس۔ مثلاً سورۂ جن میں ہے :۔

"(اے پیغمبر) ان لوگوں سے کہو کہ خدا کے (غضب) سے کوئی بھی مجھے پناہ نہیں دے سکتا، نہ اس کے سوا کہیں مجھے ٹھکانہ مل سکتا ہے۔ میرا بچاؤ تو اسی میں ہے کہ خدا کی طرف سے (جو حکم آیا میں لوگوں کو) پہنچا دوں اور اس کے پیغام (سب کو سنا دوں)"۔

اسی طرح سورۂ نحل میں ہے :۔

فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ ٥

"تو پیغمبروں پر سوا اس کے کہ (احکامِ خدا کو) صاف طور پر پہنچا دیں، اور کوئی ذمہ داری نہیں"۔

سورۂ نحل میں ہے : وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ٥

پھر اگر لوگ اتنا سمجھانے پر بھی منہ موڑیں تو (اے پیغمبر) تمہارے ذمے

کھلے طور پر (خدا کے حکم کا) پہنچا دینا ہے، اور بس۔"

حضورؐ کے تمام اہلِ عالم کی طرف مبعوث ہونے کے متعلق متعدد آیات ہیں۔ سورۂ سبا میں فرمایا ہے:۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا

"اور (اے پیغمبر) ہم نے تو تم کو تمام دُنیا کے لوگوں کی طرف (پیغمبر بنا کر) بھیجا ہے کہ (ان کو ایمان لانے پر ہماری خوشنودی کی) خوشخبری سُنا دو، اور (کفر کرنے پر ہمارے عذاب سے) ڈرا دو۔"

ایک داعی الی الخیر جماعت کا ذکر بھی سُورۂ آلِ عمران میں موجود ہے:۔

وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

"اور تم میں ایک ایسا گروہ بھی ہونا چاہیئے جو لوگوں کو نیک کاموں کی طرف بلائیں، اچھے کام (کرنے کو) کہیں، بُرے کاموں سے منع کریں اور (آخرت میں) ایسے ہی لوگ اپنی مراد کو پہنچیں گے۔"

آئیے اب سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ داعیِ برحقؐ نے ان ارشاداتِ ربّانی کی تعمیل کیونکر کی اور تبلیغ کا حق کیونکر ادا کیا؟

نزولِ وحی کے بعد جب آنحضرتؐ رسالت کے اہم فرائض کی انجام دہی کے لئے تیار ہوئے تو سب سے پہلے حضرت خدیجہؓ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسُول پر، اور اُس وحی پر ایمان لائیں جو آپ پر نازل ہوئی۔ اس کے بعد مردوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں سے تھے۔ حضرت زیدؓ مولیٰ رسول اللہ، اور حضرت علیؓ، جن کی

عمر اس وقت صرف دس سال کی تھی، اور جو اس وقت آنحضرت کے سایۂ عاطفت میں پل رہے تھے اور حضرت ابوبکرؓ۔ جن کی نسبت حضورؐ فرمایا کرتے تھے: "میں نے کسی کو اسلام کی دعوت نہیں دی۔ مگر یہ کہ اس نے وقفہ اور یا ذرا ایستادگی ظاہر کی اور تأمل و تردّد میں پڑا ہو سوا ابوبکر بن قحافہ کے جب میں نے انہیں اسلام لانے کو کہا تو وہ نہ رُکے اور نہ انہیں اس میں تردّد ہوا۔

پھر حضرت ابوبکرؓ کی کوششوں سے پانچ اور افرادِ قریش ایمان لائے۔ یعنی حضرت سعد بن وقاصؓ، الزبیر بن العوام اور ان کی اہلیہ مکرمہ حضرت طلحہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت عثمان بن عفان رضوان اللہ علیہم، یہ آٹھ افراد "اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ" میں سے ہیں، جو اسلام لائے۔ جنہوں نے نماز پڑھی۔ رسول اللہ کی تصدیق کی اور اس وحی کی تصدیق کی۔ جو آپ پر نازل ہوئی، ان کے بعد ابن ہشام صاحب "کتاب سیرۃِ رسول اللہ" نے بیشتر ابن اسحٰق کی روایت سے اسی زُمرے کے بہت سے نام گنائے ہیں جو کتاب کے تین صفحوں میں آئے ہیں۔ اُنہیں میں حضرت ابوعبیدہ بن الجرّاح اور ارقم بن ابی ارقم اور صہیب "سابق الروم" اور کئی دیگر لوگ شامل ہیں۔

بعثت کے تین سال اب ختم ہوئے۔ اس زمانے میں دعوتِ اسلام مخفی تھی صحابۂ کرام مکّے کی وادیوں میں چھپ چھپا کر نماز پڑھتے تھے، اس کے بعد آپ کو حکم ہوا کہ اپنے عشیرۃ الاقربین کو اسلام کی دعوت دیں اور آپ نے دعوت اسلام کا اظہار کیا، اس وقت تک قریش نے آپ کی مخالفت یا تردید نہ کی تھی، مگر جونہی آپؐ نے ان کے معبودوں کا ذکر کیا اور ان کے عیب بیان کئے تو قریش کے اکثر

لوگ آپ کی مخالفت کرنے، اور آپ سے عداوت رکھنے لگے۔ جب انہوں نے آپ کے چچا ابوطالب کے پاس آپ کی شکایت کی تو ابوطالب نے نرمی سے یہ شر رفع دفع کر دیا۔ مگر چونکہ آپؐ نے اظہارِ دین اللہ بدستور جاری رکھا تو قریش نے دوبارہ ابوطالب سے کہا کہ "اپنے بھتیجے کو ان کے باپ دادا کی نادانی کے ذکر اور قریش کے معبودوں کی بُرائی سے روک دو۔" اس پر ابوطالب نے آپ سے کہا۔ "مجھ پر اور اپنی جان پر رحم کرو، اور مجھ پر ناقابلِ برداشت بوجھ نہ ڈالو۔" حضورؐ نے یہ سمجھا کہ چچا نے اپنی رائے بدل دی ہے اور آپ کا ساتھ چھوڑ دینے کا ارادہ کر رہے ہیں تو آپؐ نے فرمایا۔ "اے چچا! واللہ، اگر لوگ سورج کو میرے دائیں ہاتھ پر اور چاند کو میرے بائیں ہاتھ پر رکھ دیں اور مجھ سے کہیں کہ میں اس معاملے کو چھوڑ دوں، اس سے پہلے کہ خدا خود اس کو غالب کر دے، یا میں اس میں ہلاک ہو جاؤں تو میں اسے ترک نہ کروں گا۔" آپ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور آپ رو پڑے اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جب آپ چل پڑے تو ابوطالب نے آپ کو واپس بلایا اور کہا "بھتیجے جاؤ، جو جی چاہے کہو، واللہ کچھ بھی ہو میں تمہارا ساتھ نہ چھوڑوں گا۔"

(۲)

کل ہم دعوتِ اسلام کی ابتدائی تاریخ بیان کر رہے تھے اور یہاں تک پہنچے تھے کہ پہلے تین سال کی مخفی دعوت کے بعد حضور کو حکم ہوا کہ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (پس تم کو جو حکم دیا گیا اسے کھول کر سنا دو) اور وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ (اور اپنے قریب کے رشتہ داروں کو (عذابِ خدا سے) ڈراؤ") اس پر آپ نے دعوتِ اسلام کا اظہار کیا۔ قریش نے گھبرا کر آپ کے چچا سے شکایت کی تو انہوں نے پہلے تو حضورؐ کو

روکا۔ مگر آپ کا عزم دیکھ کر آپ کا ہر حال میں ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ لیکن قریش کی کوششیں آپ کے خلاف بدستور جاری رہیں۔ انہوں نے سفیہان قوم کو آپ کے خلاف اُبھارا، آپ کی تکذیب اور ایذا میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ کبھی آپ کو شاعر کہا کبھی ساحر، کبھی کاہن کہا، کبھی مجنوں۔ ایک دن ابوجہل نے کوہِ صفا کے قریب آپؐ کو اذیت دی اور بُرا بھلا کہا، اور آپ کے دین کی مذمت کی، آپ نے خاموشی سے یہ سب کچھ سُنا۔ اور صبر کیا۔ آپ کے چچا حمزہ کو، جو قریش کے زبردست اور قوی آدمیوں میں سے تھے، لوگوں نے یہ قصّہ سنایا، تو آپ ابوجہل کے پاس پہنچے اور کمان جو ان کے ہاتھ میں تھی اس کے سر پر دے ماری اور کہا: "تم انہیں بُرا بھلا کہتے ہو، میں بھی وہی کہتا ہوں جو وہ کہتے ہیں، اگر طاقت ہے تو تم اسے رد کرو۔"

اس کے بعد کئی اور واقعات پیش آئے، قریش نے بنو ہاشم کی حمایت کے سبب سے حضورؐ کو بُرا بھلا کہنا تو کم کر دیا۔ مگر غریب مسلمانوں کی اذیت میں بہت سرگرمی دکھانے لگے، مثلاً حضرت بلالؓ کو، جو حبشی غلام تھے اور مسلمان ہو چکے تھے ان کے جمحی آقا نے حد سے زیادہ تکلیف پہنچائی۔ وہ تپتی ریت پر سخت گرمی کے وقت انہیں چت لٹا دیتا اور ایک بڑا سا پتھر ان کے سینے پر رکھ دیتا اور کہتا کہ اگر تو محمدؐ سے منکر نہ ہوا اور لات و عزّیٰ کو اپنا معبود نہ مانا تو ہم تجھے اسی طرح عذاب دے کر ہلاک کر دیں گے۔ بلالؓ اس ابتلائے سخت میں کہتے "اَحَدٌ اَحَدٌ" (خدا ایک ہے خدا ایک ہے) ایک دن حضرت ابوبکرؓ ادھر سے گزرے تو جمحی سے کہا۔ "اس مسکین کے معاملے میں خدا کا خوف کر، آخر یہ عذاب و ایذا تا کجے؟"

جمحی نے جواب دیا ہے کہ اسے تمہیں نے خراب کیا ہے، اب تم ہی اسے بچاؤ!

غرض حضرت ابوبکرؓ نے جمحی کو ایک غلام حضرت بلال کے عوض میں دے کر انہیں چھڑوالیا اور آزاد کردیا۔ اور چھ اور ایسے غلاموں کو جو اسلام لائے تھے، ہجرت سے پہلے آزاد کیا۔ قریش کی ایذا دہی میں قید، مار دھاڑ، بھوکا پیاسا رکھنا، اور مکے کی تپش کا عذاب شامل تھا۔ ایمان والے یہ سب اذیتیں اور ہر طرح کا عذاب صبر کے ساتھ برداشت کرتے اور دین کو نہ چھوڑتے، چنانچہ جب حضرت عبداللہ بن مسعود نے کہا کہ میں قریش کے سامنے قرآن مجید باآواز بلند پڑھوں گا تو اصحاب رسولؐ اللہ نے انہیں منع کیا، اور کہا، یہ تو ایسے آدمی کا کام ہے جس کے قرابت دار اسے دشمنوں سے بچا بھی سکیں، مگر وہ نہ رکے اور کہا: "اللہ مجھے دشمنوں سے بچائے گا۔"

دوسرے دن چاشت کے وقت وہ مقام ابراہیم کے پاس پہنچے۔ قریش اپنی مجالس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے سورۂ الرحمٰن پڑھنا شروع کی، اس پر قریش لپک کر آئے اور ان کے منہ پر مکے لگائے۔ مگر جب تک ہو سکا وہ پڑھتے گئے، پھر (لہو لہان منہ لے کے) لوٹے۔ صحابہ نے کہا کہ اسی بات کا ہمیں ڈر تھا، مگر ابن مسعود کہنے لگے کہ میں کل پھر جا کر ان کے سامنے قرآن مجید پڑھنے کو تیار ہوں۔ اس پر صحابہ نے منع کیا اور کہا کہ اتنا ہی کافی ہے۔ "اصابہ" میں ہے کہ حضرت ارقم مخزومی کا گھر صفا کے قریب تھا۔ رسول اللہ ان کے گھر میں جا ٹھہرے اور تبلیغ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کی تعداد چالیس ہو گئی۔ حضرت عمرؓ چالیسویں تھے۔ غالباً قریش کی شدت مخالفت کی وجہ سے حضور نے بعثت کے چوتھے سال میں اس مکان میں اسلام کا وعظ کہنا شروع کیا۔ اس لئے کہ اس مکان کا محل وقوع مرکزی تھا اور وہاں کسی قسم کی رکاوٹ کا اندیشہ نہ تھا۔

چونکہ صحابہ کو کفّار قریش کے تشدّد سے بچانا ممکن نہ تھا۔ اس لئے آنحضرتؐ نے ان سے چاہا کہ وہ ارضِ حبشہ میں ہجرت کر جائیں۔ وہاں کا بادشاہ ظالم نہیں اور وہ سرزمین ارضِ صدق ہے۔ اور کہا کہ وہ وہاں اُس وقت تک ٹھہرے رہیں جب تک کہ کشائش کی صورت پیدا نہ ہو جائے۔ پہلے تو چودہ مرد اور چار عورتیں حبشہ کو گئیں۔ مگر بعد میں اور لوگ بھی جا پہنچے۔ بعض تنہا، بعض عیال کے ساتھ، ابن ہشام نے حبشہ کے مسلمان مہاجرین کی تعداد ۸۳ کے قریب بتائی ہے۔ اس تعداد میں مہاجرین کی اولاد شامل نہیں۔ یہ بعثت کے پانچویں سال کا واقعہ ہے۔

کہتے ہیں کہ قریش نے مہاجرین کا حبش میں بھی تعاقب کیا اور ایک وفد نجاشی کے پاس بھیجا اور کہا کہ یہ لوگ نہ تمہارے دین میں شامل ہوئے نہ ہمارے دین میں ہے بلکہ ایک نیا دین انہوں نے کھڑا کر لیا ہے۔ انہیں ہمارے حوالے کر دو۔ نجاشی نے مہاجرین سے بات چیت کر کے اپنا اطمینان کر لیا اور قریش کے وفد کی درخواست مسترد کر دی۔

ابھی ذکر ہوا تھا کہ دارِ ارقم میں آنحضرت کے قیام کے زمانے میں اور ہجرتِ حبشہ کے بعد حضرت عمرؓ ایمان لائے۔ ان کے ایمان لانے کا قصہ راویانِ مدینہ کی روایت سے ابن اسحٰق نے مفصّل دیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک دن عمرؓ تلوار لگائے جا رہے تھے۔ نعیم بن عبداللہ کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ آنحضرتؐ پر حملہ کرنے کی غرض سے جا رہے ہیں۔ نعیم نے کہا، پہلے اپنے اہلِ بیت کی خبر تو لو۔ انہوں نے پوچھا: "کون سے اہل بیت؟" انہیں بتایا کہ ان کی بہن فاطمہ اور ان کا بہنوئی مسلمان ہو چکے ہیں۔ عمرؓ ان کی طرف لوٹے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت خبّاب بن الارتّ ان کی بہن اور بہنوئی کو ایک صحیفے سے سورۃ طٰہٰ پڑھا رہے ہیں۔ عمرؓ کی آہٹ پا کر حضرت خبّاب کو بھی چھپا

دیا گیا۔ اور صحیفے کو بھی۔ خبّاب کی قراءت کی آواز عمرؓ سُن چکے تھے۔ آتے ہی بہن اور بہنوئی کو ڈانٹا: "میں نے سُنا ہے کہ تم بھی مسلمان ہو گئے ہو"۔ پھر جوش میں آکر بہنوئی پر حملہ کر دیا، تو ان کی بہن شوہر کو بچانے کی غرض سے آگے بڑھیں۔ انہوں نے طیش میں آکر بہن کا سر پھوڑ دیا۔ اس پر دونوں میاں بیوی بولے: "ہم بے شک مسلمان ہو گئے ہیں اور خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہیں۔ جو تمہارے جی میں آئے کرو"۔ بہن کے سر سے خون بہتا ہوا دیکھ کر عمرؓ نادم ہوئے۔ انہوں نے بہن سے صحیفہ مانگا اور قسم کھائی کہ پڑھ کر واپس کر دیں گے۔ بہن نے کہا، تم نہالو تو میں تمہیں صحیفہ دوں گی۔ اسے صرف طاہر ہی چھو سکتا ہے۔ چنانچہ وہ نہا کر پاک صاف ہوئے۔ پھر جب حضرت عمرؓ سورۃ طٰہٰ کا ایک حصہ پڑھ چکے تو بولے: "واہ واہ! کتنا خوبصورت اور بلند کلام ہے"۔ حضرت خبّاب نے یہ سُنا تو باہر نکل آئے اور کہا: "واللہ مجھے امید ہے کہ اللہ نے تمہیں اپنے نبی کی دُعا کے ساتھ خاص کر دیا ہے، وہ کل ہی فرما رہے تھے۔ "اے اللہ اسلام کو ابوالحکم بن ہشام یا عمر بن الخطاب سے تقویت دے"۔ سو اے عمرؓ اللہ سے ڈر، اللہ سے ڈر! اس پر عمر نے کہا: "حضورؐ کہاں ہیں؟ میں ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام لانا چاہتا ہوں"۔ عمرؓ کو حضرت خبّاب نے صفا والے گھر کا پتہ دیا اور یہ وہاں جا کر ایمان لائے۔

حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کے اسلام لانے سے مسلمانوں کو بہت تقویت ہوئی انہوں نے دارِ ارقم چھوڑا اور وہ کھلے بندوں دعوتِ اسلام دینے اور کعبہ کے گرد نمازیں پڑھنے لگے۔

اب قریش میں بے حد جوش پیدا ہوا، انہوں نے دیکھا کہ حضورؐ کے اصحاب امن چین سے حبشہ میں وقت گزار رہے ہیں۔ شاہِ حبش کی حمایت انہیں حاصل ہے۔ حضرت حمزہ

اور عمر ایمان لا چکے ہیں۔ اسلام قبائلِ عرب میں پھیلنے لگا ہے۔ جس جماعت کو وہ ایک حقیر سی جماعت سمجھتے تھے۔ اب وہ قوی ہو گئی ہے اور اس کی طاقت روز افزوں ہے۔ انہوں نے جمع ہو کر مشورہ کیا اور ایک صحیفہ لکھا۔ جس میں اقرار کیا کہ بنی ہاشم اور بنی مطلب سے بیاہ شادی اور خرید و فروخت بالکل بند کر دی گئی اس صحیفے کو کعبے کے اندر لٹکا دیا گیا۔ اس پر بنو ہاشم اور بنو مطلب، شعبِ ابی طالب میں جمع ہو گئے اور دو تین سال تک یہ سختی کا زمانہ جاری رہا۔ اتنی سختی کہ اناج بھی انہیں پہنچنے نہ دیا جاتا تھا۔ اگر ان کا کوئی دوست انہیں کوئی چیز پہنچانا چاہتا تھا تو چوری چھپے سے پہنچاتا تھا۔ اور اگر کوئی لے جانے والا پکڑا جاتا تھا تو سر پھٹول تک بھی نوبت پہنچ جاتی تھی۔ اس بندش سے صرف اشہرِ حُرُم مستثنیٰ تھے۔

باوجود ان تمام شدائد اور سختیوں کے آنحضرتؐ دن رات اپنی قوم کو دعوتِ اسلام دیتے اور انہیں نجات کی راہ دکھاتے رہے۔ خفیہ بھی اور کھلے طور پر بھی اور امرِ الٰہی کے بارے میں وہ کسی آدمی سے خائف نہ تھے۔ گو آپ کے چچا اور آپ کی قوم دشمنوں سے آپ کو بچانے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتے رہتے تھے۔ جب حج کا زمانہ آتا اور قبائل کے لوگ مکے میں آتے تو آپ انہیں اسلام کی دعوت دیتے۔ مگر ابو لہب ان زائرین کو بہکاتا اور وہ لوگ کہتے: "آپ پہلے یہ بتائیں کہ آپ کے اپنے لوگ آپ پر کیوں ایمان نہیں لاتے؟"

مگر جو سختیاں آپ نے اور دیگر بنو ہاشم نے جھیلیں، انہوں نے آہستہ آہستہ قریش کے ایک طبقے کو متاثر کیا اور ان میں سے پانچ آدمیوں نے اکٹھے ہو کر بندش کے ظالم صحیفے کی تنقیض کا عہد کیا۔ ان میں سے ایک نے طوافِ کعبہ کے بعد کہا۔"اے

مکّے والو! یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ہم کھانا کھائیں اور کپڑے پہنیں مگر بنو ہاشم ہلاک ہوں، نہ خریدیں، نہ بیچیں، جب تک یہ قاطع اور ظالم صحیفہ پھاڑ نہیں دیا جائے گا، میں آرام سے نہ بیٹھوں گا۔" ان پانچ میں سے ایک اور اُٹھا تا کہ صحیفے کو لے کر پھاڑ دے، مگر سوا بِاسْمِكَ اللّٰھُمَّ کے صحیفے کی باقی عبارت کو دیمک چاٹ چکی تھی۔ اس طرح یہ انتہائی تکلیف دہ بندش کا دَور ختم اور بنو ہاشم کی مصیبتوں کا خاتمہ ہُوا۔

(۲)

کل ہم یہاں تک پہنچے تھے کہ شعب بنی ہاشم والی بندش کے ختم ہونے سے وہ شدید تکلیفیں جو آنحضرتؐ اور ان کے اقربا، کو پہنچ رہی تھیں ختم ہو گئیں، مگر تقدیرِ الٰہی سے اسی سال آپ کی زوجۂ مکرمہ اور وزیرِ صدق حضرت خدیجہ کا انتقال ہُوا اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد آپ کے چچا ابوطالب بھی فوت ہو گئے۔ اسبابِ ظاہری کے لحاظ سے ان کی تائید اور حمایت کے جاتے رہنے سے دُشمنوں کی ایذا رسانی کے موانع رفع ہو گئے اور وہ اَور بھی شیر ہو گئے۔ اب آپ نے اہلِ طائف کی طرف رجوع کیا جہاں بنو ثقیف رہتے تھے، تا کہ انہیں دین کی دعوت دیں، اور ان کی نصرت اور حمایت حاصل کریں۔ قریش کے قبیلۂ جُمَح کی ایک بی بی طائف کے ایک رئیس کو بیاہی ہوئی تھیں، ان کے شوہر اور اس کے دو بھائیوں کے پاس، جو اُس وقت کے رؤساء ثقیف میں سے تھے۔ آپ گئے، انہیں اسلام کی طرف دعوت دی اور دین کے بارے میں ان کی تائید اور اس کے دُشمنوں کے خلاف اُن کی حمایت چاہی۔ طائف کے ان بُت پرستوں کی سمجھ میں یہ باتیں نہ آئیں۔ انہوں نے نہ صرف انکار کیا، بلکہ اپنے سفیہوں اور غلاموں کو بھڑکایا۔ ان کے سبّ و شتم

اور آوازوں سے تنگ آکر اور بنو ثقیف کی امداد سے مایوس ہو کر آپ انگور کی ایک بیل کے نیچے بیٹھ گئے۔ اور ذرا سکون حاصل ہُوا تو دُعا کی:

"یا اللہ! میں اپنی قوّت کی کمزوری اور حیلے کی کمی، اور لوگوں کے حقارت آمیز سلوک کی شکایت تیرے ہی پاس کرتا ہوں، اے ارحم الراحمین! تو ضعیفوں کا ربّ ہے، تو میرا ربّ ہے، مجھے کس کے حوالے کرتا ہے؟ دُور والے کے؟ جو مجھے دیکھ کر تیوری چڑھاتا ہے، یا دُشمن کے؟ جسے تُو نے میرے معاملے کا سپردار بنایا ہے؟ اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں ہے تو مجھے کسی سے کچھ باک نہیں، تیرا کرم دہات کو مجھ سے دور کرنا میرے لئے بہت گنجائش رکھتا ہے۔ میں تیری ذات کے پاس، جس سے اندھیروں میں روشنی چمک اٹھتی ہے اور دین و دُنیا کے معاملے درست ہو جاتے ہیں اِس سے پناہ لیتا ہوں کہ تیرا غضب مجھ پر نازل ہو یا تیرا غصّہ مجھ پر وارد ہو۔ میرا فرض ہے کہ تجھے راضی کرتا رہوں تا آنکہ تُو راضی ہو جائے۔ بجز تیری اعانت کے نہ کوئی چارہ ہے، نہ قوّت۔" (ابن ہشام صہ ۲۸۰)

ثقیف سے مایوس ہو کر آپ مکّے کو لوٹ آئے۔ آپ کی قوم پہلے سے بھی زیادہ آپ کے خلاف ہو گئی۔ لیکن جب مواسم میں قبائلِ عرب مکّے اور اس کے نواح میں آتے تو آپ انہیں اللہ کی طرف بلاتے، ایک ایک قبیلے کے زائرین سے کہتے کہ "میں اللہ کا رسول ہوں اور تمہاری طرف بھیجا گیا ہوں، اللہ کو معبود مانو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ گردانو، اللہ کے سوا سب معبودوں کو ترک کرو، میری تصدیق کرو، دشمنوں کے خلاف میرا ساتھ دو تاکہ میں ان سے بے خوف ہو کر اللہ کا پیغام تمہیں پہنچا سکوں"۔ مگر اکثر قبائل اس تعلیم کے قبول کرنے سے انکار کرتے۔ بعض کو تو

ابولہب وغیرہ بہکا دیتے اور بعض قبائل ناقابلِ قبول شرطیں پیش کرتے (ابن ہشام ۲۸۲)
لیکن جب اللہ کو منظور ہوا کہ اس کا دین غالب آئے۔ اس کے نبی کی تکریم ہو، اور اس کے وعدے پورے ہوں تو اس کے اسباب بھی پیدا ہو گئے۔ ایک دفعہ حج کے موقع پر آپ کی ملاقات مدینے کے چھ آدمیوں سے ہوئی، جو خزرج قبیلے کے تھے۔ آپ نے انہیں اسلام کی طرف دعوت دی اور قرآن پڑھ کر سنایا، مدینے میں یہود بھی رہتے تھے۔ وہ کبھی خزرجیوں وغیرہ سے لڑتے جھگڑتے تو ان سے کہتے کہ عنقریب ایک پیغمبر آنے والا ہے، ہم اس کے ساتھ ہو کر تمہیں قتل کریں گے۔ ان خزرجیوں کو یہ بات یاد تھی۔ انہوں نے کہا: "واللہ یہ وہی نبی ہیں جن کا یہود ذکر کیا کرتے تھے" چنانچہ وہ سب کے سب مسلمان ہو گئے۔ اور وعدہ کیا کہ ہم مدینے جا کر اپنے باقی قبیلے کو بھی اسلام کی طرف دعوت دیں گے اور امید ظاہر کی کہ ان کی باہمی عداوت شاید آپ کی وجہ سے ختم ہو جائے۔ جب یہ لوگ مدینے واپس گئے تو انہوں نے رسول اللہ کا چرچا کیا اور اپنے قبیلے کو اسلام کی طرف دعوت دی۔ یہاں تک کہ کوئی گھر مدینے کا ایسا نہ رہا جس میں آپؐ کا ذکر نہ ہوتا ہو۔

دعوتِ اسلام کی پوری کامیابی کا زمانہ آ پہنچا۔ مدینے میں یہود کی بہت بڑی آبادی تھی۔ ان کی وجہ سے بعض مشرکانہ مذہبی خیالات سے اہلِ مدینہ مایوس ہو چکے تھے، اس کے علاوہ اوس و خزرج کے باہمی جنگ وجدال سے بھی دونوں قبیلے کافی بیزار ہو چکے تھے اور دونوں اس کے لئے آمادہ تھے کہ ان میں پھر سے امن و امان قائم ہو جائے۔

اگلے سال حج کے موقع پر انصار کے بارہ آدمیوں کا ایک وفد عَقَبَہ میں آپؐ سے آکر ملا۔ اس زمانے تک لڑائی فرض نہ ہوئی تھی، وہ اسلام لائے اور عہد کیا کہ "ہم

اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں گے۔ چوری اور زنا نہ کریں گے۔ اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گے۔ کوئی بہتان نہیں باندھیں گے، اور کسی نیکی کی بات میں رسول اللہ کی نافرمانی نہیں کریں گے۔" ان سے کہا گیا کہ "اگر تم اس عہد پہ قائم رہے تو تمہیں جنّت ملے گی اور اگر اس میں تم نے کچھ کوتاہی کی تو تمہارا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ وہ چاہے تو عذاب دے اور چاہے تو معاف کر دے۔"

جب یہ لوگ واپس گئے تو حضورؐ نے مُصعَب بن عُمیرؓ کو ان کے ساتھ بھیجا تاکہ انہیں قرآن پڑھائے، اسلام سکھائے اور دین سے آگاہ کرے۔ چنانچہ اُنہیں مدینے والے مُقرِیٔ کہتے تھے، انہوں نے پہلا جمعہ مدینے میں پڑھایا اور اسلام کی اشاعت مدینے میں کی، مدینے کے ایک قبیلے کے دو سردار سعد بن معاذ اور اُسید بن حُضیر انہیں کی تبلیغ سے مسلمان ہوئے۔ ایک دن سَعد حربہ ہاتھ میں لئے اور گالیاں بکتے ہوئے آئے اور مصعب اور ان کے مدنی میزبان سے کہا: "تم لوگ یہاں کیوں آئے؟ تم ہمارے کمزور آدمیوں کو بے وقوف بنا رہے ہو، اگر جان عزیز ہے تو یہاں سے چلتے بنو!" مصعب نے کہا: "آپ بیٹھیں اور سُنیں، اگر ہماری بات آپ کو پسند آئے تو قبول کریں، اگر ناپسند ہو تو نہ سہی"۔ سعد نے کہا، تم نے انصاف کی بات کہی، یہ کہا اور حربہ زمین میں گاڑ کر بیٹھ گیا، مصعب نے اسلام کی باتیں بیان کیں اور قرآن پڑھ کر سُنایا، تو سعد نے کہا: یہ سب باتیں کتنی حسین و جمیل ہیں۔ اس دین میں داخل ہونے کے لئے کیا کیا کرتے ہیں؟" انہوں نے کہا: "نہا دھو کر پاک کپڑے پہنو، شہادتِ حق کہو، اور نماز پڑھو۔" سعدؓ نے یہ سب کچھ کیا اور مسلمانوں میں شامل ہو گئے۔ سعد کے بعد اُسیدؔ بھی اسلام لائے اور ان دونوں سرداروں کی تلقین سے بنو الاشہل کا

سارا قبیلہ مسلمان ہو گیا۔ نہ صرف یہ قبیلہ، بلکہ انصار کے تقریباً سارے قبیلے بتدریج مسلمان ہو گئے۔

اگلے دن انصارِ مدینہ میں سے ۷۳ مسلمان اور کچھ غیر مسلم حج کے موقع پر مکّے آئے۔ اِس دفعہ بھی عَقبہ ہی میں رسولُ اللہ ان سے ملے، آپؐ نے قرآن پڑھا اُنہیں اللہ کی طرف بُلایا، اسلام کی ترغیب دی اور کہا: "میں تمہاری بیعت لیتا ہوں اس پر کہ تم میری حفاظت دُشمنوں سے اُسی طرح کرو گے، جس طرح اپنے اہل و عیال کی کرتے ہو۔" انصار کے ایک سردار نے بیعت کے لئے آپ کا ہاتھ پکڑا، اور اقرار کیا۔ ایک دُوسرے سردار نے کہا: "اس کے بعد ہمارے اور یہود کے تعلّقات تو منقطع ہو جائیں گے، ایسا نہ ہو کہ جب آپ کو غلبہ حاصل ہو جائے تو آپ ہم کو چھوڑ کر اپنی قوم کے پاس واپس چلے جائیں۔" آپؐ نے فرمایا: "ایسا نہیں ہوگا بلکہ میری حرمت تمہاری حرمت اور تمہارا خون میرا خون ہے۔ تم مجھ سے ہو، میں تم سے ہوں۔ جس سے تم لڑو، میں لڑوں گا، جس سے تمہاری صلح ہو گی، میری بھی ہو گی۔"

جب قریش کو ان واقعات کی خبر لگی تو ان کے غیظ و غضب کی کوئی انتہا نہ رہی اور انہوں نے مسلمانوں کی ایذارسانی میں بہت جوش و خروش کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ بیعتِ عَقبہ تک حضورؐ پر جنگ کا حکم نازل نہ ہوا تھا۔ آپ کو صرف یہ حکم تھا کہ لوگوں کو اللہ کی طرف بلائیں۔ اذیّت پر صبر کریں، جاہل کو معافی دیں، مگر قریش کی زیادتیوں کی کوئی حد نہ رہی، انہوں نے لوگوں کے لئے اسلام پر قائم رہنا دشوار کر دیا۔ مسلمان یا اپنے دین کی وجہ سے ابتلا میں تھے۔ یا کفّار کے ہاتھوں میں عذاب پا رہے تھے، یا وطن چھوڑ کر ارضِ حبشہ میں یا مدینے میں، یا جہاں پناہ ملتی تھی بھاگ جانے پر مجبور تھے۔ غرض

جب قریش کی زیادتیاں یہاں تک پہنچ گئیں، تو حضورؐ کو اذنِ قتال ملا۔ اس اذن کے ملنے اور انصار کے اسلام لانے کے بعد آپؐ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ مکّے سے مدینے کو ہجرت کر جائیں۔ اور اپنے انصار بھائیوں کے پاس پہنچیں۔ مسلمان تھوڑی تھوڑی تعداد میں جانے لگے اور آپ خود اس بارے میں اذنِ ربّی کا انتظار کرنے لگے۔ مہاجرین جا چکے تھے۔ اب صرف حضرت علیؓ اور حضرت ابوبکرؓ مکّے میں رہ گئے تھے۔ ہاں کچھ مسلمان قریش کے پاس قید تھے۔ اور کچھ ایسے تھے جو دین کے بارے میں ابتلا میں گرفتار تھے۔ لوگوں کی کچھ امانتیں آنحضرتؐ کے پاس تھیں، انہیں واپس کرنے کے لئے آپؐ نے حضرت علیؓ کو مکّے میں چھوڑا، اور اذنِ الٰہی ملتے ہی آنحضرتؐ بھی حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر مدینے کی طرف روانہ ہوئے۔ یہی وہ ہجرت ہے جس سے سالِ ہجری شروع ہوتا ہے اور جو تاریخِ اسلام میں سنگِ میل کا حکم رکھتا ہے۔

دعوتِ اسلام کے متعلق ہجرت کے بعد مدینے میں کیا ہوا؟ اس کا حال انشاء اللہ آپ کل کی تقریر میں سنیں گے۔

(۴)

کل ہم نے ہجرت رسولؐ اللہ تک کے حالات بیان کئے تھے۔ گرمی کے دن تھے کہ آنحضرتؐ ابوبکرؓ کو ساتھ لئے مدینے پہنچے۔ حضرت علیؓ بھی تین دن کے بعد امانتیں دے کر مدینے میں آ گئے۔ مدینے پہنچنے پر رسولؐ اللہ نے مسجد بنانے کا حکم دیا۔ یہ مسجد کچّی اینٹوں کی بنی تھی۔ چھت پر کھجور کی ٹہنیاں ڈالی گئی تھیں اور اس کے ستون کھجور کی لکڑی کے تھے۔ مسلمانوں کو تعمیرِ مسجد کے کام میں ترغیب دلانے کے لئے آنحضرتؐ خود بھی اس میں اپنے ہاتھ سے کام کرتے رہے۔ جب تک مسجد اور

مکانات زیرِ تعمیر تھے، آپؐ حضرت ایوب انصاری کے مکان میں ٹھہرے رہے۔ یہ ایوبؓ وہی ہیں جو بعد میں غزوۂ قسطنطنیہ میں فوت ہوئے اور جن کا مقبرہ وہیں کی ایک مشہور زیارت گاہ ہے، ربیع الاوّل میں آپ مدینے تشریف لائے تھے۔ اگلے سال کے صفر یعنی تقریباً دس مہینے کے بعد مسجد اور گھر تیار ہو گئے۔ اور اس عرصے میں انصارِ مدینہ سب مسلمان ہو چکے تھے۔ صرف بنو اوس کے ایک قبیلے کے چند لوگ بدستور شرک پر قائم تھے۔

ابنِ ہشام نے حضورؐ کا پہلا خطبہ اور ایک اور خطبہ اپنی کتاب میں درج کیا ہے، پہلے کی ایک عبارت کا مضمون یہ ہے :-

حاضرین سے خطاب کر کے آپؐ نے فرمایا: "تم میں سے ایک شخص بجلی کے گرنے سے ہلاک ہو جاتا ہے اور اپنے ریوڑ کو بغیر داعی کے چھوڑ جاتا ہے۔ اس کا ربّ اس سے بلا ترجمان و حاجب کہتا ہے: کیا میرا رسولؐ تیرے پاس نہیں آیا، اور اس نے تجھے تبلیغ نہیں کی؟" "میں نے تجھے مال دیا، تجھ پر فضل کیا، تُو نے اپنی اگلی زندگی کے لئے کیا زاد بنا کر بھیجا؟" وہ شخص دائیں بائیں دیکھے گا اور اسے کچھ نظر نہ آئے گا پھر وہ سامنے دیکھے گا تو سوا جہنّم کے اسے کچھ نظر نہ آئے گا، تو جس کسی کو اپنے مُنہ کو دوزخ کی آگ سے بچانے کی استطاعت ہو، وہ بچائے۔ خواہ آدھی کھجور کے ذریعے ہی کیوں نہ ہو اور جسے اتنا بھی بہم نہ پہنچے تو کلمۂ طیّبہ ہی سہی۔"

رسولؐ اللہ کے ورودِ مدینہ کے سترھویں ماہ کے آغاز میں تحویلِ قبلہ کا حکم آیا اس سے پہلے شام کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھی جاتی تھی۔ اب سے کعبے کی طرف نماز پڑھی جانے لگی۔ آنحضرتؐ نے یہود کو بھی اسلام کی دعوت دی اور اسلام کی

طرف راغب کیا اور عذاب اللہ سے ڈرایا، ایک موقع پر ان میں سے دو نے کہا:
"نہیں صاحب، ہم تو اپنے باپ دادا کے دین کی پیروی کریں گے، وہ ہم سے زیادہ جاننے والے اور ہم سے زیادہ نیک تھے"۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی ۔

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَیْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْــًٔا وَّلَا یَهْتَدُوْنَ

"اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ جو (حکم) خدا نے اتارا ہے اس پر چلو، تو جواب دیتے ہیں، نہیں جی! ہم تو اسی (طریقے) پر چلیں گے، جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو (چلتے ہوئے) پایا۔ بھلا اگر ان کے باپ دادا کچھ بھی نہ سمجھتے اور نہ راہِ راست پر چلتے رہے ہوں تو بھی؟"

غرض جس طرح قریشِ مکہ نے اشاعتِ اسلام کے راستے میں ہر طرح کی رُکاوٹیں پیدا کیں، یہودِ مدینہ نے بھی بہت سی مشکلات مسلمانوں کے لئے پیدا کیں۔ کبھی انصار میں پھوٹ ڈلوانے کی کوشش کی، کبھی اصحاب کو راہِ حق میں خرچ کرنے سے منع کیا اور انہیں فقر سے ڈرایا، کبھی انکارِ حق کیا، کبھی موسیٰؑ کے بعد تنزیل سے انکار کیا۔ کبھی حضرت عیسیٰؑ کی نبوت سے منکر ہوئے۔ ایک دفعہ حضورؐ پر ایک مکان کی چھت سے پتھر گرانے کی سازش کی۔ اور اُلٹے سیدھے سوال تو وہ آئے دن کرتے ہی رہتے تھے۔

تحویلِ قبلہ کے حکم کے بعد کعبہ مسلمانوں کی مذہبی زندگی کا مرکز بن گیا۔ ایک خدا ایک قبلہ، ایک دین، یہ وہ عقیدہ تھا جو عرب و عجم کو ایک مرکز پر جمع کرنے والا تھا۔

چنانچہ سنہ ۶ھ میں رؤسا و ملوک زمانہ کو اس دین کی دعوت عام دی گئی۔ تاریخ کی کتابوں میں کوئی دو ڈھائی سو خط ایسے محفوظ ہیں جو آنحضرتؐ نے مختلف قبائلی شیوخ،

متوسط بجاتی افسروں اور ہمسایہ حکمرانوں کے نام تحریر فرمائے تھے۔ نمونے کے طور پر ایک خط کا ترجمہ ملاحظہ ہو، جو آپؐ نے نجاشی بادشاہِ حبشہ کے نام لکھا تھا، اور جو ابنِ اسحٰق کی سند پر بیہقی نے محفوظ کیا ہے:

"یہ خط محمد النبی کی طرف سے نجاشی اصحم سردارِ حبشہ کے نام ہے۔ سلامتی اس پر ہو جو ہدایت کا پیرو بنے اور اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ سوا اللہ کے کوئی معبود نہیں، وہ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ نہ اس کی بیوی ہے نہ بچہ اور اس پر بھی، کہ محمد اس کا بندہ اور رسول ہے۔ میں تجھے اسلام کی طرف بلاتا ہوں، اس لیے کہ میں اس کا رسول ہوں، پس اسلام لا! تو سلامت رہے گا۔ قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ۔ (ترجمہ:- اے اہلِ کتاب! ایک ایسی بات کی طرف آؤ، جو ہم اور تم دونوں میں برابر ہے، یہ کہ ہم سوا اللہ کے کسی کی عبادت نہ کریں، نہ اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک کریں، نہ اللہ کو چھوڑ کر ہم میں سے کوئی کسی کو رب بنائے پس اگر وہ منہ موڑ لیں، تو کہہ دو کہ تم اس بات کے گواہ رہو کہ ہم تو (خدا کے) فرمانبردار ہیں، پس اگر تو انکار کرے تو تیری قوم کے نصرانیوں کا گناہ تیری گردن پر ہوگا۔"

اس کے بعد مہر ہے، جس کے الفاظ ہیں: "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ۔"

بظاہر، اور مکتوب بھی اسی طرز کے تھے۔ ان مکاتیبِ مبارکہ کے نتائج کی تفصیل کا یہ مقام نہیں۔ مختصر یہ کہ نجاشی شاہِ حبشہ نے اسلام قبول کیا، مگر شاہِ ایران نے خط کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ جسے سن کر آپؐ نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ اسی طرح اس کی بادشاہت

کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا" اور یوں ہی ہوا۔ مصر کے مقوقس نے قاصد کا اکرام کیا اور خط کا جواب تہذیب سے دیا۔ قیصر روم نے تجارِ مکہ سے، جن کا سرکردہ ابو سفیان تھا، آپؐ کے حالات دریافت کئے اور کہا: "اگر میرے لئے ممکن ہوتا تو میں جا کر اُن کے پاؤں دھوتا"۔ غرض ان مکاتیب سے اسلام کا پیغام نزدیک و دُور کو پہنچایا گیا۔۔۔ اس لئے کہ آپؐ کو رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اور ذکر و قرآنِ مبین میں جو آپ پر نازل ہوا تھا اسے نازل کرنے سے مقصود یہ تھا کہ جو زندہ ہے، اُسے عذابِ خدا سے ڈرایا جائے، اور منکروں پر حجتِ الٰہی قائم کی جائے؛ اس لئے لازم تھا کہ پیغامِ الٰہی سب تک پہنچایا جائے۔

اسلام کی اشاعتِ عام کا نتیجہ یہ نکلا کہ عرب، جو لاتعداد قبائل اور گروہوں میں تقسیم تھے۔ اور جاہلیت میں قومِ عرب کے مفہوم تک کے سمجھنے سے قاصر تھے ایک مذہب کے پیرو بن گئے۔ اور اس مذہب نے انہیں متحد کر دیا۔ آنحضرتؐ نے نہ صرف ان کے دینی، بلکہ دنیاوی امور کی سربراہی کی اور ان کی دین و دُنیا کی بہبود کا سامان بہم پہنچا دیا۔ شعوب اور قبیلے تو باقی رہے، مگر یہ شعوب و قبائل میں قوم کی تقسیم کا مقصد اب یہ سمجھا گیا کہ "ایک دُوسرے کے پہچاننے میں مدد ملے"۔ نہ یہ کہ اس سے کسی کا مرتبہ متعین ہو سکے۔ اس لئے کہ اب سب مسلمان برابر تھے۔ اور اللہ کے نزدیک ان میں سے اکرم وہ تھا جو زیادہ تقوےٰ رکھتا تھا۔ یعنی بالفاظِ دیگر، اب سے شعوب و قبائل کا تصوّر اتحادِ مذہبی کے تصوّر کے مقابلے میں ایک جزئی اور ثانوی حیثیت رکھنے لگا۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ باہمی چپقلش جو صدیوں سے قبائل میں چل رہی تھی، اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ حضورؐ کے انتقال فرمانے سے پہلے عربستان کے اکثر حصے

میں امن وامان قائم ہوگیا۔ قوم عرب اب اپنے آپ کو ایک قوم سمجھنے لگی اور کلمۂ عرب کا نیا مفہوم پیدا ہوا، یعنی وہ مفہوم جو آج اِس کلمے سے ہمارے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ نتیجہ تھا اس تبلیغ کا، اس دعوتِ اسلام کا، جس کی آواز آپؐ نے ملکِ عرب کے گوشے گوشے میں پہنچائی۔ اِسلام کا مدینے میں اس عظیم الشان کامیابی کے ساتھ قائم ہوجانا قریش کو کب گوارا ہو سکتا تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کا پیچھا تو کیا، مگر مسلمانوں نے بھی اُن کا خُوب خُوب مقابلہ کیا، تا آنکہ ۱۰ رمضان ۸ھ کو مسلمانوں کی فوج مکّے کی جانب بڑھی اور ابوسفیان نے عاجز آکر آپؐ سے امان چاہی اور مسلمان بے روک ٹوک مکّے میں داخل ہوئے۔ اور آپؐ نے اپنے اُن مخالفوں کو عام معافی دے دی جنہوں نے آپ کی مخالفت آغازِ بعثت سے اب تک ہر قدم پر کی تھی اور ان سے کہا۔

"لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ" (اب تم پر کچھ الزام نہیں)

مخالفوں میں سے جو لوگ اب تک ایمان نہ لائے تھے، وہ بھی اس حسنِ سلوک سے ایسے متاثر ہوئے کہ ایمان لائے۔ اور انہوں کے ایمان کو تقویتِ مزید حاصل ہوئی۔

یہ مختصر سا حال تھا۔ اس دعوت وتبلیغ کا جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے ہاتھوں مدینے میں پہنچنے سے فتح مکّہ تک سرانجام پائی تھی۔ اگلی تقریر میں اسی دعوت وتبلیغ کے کچھ اور پہلوؤں کا تذکرہ کریں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ!

(۵)

کل فتحِ مکّہ تک کے حالات بیان ہوئے تھے۔ اور اُس عظیم الشان تبدیلی کا ذکر ہُوا تھا، جو اسلام لانے کے بعد عربوں میں پیدا ہوئی تھی۔ مولانا حالی کا یہ کہنا، کہ آنحضرتؐ کی تبلیغ نے عربوں کی کایا پلٹ دی تھی۔ ایک حقیقتِ حقہ ہے۔ اِس لئے

کہ اسلام نے یہی نہیں کیا کہ چند وحشیانہ اور خلافِ انسانیت رسوم و رواج میں تبدیلیاں کردیں بلکہ عربوں کی ذہنیت بدل دی، ان کا مطمحِ نظر بدل دیا؛ ان کی زندگی کا تخیل بدل دیا۔ مثلاً اسلامی اخوت و مساوات کو لیجئے کہ اس میں گورے کالے، عرب و عجم مال دار و مفلس کی تمیز نہیں اور اس میں نسلی تفوق اور امتیاز کو قطعاً تسلیم نہیں کیا گیا، بخلاف اس کے جاہلی عربوں کے نزدیک بزرگی اور عظمت موروثی تھی اور کابراً عن کابرٍ ہی کسی کو پہنچ سکتی تھی۔ اسی طرح بدی کے عوض بدی کرنا ان کا اصولِ زندگی تھا۔ اسلام نے اسے رد کیا اور کہا، " اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَۃَ " (بدی کا دفعیہ اس طور پر کرو جو بہت ہی اچھا ہو) اور کہا: اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ۔ عرب روحِ مذہب سے ناآشنا تھے اور خضوع و خشوع اور اپنے پروردگار کے حضور میں عجز و نیاز کے تخیل سے دُور تھے۔ امراءالقیس شاعرِ مشہور اور بنو کندہ کا شہزادہ تھا، بنو اسد نے اس کے باپ کو قتل کر دیا تھا۔ انتقام کی نیت سے اس نے لشکر کشی کی۔ تبالہ میں ایک بُت تھا۔ جسے ذوالخلصہ کہتے تھے۔ وہاں تین تیر رکھے رہتے تھے۔ ایک تیر کام کا حکم دیتا تھا، دُوسرا کام سے منع کرتا تھا، تیسرا انتظار کا حکم دیتا تھا۔ جب امراءالقیس اس بُت کے پاس پہنچا تو قاعدۂ مقررہ کے مطابق اُس نے بُت سے فیصلہ طلب کیا کہ انتقام کی مہم لے کر بڑھے یا نہ بڑھے، اور تیر نکالا، منع کرنے والا تیر نکلا۔ پھر نکالا تو پھر بھی وہی تیر نکلا۔ اور تیسری مرتبہ بھی۔ اس پر امراءالقیس نے طیش میں آ کر تیر بُت کے مُنہ پر دے مارا، اور گالی دے کر کہا: " اگر تیرا باپ قتل ہو جاتا تو تُو مجھے نہ روکتا۔" اس قصّے سے جاہلی عرب کی ذہنیت اپنے معبودوں کے متعلق ظاہر ہوتی ہے۔ اس کافرانہ ذہنیت کا اسلام نے قلع قمع کیا، دلوں میں خشیۃ اللہ اور نیازمندی کے جذبات پیدا کئے

عبودیت کا صحیح مفہوم لوگوں کو سمجھایا اور ایک نئی مذہبی روح ان میں پھونک دی۔ اس طرح وحدتِ ملّی کے جذبے سے انہیں سرشار کیا۔ اور ان میں ان حقوق و فرائض کی حس پیدا کی جو سوسائٹی کے افراد میں ایک دوسرے کے لئے لازم ہیں اور جن سے جاہلی عرب مطلق آشنا نہ تھے۔

دعوت و تبلیغ اسلام کی جو کوششیں حضورؐ نے کیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ مختلف قبائل کی طرف داعی بھیجے، جنہوں نے حضورؐ سے اسلام کی جزئیات سیکھ کر اپنے قبائل میں دین کی اشاعت کی، مثلاً مدینے کے داعی مُصعب بن عُمیر کی کامیاب مساعیِ اشاعت کا ذکر آپ پہلے سُن چکے ہیں۔ اب چند اور داعیوں کا حال سُنیے :-

ضِمام بن ثعلبہ کو بنو سعد بن بکر نے آپ کے پاس بھیجا۔ اسے اسلام کے بنیادی اصول و فرائض معلوم تھے۔ اس نے وہ آپؐ کے سامنے دُہرائے اور ان کی تصدیق کرائی۔ پھر کلمۂ شہادت پڑھ کر مسلمان ہوا اور کہا: میں عنقریب یہ فرائض ادا کروں گا اور جن باتوں سے آپ نے منع کیا ہے ان سے مجتنب رہوں گا۔ انہیں نہ کم کروں گا، نہ زیادہ اور وہ واپس ہوا تو آپؐ نے فرمایا کہ "اگر یہ سچ کہتا ہے، تو جنت میں داخل ہو گیا۔" جب وہ اپنے قبیلے میں پہنچا تو پہلی بات ان سے یہ کہی، کہ: لات و عُزّیٰ کی ایسی تیسی"۔ جب لوگوں نے کہا: "چُپ اے ضِمام! برص سے ڈر، جذام سے ڈر، جنون سے ڈر!" ضِمام نے کہا: "واللہ، لات و عُزّیٰ نہ نفع پہنچا سکتے ہیں، نہ ضرر۔ خدا نے ایک رسُول بھیجا ہے، اس پر کتاب نازل کی ہے، جو تمہیں تمہاری خرابیوں سے نجات دلاتی ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ ایک اللہ کے سوا کوئی معبود

نہیں اور یہ کہ محمد اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں، میں انہیں کے پاس سے آیا ہوں اور شائستہ و ناشائستہ کی تفصیل لایا ہوں۔ غرض شام سے پہلے پہلے اس مقام کا ہر زن و مرد مسلمان ہو گیا۔ (ابن ہشام صہ ۹۴۳، ۹۴۴)

عمرو بن مُرّہ جُہَنی اپنے قبیلے کے بت کا پجاری تھا۔ جب آنحضرت کی بعثت کی خبر اسے ملی تو بُت کو توڑ کر مدینے پہنچا، اسلام لایا کلمہ تشہد پڑھا اور حلال و حرام کے متعلق جو احکام آپ لائے تھے۔ ان پر ایمان لایا اور صحبتِ پاک میں رہنے کے بعد آپ کے حکم سے اپنی قوم کی طرف اسلام کا پیغام لے کر گیا۔ چنانچہ ایک آدمی کے سوا سارا قبیلۂ جُہَینہ اسلام لے آیا۔

مکے سے جنوب کی جانب کے مقامات کی طرف دعوتِ اسلام ذرا دیر میں پہنچی۔ اس لئے کہ قریش کی جنگوں کی وجہ سے یمن اور اس طرف کے دیگر علاقوں کے ساتھ آمد و رفت محدود ہو چکی تھی۔ مگر حضور ابھی مکے ہی میں تھے کہ دوس قبیلے کے طُفیل بن عمرو مکے میں آئے۔ قریش نے انہیں روکا اور کہا کہ "آپ کی بات نہ سُننا اور آپ سے بات نہ کرنا، آپ کی بات جادو کا اثر رکھتی ہے، اور باپ بیٹے، بھائی بھائی، شوہر اور بیوی میں تفرقہ پیدا کر دیتی ہے۔ تم ان سے ملے تو تمہارے قبیلے کا بھی وہی حال ہو گا، جو ہمارے قبیلے کا ہوا۔" طفیل ان کے کہنے میں آ گیا اور ارادہ کر لیا کہ آپ کی بات نہ سُنے گا اور اس مطلب کے لیے کانوں میں روئی دے کر گھر سے نکلا۔ اتفاق سے وہ کعبے کی طرف جا نکلا اور آپ کی کچھ باتیں روئی کے باوجود اس نے سُن لیں اور انہیں پسند کیا اور اپنے جی میں کہا: "میں ہوشمند شاعر ہوں اور اچھی بُری بات میں تمیز کر سکتا ہوں، میں آپ کی بات کیوں نہ سُنوں، اگر آپ نے اچھی بات کہی تو مان لوں گا، نہیں تو اسے

چھوڑ دوں گا۔" اس ارادے سے وہ آپؐ کے گھر پہنچا اور آپ سے درخواست کی کہ اسے بھی ساری بات سمجھائیں۔

رسول اللہ نے اسلام اُس کے سامنے پیش کیا اور قرآن سنایا۔ طفیل کہتا ہے کہ "میں نے اپنی عمر میں ان کی باتوں سے زیادہ اچھی اور انصاف کی باتیں کبھی نہیں سنی تھیں۔" وہ ایمان لایا اور تشہد پڑھا اور عرض کیا کہ "میں اب جا کر اپنی قوم کو اسلام کی طرف بلاتا ہوں"۔ اپنے قبیلے میں جا کر اس نے اپنے گھر کے سب لوگوں کو مسلمان کیا، پھر اپنی قوم کو اسلام کی دعوت دی، مگر انہوں نے تامل کا اظہار کیا۔ اس پر طفیل آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور کہا: "اے نبی اللہ آپ دوس کے حق میں بد دعا کریں۔" آپ نے دعا کی، اور کہا: اے اللہ دوس کو ہدایت دے"۔ پھر اُن سے کہا: "اپنی قوم کی طرف لوٹ جاؤ، انہیں اسلام کی دعوت دو اور اُن سے نرمی کے ساتھ پیش آؤ۔" طفیل اپنی قوم کے پاس واپس گئے اور انہیں مسلسل دین کی طرف بلاتے رہے، تاآنکہ آپ ہجرت کے بعد مدینے میں تشریف لے آئے۔ پھر بدر، اُحد اور خندق کی لڑائیاں ہوئیں۔ اس کے بعد طفیل اپنے قبیلے کے مسلمانوں کو ساتھ لے کر مدینے پہنچے، یہ ستر اسّی گھرانے تھے۔ آنحضرتؐ اُس وقت خیبر میں تھے۔ طفیل انہیں لے کر خیبر گئے اور وہاں انہیں حضورؐ کی خدمت میں پیش کیا، اس کے بعد طفیل حضورؐ کی خدمت میں حاضر رہے۔

۹ھ میں جو عام الوفود کہلاتا ہے، بنو کلاب کا ایک وفد آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ: "ضحاک بن سفیان ہمارے درمیان کتاب اللہ اور آپؐ کی سُنّت پر عمل پیرا رہا، اُس نے ہمیں اللہ کی طرف بلایا۔ اُس کی دعوت پر ہم نے اللہ اور اُس

کے رسولؐ کو قبول کیا۔ اس نے ہمارے مال داروں سے صدقہ لیا اور ہمارے فقراء میں تقسیم کیا۔"

یہ چند داعیوں کا ذکر ہے۔ جنہوں نے حضورؐ کی صحبت سے فیض پاکر ہر طرف اسلام کا پیغام پہنچایا اور حضورؐ کی اپنی اور حضورؐ کے تیار کردہ داعیوں کی کوششوں سے وہ خاصانِ اُمّت تیار ہوئے جنہوں نے اپنے ماضی کو خیرباد کہا، نئی ذہنیت اختیار کی، نئے تأثرات اپنے اندر پیدا کئے۔ ایک نیا نقطۂ نظر، ایک نیا تخیلِ حیات قبول کیا، اور پورے جوش و خروش کے ساتھ اور اپنی زندگی سے بے پروا ہوکر اس مشعلِ ہدایت کو ہمراہ لے کر نکلے اور اقطاعِ عالم کو اس کے نور سے منوّر کردیا، انہیں کے ذریعے وہ بے مثال مدبّر، وہ قائد، وہ علما، وہ فقہا، وجود میں آئے جنہوں نے آپؐ کی مقدّس تعلیمات کو مشکل سے مشکل اوقات میں اپنا معمول بنائے رکھا اور دُنیا کو بتا دیا کہ اس معلّمِ پاکؐ کی تعلیمِ حق نے کس طرح سے مس کو کندن بنا دیا، اور ثابت کردیا کہ قرآن ان کے سینے میں محفوظ تھا۔ رسولؐ اللہ کی ہر قولی اور فعلی سُنّت، اطاعت اور پیروی کی غرض سے ان کے پیشِ نظر تھی، دُنیا کی مذہبی تاریخ، دعوت و تبلیغ کی اتنی بڑی کامیابی کی مثال پیدا کرنے سے قاصر ہے۔

آپؐ نے دعوت و تبلیغِ اسلام کی ایک مختصر سی روداد سُنی، جو اسلام کے دورِ اوّل سے تعلق رکھتی ہے، جو زندہ مثال حضورؐ کی اپنی مساعیِ تبلیغ نے پیش کی، وہ آپؐ کی اُمّت کے داعیوں کیلئے بعد کی صدیوں میں مشعلِ راہ کا کام دیتی رہی۔ اُن کے لیے اس میں نہایت قیمتی اسباق اور ارشادات تھے۔ انہیں کی روشنی میں انہوں نے آپؐ کا پیغام چار دانگِ عالم میں پہنچایا۔ بعد کی صدیوں کی تاریخ دعوت و تبلیغ

کے لئے کوئی اور فرصت درکار ہے۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ۔

پنجاب میں اسلام کیسے پھیلا؟

فتوحاتِ اسلامیہ کے مؤرّخ بلاذری کا بیان ہے کہ امیر معاویہؓ کے عہد میں مُہلّب بن ابی صُفرہ نے ۴۴ھ میں ہندوستان کی سرحد پر حملہ کیا اور وہ بنّہ اور لاہور تک پہنچا، جو ملتان اور کابل کے درمیان ہیں۔ گمان ہوتا ہے کہ ان مقامات سے بنّوں اور لاہور مراد ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو گویا کہ اسلام سب سے پہلے خشکی کے راستے سے اس زمانے میں پنجاب پہنچے۔ اس کے بعد حجّاج بن یوسف نے خلیفہ ولید بن عبدالملک (۸۶ھ تا ۹۶ھ) کے زمانے میں اپنے نوجوان چچیرے بھائی محمّد بن قاسم کی سرکردگی میں سندھ کو ایک مہم بھیجی۔ محمد نواحی سیستان سے مُلکِ سندھ میں داخل ہوا، اور برہمنوا اور مولستان یعنی برہمن آباد اور ملتان کو فتح کیا۔ البیرونی نے، جو پنجاب میں ایک عرصہ مقیم رہا، ہمیں یہ قیمتی اطلاع دی ہے کہ محمّد بن قاسم کی فتوحات کا سلسلہ سندھ کے بعد ایک طرف شہر کنوج تک پہنچا اور دوسری طرف اس نے سرزمین گندھارا کو روند ڈالا۔ واپسی میں محمد بن قاسم نے حدودِ کشمیر کو بھی پے سپر کیا۔ پنجاب اور سندھ میں پہلی اسلامی حکومت اس وقت قائم ہوئی۔ ان واقعات کے اعتبار سے پنجاب میں اسلام کا ظہور تو پہلی صدی ہجری کے نصفِ اوّل میں ہوا، مگر اسلام کو مزید تقویت پہلی صدی کے آخر میں حاصل ہوئی۔ بیرونی ہی نے ہمیں بتایا ہے کہ محمد بن قاسم نے بعض مقامات کو جنگ سے اور بعض کو صلح سے لیا۔ لیکن اہلِ سندھ و ہند کو اپنے مذہب پر قائم رہنے دیا۔ سوا اُن لوگوں کے، جنہوں

نے خود اسلام قبول کرنا چاہا۔

بیرونی نے لکھا ہے کہ ملتان میں ہندوؤں کے سورج دیوتا کا لکڑی کا بُت تھا، جسے آدتیہ کہتے تھے۔ ہر طرف سے لوگ اس کے درشن کو آتے تھے، نذریں مانتے اور چڑھاوے لاتے تھے۔ ان محاصل سے ملتان ایک آباد اور دولت مند شہر بن گیا تھا۔ گو مسعودی نے اس کی خوشحالی کی ایک یہ وجہ بھی بتائی ہے، کہ ملتان ایک تجارتی شاہراہ پر واقع تھا۔ عرب تاجر چین اور لنکا کا مال سندھ کی بندرگاہوں پر اتارتے تھے اور ملتان کے راستے سے اس مال کو خراسان اور ترکستان تک لے جاتے تھے۔

محمد بن قاسم نے ملتان اور اس کے بُت خانے کو بحال رہنے دیا، مگر وہیں ایک جامع مسجد بھی بنوا دی۔ پہلی صدی ہجری کے آخر یعنی ۹۹ھ میں خلیفہ عمر بن عبدالعزیز تخت نشین ہوئے تو انہوں نے ملوکِ سندھ کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ عرب جغرافی ملتان کو سندھ میں شامل سمجھتے تھے۔ ان ملوک نے اسلام قبول کیا اور انہوں نے عربی نام رکھ لئے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ تیسری صدی ہجری میں خلافتِ عباسیہ کے ضعف و انتشار کی وجہ سے سندھ اور ملتان میں عام طور پر مسلمانوں کے سیاسی حالات بہت مضبوط نہ تھے اور طوائف الملوکی پھیل چکی تھی۔ چوتھی صدی میں ابن حوقل لکھتا ہے کہ ملتان اور منصورہ میں ایک قریشی متغلب کی حکومت ہے جس کا جد ہبّار بن الاسود قریشی تھا۔ اور جو بنو سامہ بن لوئی بن غالب میں سے ہے۔ اہلِ ہند نے کئی بار اس ہبّاری متغلب امیر پر چڑھائی کی اور چاہا کہ ادتیہ والے بُت کو چھین لیں۔ مگر ہبّاری امیر بُت کو توڑ دینے اور جلا دینے کی دھمکی دیتا رہا۔ اس لئے وہ واپس

لوٹ جاتے رہے۔ یہ نہ ہوتا تو وہ ملتان کو ویران کر دیتے۔ اس بیان سے ملتان کی حکومت سیاسی کمزوری کا شکار معلوم ہوتی ہے۔ مگر دوسری طرف اسی سیّاح کے بیان کے مطابق ملتان میں دین کا کافی چرچا معلوم ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ملتان کے لوگ قرآن اور علم قرآن کی طرف راغب ہیں۔ سات قراءتوں سے قرآن پڑھتے ہیں۔ فقہ، ادب اور علم کا انہیں شوق ہے۔ وہ عربی اور سندھی بولتے ہیں۔

چوتھی صدی ہجری اسمٰعیلیوں کے عروج کا زمانہ ہے۔ چنانچہ المعزؒ لدین اللہ (۳۴۱ھ تا ۳۶۵ھ) مصر کے فاطمی خلیفہ کے ایک داعی حلیم بن شیبان نے ملتان پر قبضہ کر لیا اور ادتیہ بُت کو توڑ دیا۔ قرمطیوں نے بیرونی کے تخمینی اندازے کے مطابق ۳۳۲ھ سے ۴۳۲ھ تک تقریباً سو سال ملتان میں حکومت کی۔ لیکن تاریخ فرشتہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم چوتھی صدی کے نصف ثانی میں ملتان شاہی راجہ جے پال کے اقتدار کے ماتحت تھا۔ اس لئے کہ بقولِ فرشتہ شیخ حمید لودھی نے راجہ جے پال سے لمغان و ملتان کی حکومت پائی اور سبکتگینؒ اور محمودؒ کے حملوں کے وقت جیپال کو مدد پہنچائی۔ ان حالات کے باوجود پشتو کی کتاب "پٹہ خزانہ" میں ساتویں صدی ہجری کے ایک مصنف کا قول نقل ہوا ہے کہ شیخ حمید نے اپنے بھتیجے شیخ رضی لودھی کو پشتو بولنے والے کوہستانیوں میں بھیجا اور بہت لوگ اس کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔

چوتھی صدی کے آخر اور پانچویں صدی کی ابتدا میں غزنوی دور کے شروع ہونے کے بعد پنجاب میں نشر و اشاعت اسلام کا کام زور شور سے ہونے لگا۔

مبلّغان اسلام میں سے فضلِ تقدم شیخ اسمٰعیل کو ہے جو سادات بخارا میں سے تھے اور حدیث و تفسیر کے بلند مرتبہ عالم تھے۔ ۳۹۳ھ میں راجہ جے پال والیِ لاہور

مر گیا اور سلطان محمود غزنوی نے اسی سال بھٹنڈہ کے راجہ کو شکست دی تو پنجاب میں مسلمانوں کی آمد و رفت کا راستہ کھل گیا۔ چنانچہ شیخ اسمٰعیل ۳۹۵ھ کے آخر میں لاہور آئے۔ "تذکرہ علمائے ہند" میں ہے کہ وہ پہلے بزرگ تھے۔ جنہوں نے لاہور میں حدیث و تفسیر کا درس دیا، اسی کتاب میں ہے کہ بے شمار غیر مسلم ان کی مجالس وعظ میں مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ یہ بزرگ ۴۴۸ھ میں لاہور ہی میں فوت ہوئے۔ ان کی زندگی میں غزنویوں کا پورا تسلّط پنجاب پر ہو گیا۔ بقولِ فرشتہ ۴۴۳ھ میں غزنویوں کے مقرر کردہ گورنر نے لاہور میں ایک پختہ قلعہ بنوایا۔ لاہور کے اسی دور کی ایک مسجد حبشی کا ذکر فخر الدین مبارک شاہ نے کیا ہے۔

جن بزرگوں نے شمالی پنجاب میں اسلام کو پھیلایا، ان میں شیخ فخر الدین زنجانی بھی ہیں۔ جو شیخ سعد الدین حموی کے پیر تھے اور لاہور میں مدفون ہیں۔ اور انہیں بزرگوں میں حضرت علی بن عثمان ہجویری، داتا گنج بخش ہیں، جو شام سے ترکستان تک کے مشائخ کی صحبت سے فیض یاب ہو کر لاہور میں مقیم ہوئے اور دن میں درس و تدریس اور شب کو تذکیر و تلقین میں مصروف رہ کر دینِ اسلام اور علم دین کی تبلیغ و اشاعت میں منہمک رہے اور لاہور ہی میں ۴۶۵ھ کے بعد ان کا وصال ہوا، اور لاہور ہی میں وہ مدفون ہیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ اُس زمانے میں مبلّغین اسلام کا کام کس قدر دشوار تھا؟ جناب ہجویری جو "کشف المحجوب" میں دُکھ بھرے الفاظ میں لکھتے ہیں:۔

"اِس وقت میں دیارِ ہند میں شہر لاہور میں، جو ملتان کے مضافات میں سے ہے، ناجنسوں کے درمیان گرفتار ہوں۔"

تو بات کیا تھی؟ اصل بات یہ تھی کہ یہاں کے لوگ ان مبلّغوں سے انتہائی اختلاف

رکھتے تھے۔ ان کی زبان اہلِ ملک سے مختلف، ان کا دین بالکل مختلف، غیروں کو یہاں والے ملیچھ کہتے تھے۔ ان سے میل جول، شادی بیاہ، قربت، ہم نشینی، کھانا پینا، سب کو ناجائز سمجھتے تھے۔ مسلمانوں سے رسم و عادت میں ان کا اختلاف اس حد تک تھا کہ (بقول بیرونی) وہ اپنے بچوں کو ان سے، ان کے لباس سے، ان کی شکل و صورت سے ڈرایا کرتے تھے۔ پھر جب عربوں نے سندھ اور پنجاب کو فتح کیا اور ان کے بعد غزنویوں نے ان علاقوں اور ہندوستان کے بعض حصوں کو فتح کیا تو مذہبی منافرت، اور بُعد کے ساتھ سیاسی منافرت اور بُعد بھی شامل ہو گئے۔ اس پر طرّہ یہ کہ بیرونی کے قول کے مطابق یہاں والے یقین رکھتے تھے کہ دُنیا میں ملک انہیں کا ملک، لوگ انہیں کے جنس کے لوگ، بادشاہ انہیں کے بادشاہ، دین انہیں کا دین اور علم انہیں کا علم ہے۔ باقی دُنیا میں نہ کوئی ملک قابلِ ذکر ہے، نہ کوئی علم۔ اگر ان سے کہا جاتا تھا کہ خراسان یا فارس میں علم یا عالم ہیں تو وہ راوی کو بیوقوف سمجھتے تھے۔

بہر حال ہزار ستائش کے لائق ہیں وہ پاک لوگ جنہوں نے ایسے گریزپا لوگوں میں رہ کر انہیں اسلام کا پیغام پہنچایا۔ اپنے کامل ایمان، مضبوط یقین، راسخ عزم اور ظاہر و باطن کی پاکیزگی سے گمراہوں کو سیدھی راہ دکھائی اور ان کی نجات کا باعث بنے۔ اس اثنا میں ہر مخالفت کو توڑا، اور ہر خطرے کا مقابلہ کیا۔ خدا ان سے خوش ہو اور ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے!

چھٹی صدی میں غزنویوں نے سیاسی مجبوریوں کی وجہ سے غزنی کے علاوہ بتدریج لاہور کو دُوسرے دارالخلافہ کی حیثیت عطا کی، اور ۵۵۶ھ میں جب غوریوں نے غزنی کو ان سے چھینا تو انہوں نے لاہور کو اپنا مستقل دارالخلافہ بنا لیا۔ یہاں تک کہ ۵۸۲ھ

میں غوریوں نے لاہور کو بھی ان سے چھین لیا۔ ان حالات کا اثر دین اور علم دین کی اشاعت پر بھی پڑا۔ بہت سے فضلاء اور مشائخ افغانستان سے پنجاب میں آئے اور لاہور کو خصوصیت کے ساتھ مرکزِ علم و دین بنایا گیا۔ چنانچہ سمعانی نے لاہور کے دو محدثوں کا ذکر کیا ہے۔ جن میں سے ایک ۵۲۹ھ میں اور دوسرا ۵۴۰ھ میں فوت ہوا۔

چھٹی، ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری پنجاب میں اسلام کی اشاعت کے اعتبار سے نہایت اہم صدیاں ہیں۔ شیخ الاسلام بہاء الدین ابو محمد زکریا اور ان کے معاصر شیخ فرید الدین مسعود گنج شکر رحمہما اللہ، اور مخدوم جہانیاں اُچّی اور ان بزرگوں کے مرید اسی زمانے میں محوِ عمل تھے۔ ان کے دمِ پاک سے بہت سے مُردہ دل زندہ ہوئے اور پنجاب کے گوشے گوشے میں نورِ اسلام پھیلا۔

کوٹ کروڑ میں شیخ بہاء الدین زکریا ۵۷۸ھ میں پیدا ہوئے خراسان، بخارا اور مدینہ شریف میں علم حاصل کیا۔ پھر بغداد میں شیخ شہاب الدین سہروردی رح سے خرقۂ خلافت پا کر ملتان میں درس و ارشاد میں مصروف ہو گئے۔ اور ملتان ہی میں ۶۶۱ھ میں واصل بحق ہوئے۔ آپ پنجاب کے مشہور ترین اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ آپ کے مرید حسینی ہروی اپنی مثنوی "کنز الرموز" میں آپ کی جانِ پاک کو منبعِ صدق و یقین، آپ کے دلِ آگاہ کو رحمتِ عالم اور آپ کی استقامت کو پیغمبری استقامت بتاتے ہیں "سلسلۃ الذہب" میں میر محمد نوربخش نے لکھا ہے کہ:۔

"وہ ایسے مرشد تھے، جن سے بہت سے اولیاء اللہ کے سلسلے پھوٹتے ہیں۔ لوگوں کو کفر سے ایمان کی طرف، نافرمانی سے طاعت کی طرف

اور نفسانیت سے روحانیت کی طرف لانے میں وہ بڑی شان کے مالک تھے۔"

ان کے معاصر شیخ فرید الدین شکر گنج کا وصال ۶۶۴ھ میں ہوا۔ ان کے اور ان کے مریدوں کی سعیِ مشکور سے تمام پنجاب نورِ اسلام سے منور ہو گیا۔ پنجاب کی سولہ غیر مسلم قوموں نے ان کی تبلیغ سے اسلام قبول کیا۔ مثلاً سیال، جو پنجاب کے مغربی میدانی علاقے کی نہایت اہم اقوام میں سے ہیں اور غالباً پنوار راجپوت ہیں ان کا مورثِ اعلیٰ سیال پاکپٹن میں جناب بابا صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام لایا اور اس کی قوم نے بھی اسلام قبول کیا۔ سیال جھنگ، ملتان، شاہ پور، گجرات، ڈیرہ جات اور مظفر گڑھ کے ضلعوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔

سیالوں کی طرح ملتان کے بہرہ جاٹ بھی آپ ہی کے دستِ حق پرست پر ایمان لائے۔ اسی طرح اور قوموں کی روایات بھی یہی ہیں کہ باوا صاحبؒ نے ان کے اجداد کو مسلمان کیا۔

سید جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاں کے اجداد بخارا سے بھکر آئے اور وہاں سے اُچ میں جا بسے۔ مخدوم صاحب ۷۰۷ھ میں پیدا ہوئے، وہ علم و ولایت اور سیادت کے جامع تھے۔ کثرتِ سیاحت کی وجہ سے "جہان گشت" کہلائے۔ شیخ الاسلام رکن الدینؒ سے خرقہ پہنا، تغلق بادشاہ ان سے اعتقاد اور اخلاص سے پیش آتے تھے۔ آپ کا وصال ۷۸۵ھ میں ہوا۔ "فرہنگ قبائل و اقوام پنجاب و سرحد" کے مصنف نے لکھا ہے کہ ملتان کے نون جاٹوں کے اجداد حضرت مخدوم جہانیاں کے ہاتھ پر ایمان لائے۔ چنڑ جاٹوں کے متعلق بھی اسی کتاب میں یہی لکھا ہے

چنڑ تحصیل لودھراں ضلع ملتان اور بہاول پور میں رہتے ہیں۔ بہاول پور گزیٹیر (ص ۱۶۲) پر متعدد اقوام کی فہرست دی ہے، جنہوں نے مخدوم صاحب کی وجہ سے اسلام قبول کیا۔

سندھ اور پنجاب میں جا بجا ان بزرگوں کی بیٹھکیں ہیں۔ بیٹھک بابا فرید، بیٹھک مخدوم جہانیاں، وغیرہ وغیرہ۔ بظاہر یہ بیٹھکیں ان بزرگوں کے تبلیغی دوروں کی نشست گاہیں ہیں۔ اکثر ان کے آس پاس جال کے درخت ہیں، جنہیں عقیدت کی وجہ سے لوگ کاٹنے سے پرہیز کرتے ہیں۔

مغلوں کے زمانے میں جناب داود شیر گڑھی نے اہم تبلیغی کام سر انجام دیا۔ بدایونی جو ان کی خدمت میں حاضر ہوا لکھتا ہے کہ (۳۱-۳۴) "میں چار دن ان کی خدمت میں مقیم رہا۔ اور کم ہی کوئی دن تھا جس میں سو سو پچاس پچاس ہندو خیل و تبار سمیت اسلام نہ لائے" اس دور میں تبلیغی کوششوں نے علمی رنگ بھی اختیار کیا۔ اس زمانے میں دین کی تلقین کے لئے مدرسوں پر زور دیا گیا ہے، جنہیں اکثر حکومت کی مالی امداد حاصل تھی مثلاً مدرسہ جہانگیری میں لاہور میں دائی لاڈو کا مدرسہ مشہور تھا اور سیالکوٹ میں ملا عبد الحکیم کا مدرسہ۔ ملا صاحب کو شاہجہان نے سونے چاندی میں تلوایا تھا۔ اس مدرسے میں نہ صرف پنجاب، بلکہ بنگال، کشمیر، ایران، توران، بلکہ عراق و مصر تک کے طلبہ آتے تھے۔ عہد اورنگ زیب میں مدرسہ بٹالہ بھی ایک مشہور مدرسہ تھا۔ یہ مدارس دینی اور دنیوی علوم کے مرکز تھے اور ان میں ذہنی تربیت کے ساتھ اخلاقی تربیت بھی مقصود تھی۔ خانقاہ اور مدرسہ ایک ہی چراغ کی روشنی سے منور تھے۔ مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا مِصْبَاحٌ !

پاکستان و ہند میں اشاعتِ اسلام کی مختصر تاریخ

پاکستان و ہند میں چند کروڑ مسلمان بستے ہیں۔ ان میں ایک قلیل تعداد ان لوگوں کی ہے جن کے آباؤ اجداد ابتدائی فاتحین کے ساتھ یا بعد میں سندھ و ہند میں آئے تھے۔ باقی اکثر مسلمان اُن لوگوں کی اولاد ہیں، جو اِس ملک کے باشندے تھے اور جنہوں نے اس ملک میں اسلام قبول کیا۔ یہ دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک قلیل تعداد ان لوگوں کی ہے جنہوں نے مسلمان فاتحین کے اثر سے اسلام قبول کیا۔ اور ایک کثیر تعداد ان لوگوں کی ہے جنہوں نے بطیبِ خاطر مبلغینِ اسلام فقراء، متصوفہ اور علماء و تجار کی تلقین اور رہنمائی سے یہ دولت پائی۔ ہمارا مقصد اِس گفتگو سے یہ ہے کہ ان مبلغینِ اسلام کی مساعیِ جمیلہ کا ذکر کریں، جن کے زیرِ ہدایت یہاں کے غیر مسلم باشندوں نے اسلامی تعلیمات کو قبول کیا۔ گو ابتداءً ایک سرسری نظر ہم فاتحین کی مساعی پر بھی ڈالیں گے۔

شمالی اور شمال مغربی اور مغربی حصص ملک میں عرب پہلی صدی ہجری میں پہنچ چکے تھے۔ ۱۵ ہجری میں عربوں کا ایک لشکر سمندر کے راستے سے تھانہ اور بھڑوچ کے مقامات پر پہنچا۔ امیر معاویہ کے زمانے میں مُہلّب بن ابی صُفرۃ کی فوجوں نے کابل اور ملتان کے درمیان بعض علاقوں کو فتح کیا، ۹۴ھ میں محمد بن قاسم نے مکران کے راستے قدیم سندھ پر حملہ کیا اور سندھ کے سارے علاقہ پر یعنی آج کے سندھ، اور بلوچستان، مشرقی مکران، ملتان اور اس سے اوپر کے علاقے یعنی آج کے مغربی پنجاب کے بعض اضلاع پر بھی قبضہ کر لیا۔ یہ عرب حکومت جو اِس طرح پر قائم ہوئی تقریباً دو سو برس تک قائم رہی۔ بظاہر اس کی توسیع کی کوشش کسی بڑے پیمانے پر نہیں کی گئی، البتہ

عہدِ بنی امیہ میں جب جنید بن عبد الرحمٰن المری کو والیِ سندھ مقرر کیا گیا۔ تو کاٹھیاواڑ کے شہر اوکامنڈل اور بھڑوچ وغیرہا میں اس نے اپنے والی مقرر کیے اور مالوۂ اجین اور گوجروں کے دار السلطنت بھین مال کی طرف جو کوہ آبو کے پاس ہے، فوجیں بھیجیں، مگر ان مقامات پر کوئی دیرپا قبضہ نہ ہوا۔ سندھ اور ہند میں ان فتوحات کے سلسلے میں بعض لوگ مسلمان تو ہو گئے، مگر جب موقع ملا۔ ان میں سے بعض مرتد بھی ہوگئے ہے۔ چنانچہ بلاذری نے لکھا ہے کہ جب الحکم بن عوانۃ الکلبی والی مقرر ہوا تو اہلِ ہند باستثنائے اہلِ کچھ کافر ہو چکے تھے۔

فتح سندھ کی نسبت فتوحاتِ اسلامیہ کی زیادہ پائیدار صورت وہ تھی، جس کا آغاز افغانستان سے ہوا۔ صفاریوں نے کابل میں ایک محکم اسلامی حکومت قائم کی اور جب سامانیوں نے صفاریوں کی جگہ لی تو انھوں نے الپتگین کو افغانستان میں گورنر مقرر کیا اور اس زمانے سے غزنی کو مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اور یہیں غزنویوں نے ایک زبردست حکومت کی بنیاد رکھی، جو دو سو سال تک قائم رہی۔ جب غزنویوں نے ہندوستان پر حملے کیے اور آخراً لاہور کو اپنا مرکز بنا لیا۔ اس وقت سے صحیح طور پر اسلامی حکومت ہندوستان میں قائم ہوئی اور غزنویوں کے بعد غوریوں اور ان کے غلاموں نے بتدریج تمام شمالی ہند پر اسلامی تسلط قائم کر دیا۔ جب سلاطینِ ہند کی سلطنت کمزور ہونے لگی تو بابر اور اس کے جانشینوں نے اس ملک کو فتح کر کے دوبارہ اس ضعف کو قوت میں بدل دیا۔

ان فاتحین کی فتوحات اور ان کے تسلط کا اثر غیر مسلم آبادی پر ضرور پڑا ہوگا۔ لیکن براہِ راست ان فاتحین نے اشاعتِ اسلام کے لئے کیا کیا؟ کہیں کہیں کتبِ تاریخ

میں اس معاملے پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً "فتوح البلدان" میں ہے کہ جب محمد بن قاسم نے سندھ کے شہر الرور کا محاصرہ کیا تو صلح ہو جانے کے بعد شہر پر قبضہ ہوا۔ محمد نے حکم دیا کہ شہر کے باشندوں کو قتل نہ کیا جائے۔ ان کا معبد بلا تعرض اسی طرح چھوڑ دیا جائے۔ اس لئے کہ سندھ کے معابد کا وہی حکم ہے جو نصاریٰ اور یہود کے کنیساؤں اور مجوس کے آتشکدوں کا حکم ہے۔ محمد نے ان پر خراج لگا دیا اور الرور میں مسجد بنا دی، اور کوئی تعرض سندھیوں کے مذہب سے نہ کیا۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے اپنے دورِ حکومت میں جو ۹۹ھ سے ۱۰۱ھ تک رہا، ملوکِ سندھ کو خط لکھے۔ انہیں اسلام لانے اور اطاعت کرنے کی طرف دعوت دی، بدیں شرط کہ اسلام لانے پر وہ بدستور اپنے علاقہ کے حاکم رہیں گے اور جو باتیں مسلمانوں کے موافق ہوں گی وہ ان کے بھی موافق ہوں گی اور جو باتیں مسلمانوں کے خلاف ہوں گی وہ ان کے بھی خلاف ہوں گی۔ چونکہ حضرت عمر ثانی کی سیرت اور طریق کا حال سندھ کے لوگوں کو معلوم ہو چکا تھا، راجہ جلیسیہ اور ملوکِ سندھ اسلام لے آئے۔ اور عربوں کی طرح کے نام انہوں نے رکھ لئے۔ "چچ نامہ" (صہ ۱۹۹) سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی قسم کے خطوط محمد بن قاسم نے بھی لکھے تھے۔ یعنی حضرت عمر بن عبد العزیز کے خطوط سے کچھ سال پہلے۔ "چچ نامہ" میں ہے:-

"پس محمد بن قاسم نے اطراف کے ملوکِ ہند کو خط لکھے، اور انہیں مطاوعت اور اسلام کی طرف دعوت دی۔"

ایک اور مقام پر (چچ نامہ صہ ۲۴۱) لکھا ہے:-

"(محمد بن قاسم نے) ابو حکیم شیبانی کو دس ہزار سوار کے ساتھ رائے قنوج کی طرف بھیجا تاکہ دارِ خلافت سے جو دعوتِ اسلام کا آیا تھا وہ اُسے پہنچائے۔"

سلطان محمود نے ۴۱۳ھ میں کالنجر کا رُخ کیا اور وہاں کے راجہ گنڈا نے مقابلے کے لئے زبردست تیاریاں کیں۔ جب دونوں فوجیں آمنے سامنے صف کشیدہ ہوئیں تو محمود نے گنڈا کے پاس قاصد بھیجا۔ بالفاظِ گردیزی :-

"اُسے نصیحت کی کہ اسلام قبول کر اور اس تمام رنج و محن سے مامون ہو جا"

مگر اس راجہ کو یا کسی اور شخص کو سلطان کے باکراہ مسلمان کرنے کا ذکر تاریخ میں نہیں ہے غوریوں کے متعلق تاریخ فرشتہ میں ہے کہ گکھڑوں کا ایک سردار قید ہو کر محمد غوری کے سامنے پیش ہوا اور اس کے ترغیب دلانے پر مسلمان ہوا۔ پھر اس نو مسلم رئیس نے اپنی ساری قوم کو مسلمان کر لیا۔ خلجی بادشاہوں کے ذکر میں ابن بطوطہ (۲ : ۱۹۷) نے لکھا ہے کہ :-

"اس ملک کے لوگوں کا دستور یہ ہے کہ ہندو اگر اسلام لانا چاہے تو اس کو سلطان کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ وہ اس کو خلعت دیتا ہے اور اس کی حیثیت کے مطابق اسے سونے کا کنٹھا اور سونے کے کنگن عطا کرتا ہے۔" (رحلہ طبع پیرس)

فتوحاتِ فیروز شاہی سے معلوم ہوتا ہے کہ :-

"ان سلاطین میں سے سلطان فیروز شاہ نے خدمتِ اسلام میں کافی سرگرمی دکھائی۔ اوّل منعِ بدعات اور دفعِ منکرات اور قلعِ محرمات کو اس بادشاہ نے اپنے اوپر واجب کیا۔ اور چاہا کہ حق سے باطل کو جدا کرنے کی غرض سے باطل رسموں اور خلافِ شرع دستوروں کو بکلّی دور کیا جائے۔ خواہ اس سے خزانے کو نقصان ہی پہنچے۔"

چنانچہ ہر قسم کے خلافِ شرع محاصل اس نے موقوف کر دیئے اور بیت المال میں صرف ان وجوہات کا داخلہ جائز رکھا جو شریعت میں درست تھے۔ دوسرے اس نے یہ کیا کہ مدارس اور خانقاہیں تعمیر کیں۔ اور سابقہ مرمت طلب عمارتوں کی مرمّت کی۔ تیسرے یہ کہ اہلِ ذمّہ کو دینِ ہدایت کی طرف ترغیب دی اور اعلان کیا کہ "جو کافر کلمۂ توحید پڑھے اور دینِ اسلام قبول کرے احکامِ دین کے مطابق اسے جزیہ معاف کیا جائے" چنانچہ اسی بادشاہ نے لکھا ہے:۔

"جب اس اعلان کی اطلاع لوگوں تک پہنچی تو فوج فوج اور جماعت جماعت ہنود آئے اور شرفِ اسلام سے مشرف ہوئے۔ اور اب تک اطراف سے لوگ آتے ہیں اور ایمان لاتے ہیں اور جزیہ انہیں معاف کر دیا جاتا ہے، اور انعامات اور تشریفات سے انہیں خاص کر دیا جاتا ہے۔ والحمد للہ رب العالمین۔"

فیروز تغلق ہی نے اپنے سے پہلے سلاطین کی خدماتِ اسلام کا ذکر بھی کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدماتِ جلیلہ ضمنی اور بالواسطہ تھیں نہ کہ براہِ راست۔ چنانچہ بادشاہ مذکور لکھتا ہے:۔

"بادشاہانِ اسلام کی ہمّت کے یمن اور ان کی آرزو کی برکت سے بلادِ کفّار فتح ہوئے اور ان کے جھنڈے ہر دیار میں مظفر و منصور، اور مساجد و منابر معمور اور مرتفع ہوئے اور کلمۂ طیبہ بلند ہوا۔ اور اہلِ اسلام کی قوّت میں اضافہ ہوا اور حربی ذمّی بن گئے۔"

جب حکومت سلطان بابر اور اس کی اولاد کو پہنچی اور اسلامی سلطنت ملک کے طول و عرض میں استوار بنیادوں پر قائم ہو گئی تو قدرتی طور پر اسلامی اثرات کو بھی ملک

میں تقویت پہنچی۔ گو اصولی طور پر غیر مسلم جبر و اکراہ سے محفوظ تھے، مگر اسلام کے حقائق کا اثر و نفوذ اس دور میں غیر مسلموں کے دلوں میں طبعی طور پر بہت بڑھ گیا۔ عقیدۂ توحید کی روشنی نے بہت سے تنگ و تار دلوں کو منور کیا۔ جس نے نہ مانا اُس نے بھی ان حقائق کو پہچان ضرور لیا۔

کل ہم نے ہندوستان کے مغربی ساحل پر ظہور اسلام کی ابتدار کا ذکر کیا تھا۔ اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کلمہ طیّبہ کا جو بیج غربی ساحل کی سرزمین میں بویا گیا۔ بعد کی صدیوں میں اس کی کیا کیفیّت رہی۔

"مروج الذہب" کا مصنف، مشہور جہان گشت سیّاح مسعودی ۳۰۴ھ میں اس ساحل پر پہنچا۔ وہ لکھتا ہے کہ صیمور یعنی چول میں اس وقت دس ہزار کے قریب مسلمان باشندے تھے۔ ان میں کچھ تو "بیاسرہ" یعنی وہ لوگ ہیں جو عربوں کی اولاد تھے مگر جن کی مائیں ملکی تھیں۔ ان کے علاوہ سیراف (ساحل خلیج فارس)، عمان، بصرہ، بغداد اور دیگر شہروں کے لوگ بھی تھے، جو ان علاقوں میں متاہّل ہو کر بس گئے تھے۔ ان میں بہت سے سربرآوردہ تاجر تھے، مثلاً موسیٰ بن اسحٰق صندانوی (سندابوری) جو ان کا ہنرمند یا چودھری تھا اور ابو سعید معروف بن زکریا۔ "ہنرمند" یہاں مسلمانوں کے رئیس یا سردار کو کہتے ہیں۔ یہاں کا راجہ رؤسائے مسلمین میں سے ایک کو مسلمانوں کا سردار مقرر کر دیتا ہے تا جو ان کے معاملات کا تصفیہ کرتا ہے۔"

مسعودی کے بعد ایک اور سیاح ابو دُلف مسعر بن مہلہل الخزرجی نے جو سامانیوں کا سفیر بن کر ۳۳۱ھ میں ہندوستان آیا۔ صیمور کے متعلق لکھا ہے کہ: "وہاں مساجد موجود

ہیں"۔ یاقوت نے (ساتویں صدی میں) معجم البلدان میں لکھا ہے کہ "صیمور بلہارا کے علاقے میں ہے" (مراد اس کی گجرات کے وَلّبھی حکمرانوں سے ہے۔ جنہیں عرب اس لقب سے یاد کرتے تھے) پھر لکھا ہے کہ "صیمور اور کنامہ اُن بلاد میں سے ہیں جہاں مسلمان آباد ہیں۔ رائے کی طرف سے ان مسلمانوں کا حاکم بھی مسلمان ہی مقرر ہوتا ہے۔ وہاں جامع مسجد بھی ہے جہاں نماز باجماعت ادا ہوتی ہے۔"

ابوالفداء (آٹھویں صدی کے ربع اول) نے لکھا ہے "کہ کولم میں ایک نفیس مسجد اور ایک منڈی ہے، جس میں مسلمان تاجروں کی دکانیں ہیں۔ یاقوت ہی نے ابن عساکر کی "تاریخ دمشق" کے حوالے سے ایک مالاباری محدث کا بھی ذکر کیا ہے جس نے شام کی ایک بندرگاہ صیدا کے علاقے میں حدیث روایت کی ہے۔

ابن بطوطہ نے اسی صدی کے ربع سوم میں یہاں کے حالات بہت مفصل بیان کئے ہیں۔ وہ کنبایت سے خشکی کے راستے گوا سے ہوتا ہوا ایک مقام تک پہنچا ہے۔ جس کا نام وہ قندھار بتاتا ہے۔ یہاں سے وہ کشتی میں سوار ہوتا ہے اور کونکن اور مالابار کے اکثر بندروں کی سیر کرتا ہے۔ وہ شمال سے جنوب کو جا رہا ہے۔ تمام بڑی بڑی بندرگاہوں میں وہ مساجد، قاضیوں، خطیبوں، خوشحال مسلمان تاجروں اور دیگر مسلمان باشندوں کی موجودگی کا ذکر کرتا ہے۔

مثلاً ہنور کی نسبت وہ کہتا ہے کہ وہاں کے لوگ شافعی المذہب ہیں صالح، دین دار، مجاہد فی البحر اور قوی ہیکل ہیں۔ معلم قرآن اور قاضی اور خطیب یہاں ہیں، عورتیں ساڑھیاں پہنتی ہیں۔ سب قرآن مجید کی حافظ ہیں۔ میں نے دیکھا کہ لڑکیوں کی تعلیم کے لئے یہاں ۱۳ مکتب ہیں اور لڑکوں کیلئے ۲۳۔ اور کہیں میں نے ایسے مکاتب

نہیں دیکھے۔ مالابار کی حد یہاں سے تین دن کی راہ پر ہے۔ مالابار فلفلستان ہے اور صندآپور سے کولم تک پھیلا ہوا ہے یعنی دو مہینوں کی راہ تک، اس راہ کی تمام منازل پر مسلمانوں کے گھر ہیں اور مسلمان مسافران کے ہاں ٹھہرتے ہیں اور ضروریات ان سے خریدتے ہیں۔ اور وہی ان مسافروں کے لئے کھانا بھی پکا دیتے ہیں مسلمان ان علاقوں میں احترام اور توقیر کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، مگر ہندو ان کے ساتھ کھانا نہیں کھاتے۔ اور نہ ان کو اپنے گھروں کے اندر آنے دیتے ہیں۔ باکنور میں بھی مسلمانوں کی ایک جماعت سکونت رکھتی ہے۔ ان کے رئیس حسین سلّاط نے یہاں ایک مسجد بنائی ہے۔ جمعہ ہوتا ہے، قاضی اور خطیب ہیں۔ مگر مسلمان یہاں کمزور ہیں۔

منگلور میں فارس و یمن کے اکثر تاجر آتے ہیں۔ اس لئے کہ کالی مرچ اور سونٹھ یہاں بہت ہوتی ہے۔ یہاں چار ہزار کے قریب مسلمان ہیں۔ ان کا قاضی شافعی المذہب ہے مسلمان یہاں قوی ہیں۔ شہر کے باہر ایک پورا محلّہ ان کا ہے۔ راجہ ان سے خوف کھاتا ہے۔

ھیلی۔ اس میں جامع مسجد ہے۔ بہت برکت والی۔ اور درخشندہ نور والی، اس مسجد میں کافی بڑا خزانہ مال ہے۔ طالب علموں کی ایک جماعت مسجد میں پڑھتی ہے اور مال مسجد سے وظیفہ پاتی ہے۔ آیندہ و روندہ کے لئے مسجد کے ساتھ لنگر بھی ہے۔ مسجد میں ایک فقیہ صالح سے ملاقات ہوئی جو مقدشو کا باشندہ ہے (یہ شہر اطالوی سومالی لینڈ کا دارالسلطنت تھا) چودہ سال مکّے شریف میں رہا اتنے ہی سال مدینہ شریف میں، ہندوستان اور چین کی سیر کر چکا ہے۔

کویل میں جامع مسجد ہے، جو کہتے ہیں کہ یہاں کے راجہ نے بنائی تھی جو مسلمان

ہو گیا تھا۔

فندارینہ بہت آباد شہر ہے۔ اس میں مسلمانوں کے تین محلّے آباد ہیں۔ ہر محلّے میں مسجد ہے۔ جامع مسجد سمندر کے کنارے واقع ہے۔ مسجد کے مناظر و مجالس کے سامنے سمندر ہے یہاں کا قاضی و خطیب عمان کا باشندہ ہے۔

کالی کٹ، مالابار کی بہت بڑی بندرگاہ ہے۔ چین، جاوہ، سیلون، مالدیو، یمن اور فارس کے سوداگر یہاں جمع ہوتے ہیں۔ اس کی لنگر گاہ دنیا کی بہت بڑی لنگر گاہوں میں سے ہے۔ یہاں کا راجہ سامری یعنی زمورن کہلاتا ہے، یہاں کا امیر التجار ابراہیم شہبندر ہے، جو بحرین کا باشندہ ہے۔ قاضی یہاں کا فاضل اور فیاض آدمی ہے۔ یہاں ایک زاویہ بھی ہے اور صاحب زاویہ شہاب الدین گازرونی ہیں۔ شیخ ابواسحاق ابراہیم گازرونی علیہ الرحمۃ (م ۴۲۶ھ) کے معتقدین ہندوستان اور چین سے نذر و نیاز یہاں لاتے ہیں۔ ناخدا مثقال، ایک مشہور شخص یہاں رہتا ہے، جو کئی جہازوں کا مالک ہے، اس کے جہاز ہند، چین، یمن اور فارس کے درمیان تجارتی سامان لاتے، لے جاتے ہیں۔

کنجی کری، یہ مالابار کے خوبصورت مواضع میں سے ہے۔ مسلمان تاجروں کی ایک جماعت یہاں مقیم ہے، مالابار سے چین جانے والے تاجر یہیں سے سفر شروع کرتے ہیں۔ مسلمان یہاں بھی عزیز و محترم ہیں۔

۸۴۶ھ میں کمال الدین عبدالرزاق سمرقندی صاحب مطلع سعدین، تیمور کے بیٹے شاہ رخ کی طرف سے سفیر بن کر بیجانگر کی طرف آیا۔ اور کالی کٹ میں آکر کشتی سے اترا۔ وہ کالی کٹ کے متعلق لکھتا ہے:۔ "یہ ایک پُرامن بندرگاہ ہے۔ ہر بلاد

و دیار کے تاجر یہاں آتے ہیں۔ یہ شہر کفار اور دارالحرب ہے۔ مگر مسلمانوں کی ایک جماعت اس شہر میں بستی ہے۔ دو مسجدیں انہوں نے بنائی ہیں۔ لوگ اطمینان کے ساتھ نمازیں پڑھتے ہیں۔ ان کا قاضی ایک متدین آدمی ہے۔ اور یہ لوگ اکثر شافعی مذہب کے ہیں۔ خود راجہ نے بھی جو خط شاہ رُخ کو لکھا تھا اس میں کہا تھا۔ " اس بندر میں جمعہ اور عید کے دن خطبۂ اسلام پڑھا جاتا ہے۔ اگر اجازت ہو تو اس خطبے کو آپ کے نام اور القاب ہمایوں سے معزز و مشرف کریں۔" اسی مؤرخ نے لکھا ہے کہ " یہاں کے مسلمان باشندے عربوں کی طرز کا فاخر لباس پہنتے ہیں اور ہر باب میں طرح طرح کا تکلف کرتے ہیں۔"

سنہ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری میں کالی کٹ میں ۴۰ فیصدی آبادی مسلمانوں کی تھی، اور اس میں چالیس سے زیادہ مسجدیں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک میں ایک شیخ مدفون ہیں۔ جو دسویں صدی ہجری میں مصر سے یہاں آئے اور جن کے ساتھ موپلوں کو اس قدر حسن عقیدت ہے کہ وہ اپنے ہر قسم کے تنازعوں کو طے کرنے کیلئے ان کی قبر پر آتے ہیں۔

اس وقت تک ہم ہندوستان کے مغربی ساحل کا ذکر کر رہے تھے۔ مشرقی ساحل کے حالات اس سے مختلف نہیں۔ اس لئے کہ مسلمان تاجر وہاں بھی جا کر آباد ہو گئے تھے۔ جاہلیّت کے زمانے سے عرب جہاز ران چین تک جاتے تھے اور جاہلیت اور اسلام میں اُن کی بستیاں ہندوستان کے مشرقی ساحل پر بھی بس گئی تھیں۔ مثلاً قائل میں، جہاں کی مسلمان بستیوں کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ کہتے ہیں کہ تلیگو اور تامل میں عرب کو لگاڑ کر لبّے اور اِکپّے بنا دیا ہے۔ مسلمانوں کی اصطلاح میں مشرقی ساحل ہند کو مَعبر یعنی گذرگاہِ چین کہتے تھے۔ معبر کے ہندو راجہ تجارت کی وجہ سے مسلمانوں کی

بہت قدر کرتے تھے۔ اور ان کے اعزاز و اکرام اور سرپرستی میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں
نہیں دیتے تھے۔ اور اشاعتِ اسلام میں کوئی رُوکاوٹ پیش نہیں کرتے تھے۔ اور
انہیں وجوہات سے داعیانِ اسلام و مبلغین نے بے روک ٹوک اسلام کا پیغام ان
اطراف میں سب کو پہنچایا۔

کل کی تقریر میں ذکر ہوا تھا کہ مسلمان صرف مغربی ساحلِ ہند پر ہی نہیں مشرقی ساحل
یعنی مَعبَر یا کورومنڈل میں بھی اپنی بستیاں ابتدا ہی سے بسا چکے تھے، یعنی خلجیوں کے
حملۂ دکن سے صدیوں پہلے اہم تجارتی مرکزوں میں وہ موجود تھے۔ اور مبلغانِ اسلام
بے کھٹکے اشاعتِ اسلام میں مصروف تھے۔ اور متعدد نئی قومیں عربوں اور مقامی عناصر
کے امتزاج سے وجود میں آچکی تھیں۔ مثلاً لبّے وغیرہم۔

مَعبَر یا کورومنڈل میں جو اثر و نفوذ مسلمانوں کو حاصل تھا اس کا تفصیلی ذکر وصّاف
نے اپنی تاریخ (۱: ۳۰۲) میں یوں کیا ہے:۔

" مَعبَر میں چین و ماچین اور بلادِ ہند اور سندھ سے بڑی بڑی کشتیوں میں تجارتی
مال آتا تھا۔ اور وہاں سے خلیج فارس کے جزائر میں خصوصاً اور عراق و خراسان تا روم و
فرنگ میں عموماً تقسیم ہوتا تھا۔ تقی الدین عبدالرحمٰن ابن محمد الطیبی معبر کے راجہ کا نائب
اور وزیر تھا۔ راجہ نے پٹن اور ملی پٹن اور قائل، یہ تین مواضع اس کو دے رکھے تھے۔
جزیرہ قیس بنی عُمیرہ میں، جو بقول ابن خلکان عوام کے نام سے مشہور ہے۔ ساحلِ فارس
کے قریب ایک جزیرہ ہے۔ ملک الاسلام جمال الدین (تقی الدین کا عزیز) حاکم و متصرف
تھا۔ اس کے اور جزیرۂ قیس کے تاجر ہر سال خلیج فارس کے اطراف (یعنی جزائرِ فارس

قطیف، ولحسا و بحرین و ہرمز و قلہات) سے چودہ سو گھوڑے فراہم کر کے معبر میں پہنچاتے تھے اور ۲۲۰ دینار یعنی ڈیڑھ ہزار روپے سے زائد فی راس قیمت وصول کرتے تھے۔"

وصّاف کہتا ہے:۔ "چونکہ جنود ہنود کو گھوڑوں کو بیچ بیچ میں آرام دینے اور ترتیبِ رکوب اور رسومِ فروسیّت سے واقفیت نہیں۔ تھوڑی ہی مدت کے بعد یہ گھوڑے دُبلے، کاہل اور کودن، بلکہ معیوب اور ردّی ہو جاتے تھے۔ اور دکن کی آب و ہوا بھی انہیں غیر موافق ہے۔ اگر گھوڑیاں بچے دیتی ہیں تو وہ بغایتِ حقیر اور قبیح و زشت ہوتے ہیں۔ اور انہیں لوگ سواری کے لائق نہیں سمجھتے۔ غرض یہ کہ نئے گھوڑے ان کو سال بسال درکار ہوتے ہیں۔ اور مجبور ہو کر ان لوگوں کو بلادِ اسلام کی ناز برداری کرنا پڑتی ہے۔ جب ۶۹۲ھ میں معبر کا پانڈیا راجہ مرا تو ملکِ اعظم تقی الدین اس کے جانشین کا نائب، مشیر اور اس ملک کا حاکم بن گیا۔ اور امارت کے علاوہ اسکی تجارت بھی بدستور جاری رہی۔ اور اس میں اس کا دخل و تصرف اس حد تک تھا کہ اگر اقصائے چین اور بلادِ ہند سے تجارتی مال آتا تھا تو اس کے وکیلوں اور گماشتوں کی اجازت کے بغیر اس مال کی خرید و فروخت نہیں ہو سکتی تھی۔ جب نفیس سے نفیس چیزیں اور مالِ تجارت حاصل ہو جاتا تو ملک اُسے اپنے جہازوں میں بھر کر اور اپنے جہاز رانوں اور ناخداؤں کے ہمراہ جزیرہ قیس میں بھیجتا۔ وہاں بھی کوئی شخص تقی الدین کے بھائی ملک الاسلام جمال الدین کے انتخابِ اجناس کے بغیر مال خرید نہیں سکتا تھا۔ پھر جس چیز کو وہ مناسب سمجھتے تھے تاجروں کو خریدنے کی اجازت دیتے۔ باقی کشتیوں میں بھر کر، یا جانوروں پر لاد کر جزائرِ بحر اور بلادِ شرق و غرب کو بھیجتے۔ ایسی تجارت کہ ایک ہی سود اگر اقصائے چین سے

مال منگوالے اور انتہائی مغرب میں فروخت کرے، کسی نے دُنیا میں کہاں دیکھی ہو گی؟

حاصل کلام کا یہ ہے کہ مسلمان پہلی ہی دو تین صدیوں میں ہندوستان کے بلاد ساحلیہ شرق و غرب پر چھا گئے اور سیاست میں، معاشرت میں، انہوں نے عمیق اثر و رسوخ پایا۔ وزارت و نیابت اور تجارت سے ملک کے انتظام اور اس کے مالیات میں اہم سے اہم مرتبہ پایا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب کی اشاعت کر کے بہت سے لوگوں کو مسلمان کیا۔ مساجد بنائیں، مقابر بنائے اور اپنے مبلغین اور صالحین کے لئے مرکز قائم کیے۔ مثلاً مدورا اور ترچناپلی کے مسلمانوں کی روایت کے مطابق انہیں ایک ولی اللہ نے مسلمان کیا۔ جن کی قبر ترچناپلی میں ہے اور اس پر ایک کتبہ موجود ہے جس میں ان کی تاریخ وفات ۴۱۷ھ دی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ سید تھے۔ روم کے ایک علاقے پر ان کی حکومت تھی، حکومت کو خیر باد کہا اور فقیری اختیار کر لی۔ اور تبلیغ اسلام کے جوش میں عرب و ایران سے ہوتے ہوئے شمالی ہند اور وہاں سے ترچناپلی پہنچے اور وہیں مقیم ہو گئے، اور انہوں نے اپنا وقت زہد و عبادت اور تبلیغ میں گذارا اور اس علاقے کے بہت سے لوگوں کو مسلمان کیا۔ اسی ولی کا ایک مرید بابا فرید الدین صوبۂ مدراس کے شہر PENU KONDA (پینو کنڈا) کے دھنوں اور جولاہوں کا پیر ہے۔ بابا کی قبر اسی شہر میں ہے۔ اس کی زیارت کی جاتی ہے اور اس سے برکت حاصل کی جاتی ہے۔ مشہور ہے کہ بابا سیستان کے بادشاہ تھے۔ تخت سے دستبردار ہو کر فقر اختیار کیا۔ حج و زیارت کی، خواب میں ہدایت ہوئی کہ ہند جاؤ۔ وہاں ترچناپلی کے ولی سے شرفِ ملاقات حاصل کیا۔ ان کے مرید بنے۔ پیر نے دو سو فقیروں کے ہمراہ تبلیغ کے لئے بھیجا۔ بابا نے کرامت دکھا کر راجہ کو مسلمان کیا، اور راجہ کی وجہ سے آس پاس کے اور بہت سے لوگ بھی مسلمان ہو گئے۔

غالباً مالا بار ہی سے اسلام لنکا دیپ اور مالدیپ کے جزائر میں پہنچا۔ اگرچہ مقامی روایت جو ابن بطوطہ نے افسانے کے سے رنگ میں دی ہے، یہ ہے کہ :۔

"ایک مغربی بربر حافظ ابو البرکات نامی نے کرامت دکھا کر ایک عفریت کو بھگا دیا۔ اس پر جزیرہ مالدیپ کا راجہ شنورازہ مسلمان ہو گیا۔ وہاں کی جامع مسجد میں ابن بطوطہ نے ایک لکڑی پر یہ کتبہ لکھا ہوا پایا کہ" سلطان احمد شنورازہ نے ابو البرکات بربری مغربی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا" اس سلطان نے جزیرے کی تہائی آمدنی مسافروں پر وقف کر دی، کیونکہ مسافروں ہی کی برکت سے اسلام کی نعمت اس نے پائی تھی۔ مالدیپ کی طرح لنکا دیپ کے لوگ بھی کہتے ہیں کہ ان کے ملک میں ایک بیرونی (عرب) مبلغ نے اسلام کی تبلیغ کی۔"

یہ بیان ہو چکا ہے کہ دکن کے ساحلی علاقوں میں عرب اور ایران کے تاجروں اور مبلغوں کے ذریعے اسلام پہنچا، جب بہمنیوں اور ان کے جانشینوں کا تسلط دکن میں ہوا تو عرب اور دیگر اقوام کے تاجروں کے ساتھ ساتھ مبلغ بھی اندرون ملک میں پہنچے اور وعظ و نصیحت اور ارشاد و ہدایت کے ذریعے اسلام کا پیغام غیر مسلموں کو پہنچایا۔ اس سلسلے میں چند بزرگوں کا نام خصوصیت سے لیا جاتا ہے۔ مثلاً حضرت خواجہ بندہ نواز سید محمد گیسو دراز بن سید یوسف حسینی چشتی دہلوی کا، جو شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی قدس سرہ کے خلیفہ تھے۔ اپنے پیر کی وفات کے بعد دکن تشریف لے گئے۔ "برہان مآثر" میں ہے کہ، "وہ چند مرید ان باکمال اور درویشان صاحب حال کے ہمراہ سنہ ۸۰۲ھ میں سلطان فیروز شاہ بہمنی کے دار السلطنت گلبرگہ میں پہنچے۔ سلطان نے فضلاء کی ایک جماعت ان کے پاس بھیجی اور انہوں نے واپس آ کر سلطان کی خدمت میں عرض کیا کہ جناب سید کو

انواعِ علوم ظاہری و باطنی و کشف و کرامات و مقامات میں کمال حاصل ہے۔ سلطان کو اس مرشدِ کامل کی صحبت کی طرف رغبت ہوئی۔ بہت تعظیم و تکریم سے پیش آیا اور چند آباد گاؤں انعام میں مقرر کئے۔ میر موصوف تقریباً ۲۳ برس دیارِ دکن میں مقیم رہے اور قبول عظیم پایا۔

کہتے ہیں کہ میر سیّد محمد گیسو دراز نے ضلع پونہ اور ضلع بلگام میں کئی غیر مسلموں کو زیورِ اسلام سے آراستہ کیا۔

صوبۂ بمبئی کے ضلع تھانہ کے علاقے میں ڈہنو کے مقام پر ایک بزرگ کی قبر ہے کہتے ہیں کہ یہ سید عبدالقادر جیلانیؒ کے قرابت داروں میں سے تھے۔ نویں صدی ہجری میں یہاں پہنچے۔ کونکن کے بہت سے لوگ ان کے دستِ حق پرست پر ایمان لائے۔ اور ڈہنو ہی میں انہوں نے وفات پائی۔

دسویں صدی ہجری کے آخر میں ہاشم پیر گجراتی نے دھارواڑ کے ال‌تعداد جُلاہوں کو مسلمان کیا۔ ان کی اولاد اب تک دھارواڑ کے علاقے میں موجود ہے اور اپنے پیر کے جانشینوں کے ساتھ غایت درجہ تعظیم و تکریم کا سلوک کرتی ہے۔ ہاشم پیر بیجاپور کے بادشاہ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے پیر تھے۔ اس بادشاہ نے ۹۸۷ھ سے ۱۰۳۵ھ تک فرمانروائی کی۔

ناسک میں سیّد شاہ محمد صادق سرمست حسینی کی اولاد موجود ہے۔ ان کی روایت ہے کہ ان کے مورثِ اعلیٰ دسویں صدی ہجری میں مدینہ شریف سے آئے اور مغربی ہند میں مختلف جگہوں کا سفر کیا اور بالآخر ناسک میں مقیم ہوئے۔ کہتے ہیں کہ ان کی تبلیغ نہایت کامیاب تھی اور ان لوگوں کی اولاد جو ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوئی ان کی ولایت کی معترف اور معتقد اور ان کے پسماندوں کی مطیع اور فرمانبردار ہے۔

دکن کے متعدد اور مقامات میں داعیان و مبلغانِ اسلام کی یادگاریں موجود ہیں۔ ان کے نام انتہائی ادب اور احترام سے لینے والی قومیں اور قبیلے موجود ہیں۔ جنہوں نے ان کی دعوت پر اسلام قبول کیا۔ ان داعیان الی الحق پر خدا کی رحمت واسعہ ہو۔

کل آپ نے سنا تھا کہ ہندوستان کے ساحلی علاقوں اور باقی دکن میں ظہورِ اسلام کیونکر ہوا۔ اب ہم مغربی شمال مغربی اور شمالی علاقوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

بلاذری کے بیانات کی بناء پر ہم سندھ اور ملتان پر مسلمانوں کے غلبے کا ذکر کر چکے ہیں۔ یہ بیانات عباسی خلیفہ معتصم کے عہد تک آتے ہیں جو ۲۲۷ھ میں ختم ہوا تھا ان سے معلوم ہوتا ہے کہ تیسری صدی کے نصف آخر میں مسلمانوں کی سیاسی قوت سندھ اور ملتان میں کمزور ہو گئی۔ اس کی وجہ غالباً وہی تھی۔ جس کا ذکر بلاذری نے ان مشئوم اور بدفال لفظوں میں کیا ہے:۔

" اس کے بعد (سندھ کے) شمالی اور جنوبی عربوں کے درمیان عصبیت، یعنی پارٹی بازی شروع ہو گئی۔" مطلب یہ کہ سندھ کے نزاری اور یمانی عرب آپس میں لڑنے لگے۔ عمران برمکی نائب گورنر یمنیوں کا طرف دار بن گیا۔ اسے عمر بن عبدالعزیز الہباری القرشی نے قتل کر دیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی تھا کہ عربوں کا تسلط کمزور ہو گیا۔ اور ان کی حکومت چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم ہو گئی اور ان کے دشمن زور پکڑنے لگے چنانچہ بلاذری ہی نے لکھا ہے کہ (کچھ کے جنوبی علاقے) سندان کو اہلِ ہند نے مسلمانوں سے چھین لیا۔ مگر مسجد کو باقی رہنے دیا۔ جس میں جمعہ ادا ہوتا ہے اور خطبہ خلیفہ کے نام کا پڑھا

جاتا ہے۔ جو ریاستیں اس کمزوری کے زمانے میں قائم ہوئیں۔ ان میں ملتان اور منصورہ کی ریاستیں زیادہ اہم تھیں۔ چوتھی صدی ہجری میں چار مسلمان سیاح ان علاقوں میں آئے۔ اور ان کا حال قلمبند کیا۔ یہ تھے مسعودی، اصطخری، ابن حوقل اور مقدسی۔ ان کے بیانات ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ ہم ابن حوقل کے بیانات آپ کو سناتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے:۔ "ملتان میں اہل ہند کا صنم اعظم ہے۔ جس کی پوجا کیلئے نزدیک و دور سب جگہوں سے ہندی آتے ہیں۔ اور بہت سا مال چڑھاووں میں چڑھتا ہے۔ جس سے مندر اور اس کے خادموں کا خرچ نکلتا ہے۔ یہ مندر ایک پختہ عمارت ہے جو ملتان کے آباد ترین بازار میں واقع ہے۔ اس کے ایک طرف عاج پر کام کرنے والوں کا بازار ہے۔ دوسری طرف مسگروں کا بازار ہے۔ مندر کے درمیان میں قبہ ہے۔ جس کے اندر بت ہے۔ گرداگرد خادموں کے مکان ہیں۔ چڑھاوا ہباری قریشی امیر ملتان کے پاس جمع ہوتا ہے اور وہ مندر کے خادموں پر ان کی ضرورت کے مطابق صرف کرتا ہے۔ یہ ہباری عمر بن عبدالعزیز الہباری کی اولاد میں سے ہے۔ جو عمران برمکی کو قتل کر کے سندھ پر قابض ہو گیا تھا۔ اس کے اجداد ۱۷۰ھ میں سندھ کے ایک گورنر کے ہمراہ اس ملک میں پہنچے تھے"۔ ابن حوقل لکھتا ہے کہ "اہل ہند نے متعدد بار بت کو ابن ہبار متغلب ملتان سے چھیننے کی کوشش کی ہے۔ مگر ہر دفعہ ابن ہبار نے بت کو توڑنے اور جلانے کی دھمکی دی۔ اور اس طرح حملہ آور واپس جانے پر مجبور ہوئے۔ یہ نہ ہوتا تو وہ ملتان کو کبھی کا ویران اور برباد کر چکے ہوتے۔ اہل ملتان کو قرآن اور علم قرآن اور سات قرأتوں کے حاصل کرنے اور علم فقہ کا شوق ہے۔ اور ادب و علم کے طالب بھی ان میں ہیں۔ یوں اہل ملتان میں سختی، تندی مزاج اور بدخوئی بھی ہے۔ ملتانی کرتا شلوار اور تہ بند پہنتے ہیں۔ بال لمبے رکھتے ہیں

البتہ تاجر لوگ اہلِ عراق و فارس کی طرح قمیص اور ردا پہنتے ہیں۔"

منصورہ کی نسبت ابن حوقل لکھتا ہے :۔" یہاں کے لوگ مسلمان ہیں۔ ان کا رئیس ایک قریشی ہے جو ہبّار بن الاسود کی اولاد سے ہے۔ اس کے اجداد نے اس علاقے پر فوجی قوّت کی بنا پر قبضہ کر لیا تھا اور اپنے حسنِ انتظام سے رعایا کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ وہ اب ان کے سوا دوسرے کو نہیں چاہتے۔ ہاں خطبہ بنی عباس کا پڑھا جاتا ہے۔ لباس یہاں کے لوگوں کا عراقیوں کا سا ہے۔ مگر ان کے ملوک بال ملوکِ ہند کی طرح رکھتے ہیں اور کُرتے بھی اُنہیں کی طرح کے پہنتے ہیں"

دیبل کے متعلق اس نے لکھا ہے :۔" یہ عظیم الشان تجارتی بندرگاہ ہے۔ کھیتی باڑی علاقے میں کم ہے۔ درخت کم ہیں۔ کھجور کے درخت ناپید ہیں اور پیداوار نہیں ہے۔ آبادی کا انحصار تجارت ہی پر ہے"۔ اس سے ظاہر ہے کہ عربی تاجر اس زمانے میں نہایت اہم حیثیت کا مالک تھا۔ سندھ اور آس پاس کے علاقے اور ہندوستان اور بیرونی دُنیا کے تجارتی تعلقات اس کے ذریعے سے قائم تھے، چین اور جزائر اور لنکا اور سندھ و ہند کا مال وہی ترکستان اور خراسان اور مغربی ممالک کو پہنچاتا ہے۔ یہی تاجر مبلّغ بھی تھا۔ مسلمان حکمرانوں اور ان تجار کی وجہ سے اہلِ علم اور فقرا بھی اسلامی ممالک سے ان اطراف میں چلے آرہے تھے۔ گو ان سب کا حال کتابوں میں محفوظ نہیں رہا۔ آزاد بلگرامی صاحبِ "مآثر الکرام" کہتے ہیں :" اسلام کے آفتابِ جہانتاب کے طلوع کے بعد ان آفاق میں سے کوئی افق اولیاء اللہ اور اصفیائے ملت کے وجود سے خالی نہیں رہی۔ مگر ان لوگوں کا حال ساتویں صدی سے کتابوں میں درج ہوا۔ مختلف وجوہ سے پہلے ان اکابر کا حال نقابِ خفا میں رہا۔ استثنائی حالات میں لباسِ فال میں بعض بزرگوں کا حال

جلوہ گر ہوا۔ ان میں سے ایک ابوحفص ربیع بن صبیح السعدی البصری تھے، جو اتباعِ تابعین میں سے ہیں۔ اور ثقہ محدّث، راست گو، عابد اور مجاہد اور (بصرے میں) پہلے شخص وہی ہیں، جنہوں نے اسلامی زمانے میں (حدیث پر کتاب) تصنیف کی۔ حسن بصری اور عطاء سے حدیث روایت کی اور سفیان ثوری، وکیع اور ابن مہدی نے ان سے۔ ۱۶۰ھ میں سندھ میں فوت ہوئے۔

ٹھٹھے سے ۴ کوس پر ایک اور تبع تابعین کا قُبّہ آج بھی موجود ہے، ان کا نام شیخ ابوتراب ہے۔ یہ بنو عباس کے عہد میں سندھ کے بعض اماکن کے والی تھے۔ ۱۷۱ھ میں یہاں شہید ہوئے ۔ ان کا مزار اب تک زیارت گاہِ خلائق ہے۔ کہتے ہیں کہ سیّد عبدالقادر جیلانیؒ کی اولاد میں سے سید یوسف الدین کو خواب میں ہدایت ہوئی کہ تبلیغ اسلام کے لئے وہ ہند جائیں۔ چنانچہ وہ بغداد سے روانہ ہوکر ۸۲۴ھ مطابق ۱۴۲۲ء میں سندھ آئے اور لوہانوں میں تبلیغ کی اور ان کے سینکڑوں گھرانوں کو مسلمان کیا۔

گماشتگانِ عباسیہ کے واماندوں میں سے جن کی نسبت آلِ عباس تک پہنچتی ہے قاضی نعمت اللہ بھی تھے۔ جو جام صلاح الدین (نومسلم) کے زمانے میں یعنی ۷۸۱ھ اور ۷۹۳ھ کے درمیان علماء میں سب سے مقدم اور متقیوں میں سب سے اکرم تھے "تحفۃ الکرام" کے مصنف نے شیرازی، مشہدی، سبزواری اور بخاری سادات اور قضاۃ و مخادیم و علماء کی ایک طویل فہرست دی ہے جو جاموں اور ارغونوں اور مغلوں کے زمانے میں ایران و توران اور دیگر دیار سے سندھ میں وارد اور مقیم ہوئے۔ اور جن کی اولاد مصنف کے زمانے تک باقی تھی۔

اسمٰعیلی مبلّغوں نے بھی سندھ میں تبلیغ کا کام کیا۔ حسین بن منصور معروف بہ حلّاج بھی قرمطی دعاۃ کے رنگ میں جہان بھر میں پھرے، بصرہ سے وہ اہواز ہوتے ہوئے ہندوستان بھی آئے اور ایک مدّت یہاں ٹھہرے اور خلقت کو خدا کی طرف دعوت دیتے رہے۔ یہ وہی بزرگ ہیں، جن کے دعوائے انا الحق سے ایرانی شاعری گونج اٹھی تھی۔ ان کی تاریخ وفات ۳۰۹ھ ہے۔ ان میں سے پیر صدرالدین کا نام مشہور ہے۔ انہیں مبلّغوں نے سندھ کے متصلہ گجرات میں بھی تبلیغ کی، مگر یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اس موقع پر پہلی دفعہ اسلام گجرات اور کاٹھیاواڑ میں پہنچا، اسلام تو پہلی صدی ہجری کے نصف اوّل ہی میں یہاں پہنچ چکا تھا۔ اسلام سے تقریباً سو سال پہلے سے لے کر منصور عباسی کے زمانے تک یہاں ولبھی راجوں کی حکومت تھی۔ جن کو عرب بلہارا ے کہتے تھے اور وہ مسلمانوں کے ساتھ بہت رواداری کا سلوک کرتے تھے۔ چنانچہ ابن حوقل لکھتا ہے: "فاھل سندان (یعنی جنوبی کچھ) اور صیمور (یعنی چول)، اور کنبایت میں جامع مسجدیں ہیں اور احکام اسلام کی تعمیل وہاں کھلے طور پر ہوتی ہے۔" ایک اور مقام پر یہی سیاح اور مصنف لکھتا ہے: "ان اطراف میں کفر غالب ہے۔ مگر اس میں مسلمان بھی ہیں۔ یہاں کے معاصر بلہرا کی طرف سے ان پر صرف مسلمان حاکم مقرر ہوتے ہیں۔ مسلمان یہ منظور نہیں کرتے کہ ان پر سوا مسلمان کے کوئی اور حاکم ہو اور حدود کے اجراء کرنے والا اور ان کے خلاف گواہی دینے والا لازم ہے کہ مسلمان ہو۔ ہاں، جن علاقوں میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے۔ وہاں اگر کوئی غیر مسلم جو پارسائی میں نمایاں ہو، اس پر اگر خصم کو جرح کی اجازت ہو اور مسلمان اسے معتبر قرار دیں تو اس کی شہادت کا امضاء ہو جاتا ہے، اور اس کے بیان پر مسلمانوں سے حق دلایا جاتا ہے۔"

ذکر یہ ہو رہا تھا کہ اسمٰعیلی دعوت کے ماتحت یمن سے ایک داعی عبداللہ نامی

سنہ ۴۶۰ھ میں کنبایت میں آیا۔ اس نے تجارت پیشہ لوگوں میں تبلیغ کی۔ اور بوہرے توجن کو مسلمان کیا۔ بوہرہ تاجر کے معنی میں ہے۔ اور مسلمان اور ہندو دونوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ ان کی تعداد اس زمانے میں ڈھائی لاکھ سے بھی زیادہ ہے۔ یہ شیعہ بھی ہیں اور سنی بھی۔ بعض شیعہ بوہرے کہتے ہیں کہ ان کے اجداد عرب اور مصر سے آئے۔ مگر بیشتر بوہرے ہندو اصل سے ہیں۔

اولیاء اللہ اور صوفیائے کرام

مسعود سالار غازیؒ

سالار مسعود غازیؒ کا نام شمالی ہند کی پہلی اسلامی فتوحات کے زمانے کی یاد کو تازہ کرتا ہے۔ سلطان محمود نے سنہ ۱۰۱۸ھ میں دریائے گنگا کو عبور کر لیا تھا۔ اور اس کے جرنیلوں یا سالاروں نے اودھ کے علاقے کی تسخیر کا کام شروع کر دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن بہادروں نے دریائے گنگا کے معاون دریا گھاگرا کے پار کے علاقے کی تسخیر اپنے ذمّے لی تھی۔ ان میں سالار ساہو یعنی سالار مسعودؒ کے والد ماجد بھی شامل تھے۔ گھاگرا پار کے علاقے میں بھرائچ، گونڈہ، بستی اور گورکھپور شامل ہیں۔ اس علاقہ کے شمال میں نیپال ہے۔ اس کی مغربی حد دریائے گھاگرا ہے۔ اس کے جنوب اور جنوب مغرب میں ضلع بارہ بنکی ہے۔ عہدِ اکبری میں گونڈے کا مغربی حصّہ بھی سرکار بھرائچ میں شامل تھا اور اسی عہد سے شہر بھرائچ کو سرکار بھرائچ کا صدر مقام قرار دیا گیا تھا۔ یہ حیثیت بھرائچ کو آج تک حاصل ہے۔ اس علاقے میں ایک قوم آباد تھی جس کو بھر کہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ "بھرائچ" کا لفظ اسی قوم کے نام سے ماخوذ ہے۔ ان کے تمّرد و عصیان اور اسلام دشمنی کا ذکر سلطان محمود کی وفات سے دو سو سال بعد بھی تاریخ میں مذکور ہے، جبکہ ناصر الدین محمود ابن ایلتتمش اودھ کے پہلے مسلمان گورنر نے ان

کا قلع قمع کیا۔ اور دوبارہ اسلامی حکومت اس علاقے میں قائم کی۔

سالار مسعود جن کی یاد میں آج ہم گفتگو کر رہے ہیں۔ ان کا تعلق اس اولین چپقلش سے ہے جو عساکر اسلامیہ اور بھروں کے درمیان ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب سلطان محمود نے ۴۲۱ھ میں وفات پائی تو اس کا زبردست ردِ عمل ہندوستان میں ہوا، اور اس سے تین ہی سال بعد بھرائچ جیسے دور دست علاقے سے اسلامی فوجوں کو نکال باہر کرنے کی ایک کامیاب کوشش ہوئی اور بھرائچ اور اس کے اطراف کو خونِ شہداء سے لالہ زار بنا دیا گیا۔

سر تا سر دشت خاوران سنگی نیست ؛ کز خونِ دل و دیدہ بر آن رنگی نیست

افسوس ہے کہ اس خونچکاں داستان کی تفصیل صفحاتِ تاریخ میں محفوظ نہیں کی گئی۔ ضیاءالدین برنی ہمارے علم میں وہ پہلا مؤرخ ہے، جس نے ان واقعات کے وقوع سے تین سو سال بعد "سپہ سالار مسعود شہید" کا ذکر کیا ہے۔ جنہیں وہ سلطان محمود سبکتگین کے غازیوں میں سے ایک قرار دیتا ہے۔ مگر تاریخ کی کمی نیم تاریخی، نیم اساطیری روایتوں نے پوری کر دی اور "مرآۃ مسعودی" کے نام سے ایک کتاب گیارھویں صدی ہجری میں حضرت سالار کے حالات میں لکھی گئی۔ اس کا اردو ترجمہ بھی چھپا ہے۔

کہتے ہیں کہ ۴۰۰ھ میں سلطان محمود غزنوی کو اطلاع ملی کہ ہندوؤں نے اجمیر کے قلعے میں ایک مسلمان سردار کو گھیر لیا ہے۔ سلطان نے ۴۰۱ھ میں ایک زبردست لشکر سالار ساہو کی سرکردگی میں اس مہم کو سر کرنے کے لئے بھیجا۔ کہتے ہیں کہ سالار ساہو حضرت علیؓ کے بیٹے محمد بن الحنفیہ کی اولاد میں سے تھے۔ اور سلطان محمود غزنوی کے بہنوئی تھے۔ واللہ اعلم!

سلطان ساہو قندھار اور ٹھٹھے کی راہ سے اجمیر پہنچا اور جنگ کے بعد اس نے غنیم کو بھگا دیا۔ جس نے قنوج میں جا کر پناہ لی۔ سالار ساہو نے ان حدود میں اور فتوحات بھی حاصل کیں۔ ۲۱ رجب ۴۰۵ھ ہجری کو اجمیر میں اسے خدا نے ایک فرزند عطا کیا۔ جس کا نام مسعود رکھا گیا۔ یہی مولودِ مسعود بعد میں سالار مسعود غازی کے نام سے مشہور ہونے والا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس بچے کو ضروری تعلیم دلائی گئی اور اس کے علاوہ فنونِ ضرب وحرب مثلاً نیزہ بازی، تیر اندازی، اور گوے وچوگان بھی اُسے سکھائے گئے۔ جب سلطان محمود نے سومنات پر حملہ کیا تو سالار ساہو اور ان کا فرزندِ رشید دونوں سلطان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نوجوان مسعود نے اس معرکے میں بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیئے اس مہم کے خاتمے پر وہ سلطان کے ہمراہ غزنی گئے۔ اور کچھ عرصے کے بعد سلطان کی اجازت سے ہندوستان واپس آئے۔ ان کی عمر اُس وقت سولہ سال سے بھی کم تھی ان کے باپ نے گیارہ ہزار فوج ان کے ہمراہ کی۔ اور یہ فوج لے کر وہ ملتان آئے۔ وہاں کا حاکم انگپال خوف کے مارے بھاگ گیا۔ پھر اُنھوں نے اجودھن فتح کیا۔ اور برسات بھر وہاں مقیم رہے۔ پھر دہلی کی طرف کوچ کیا اور دہلی فتح کی۔ ۶ ماہ تک وہاں قیام کرنے کے بعد میرٹھ کا رُخ کیا۔ حکام میرٹھ نے اطاعت قبول کی۔ سالار مسعود قنوج کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں کا راجہ بھی اطاعت سے پیش آیا۔ اور سالار نے ضلع بارہ بنکی کے مقام "ستر کھ" میں اپنی چھاؤنی قائم کی اور افواج کو اطراف میں یلغار کے لئے بھیجا۔ سید سیف الدین اور میاں رجب کوتوالِ فوج نے بہرائچ پر فوج کشی کی۔ دوسرے سالار اور مقامات کی طرف روانہ ہوئے۔ اس عرصہ میں رایانِ کڑہ مانک پور نے رایانِ بہرائچ کو ترغیب دی کہ ان کے ساتھ مل کر مسلمانوں کو نرغے میں لے لیں۔ مگر سالار ساہو

نے، جو اس وقت اپنے بیٹے کے پاس پہنچ چکے تھے، کڑہ اور مانک پور کے راؤں پر حملہ کر کے انہیں گرفتار کر لیا اور مفتوحہ علاقے میں اپنے حاکم مقرر کئے۔ لیکن باقی رایانِ اطراف نے بہرائچ میں سید سیف الدین کو محصور کر لیا، ان نے امداد کے لئے سالار مسعود کو لکھا۔ ۱۷ شعبان ۴۲۳ھ کو سالار مسعود اپنے والد کی اجازت سے بہرائچ پہنچے اور غنیم کو مار بھگایا۔ ان کی روانگی سے دو ماہ کے بعد "ستر کھ" میں ان کے والد سالار ساہو نے انتقال کیا۔

اسی زمانے میں تہرب و جوار کے ۲۱ راؤں نے سالار مسعود کو ابلاغ نہائی یعنی الٹی میٹم بھیجا کہ ہمارے علاقے سے چلے جاؤ۔ سالار نے اس الٹی میٹم کو ٹھکرا دیا۔ اس پر راؤں نے اپنی فوجوں کو دریائے کوڑیالہ پر جمع کیا جو دریائے گھاگرا کے بالائی حصے کا نام ہے۔ سالار مسعود نے انہیں بار بار شکست دے کر بکھیر دیا اور ایک ہفتے کے قیام کے بعد بہرائچ واپس آئے اور سورج کنڈ کے گرداگرد ایک بہت بڑا باغ بنوایا اور اسی کو اپنا مدفن قرار دیا۔

چار ماہ بعد رائے سوہل دیو والی سنجولی" اور بہر دیو والی سنیلونہ" نے اطراف کے دشت و جبل کے راؤں کو پھر جمع کیا۔ حدود نیپال سے پہاڑوں کے نیچے نیچے گھاگرا تک فوجِ مخالف کی کثیر تعداد نے پڑاؤ کیا تھا۔ لشکرِ اسلام نے ان سے زبردست لڑائیاں لڑیں، مگر مسلمانوں کی تعداد مقابلے میں بہت کم تھی۔ ۱۳ رجب ۴۲۴ھ کو آخر شب سالار مسعود پر جو شہر بہرائچ سے ایک کوس پر تھے، دشمنوں نے حملہ کیا۔ سالار اور ان کے ساتھی پیادہ اور سوار صبح سے دوپہر تک بڑی بے جگری سے لڑتے رہے۔ دو تہائی کے قریب ان کا لشکر شہید ہوا۔ متعدد امیرانِ کار گذار کام آئے۔ شہیدوں کو سورج کنڈ اور غاروں اور کنوؤں میں ڈالا گیا۔ سالار نے گھوڑے سے اتر کر وضو کیا اور بعد نمازِ ظہر

شہیدوں کا جنازہ پڑھا اور اپنے باقی ماندہ ساتھیوں کو لے کر دشمن پر پل پڑے۔ سوہل دیو اور بہر دیو نے بھاگ کر ایک ٹیکرے پر دم لیا۔ پھر خندقوں کی آڑ لے کر باغ کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور فوجِ قلیل پر، جو باغ میں بچ رہی تھی، تیر برسائے۔ ناگاہ سوہل دیو کی کمان سے ایک تیر سالار مسعود کی گردن میں لگا۔ انہوں نے صدمۂ درد سے آہ کی، اور کلمۂ شہادت زبان پر لائے، اور جان جان آفریں کے سپرد کی۔ ؏

دوست بر دوست رفت یار بر یار

؎ این جانِ عاریت کہ بحافظ سپرد دوست ۔ روزی رخش ببینم و تسلیم وے کنم

۱۴ رجب ۴۲۴ھ کو یک شنبے کے دن اول وقتِ نمازِ عصر حضرت سالار مسعود نے شہادت پائی۔ اُن کی قبر کے کتبے کے مطابق اُن کی عمر اُس وقت ۱۹ سال ۴ دن تھی۔ اُن کی شہادت کے بعد یہ علاقہ مسلمانوں کی فوجوں سے خالی ہو گیا۔

"خزینۃ الاصفیاء" میں ہے کہ حضرت سالار مسعودؒ کی شہادت کے بعد بہت سے خوارق و کرامات اُن سے سرزد ہوئے۔ وہ بہرے کے ایک درخت کے نیچے انہیں دفن کیا گیا تھا۔ ایک بانجھ عورت قبر پر آئی اور دُعا مانگی۔ خدا نے اُسے بیٹا عطا کیا۔ اس نے آپ کی کرامت کا ذکر جا بجا کیا۔ ردولی ضلع بارہ بنکی کی ایک مادر زاد اندھی سیدلڑکی ان کی رُوحانیت کی طرف متوجہ ہوئی۔ خدا نے اُسے بینائی بخشی۔ اُس نے بہرائچ میں آکر پہلی مرتبہ قبر پر روضہ بنوایا۔

ضیاء الدین برنی نے (صفحہ ۴۹۱ پر) لکھا ہے کہ محمد تغلق نے ۷۴۱ھ میں عین الملک کی بغاوت فرو کرنے کے بعد بہرائچ آیا اور سپہ سالار مسعودؒ کی قبر کی زیارت کی۔ اور مجاورانِ روضہ کو بہت سے صدقات دیئے۔ ۷۷۶ھ میں فیروز تغلق نے بہرائچ میں چند دن

مقام کیا اور سپہ سالار مسعودؒ کی قبر کی زیارت کی۔ ایک شب حضرت سالارؒ اسے خواب میں نظر آئے اور اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا، یعنی اشارہ کیا کہ بڑھاپے نے غلبہ پا لیا ہے بادشاہ کو اب آخرت کی فکر کرنی چاہئے۔ سلطان نے صبح ہوتے ہی سر منڈوا دیا، اور وہ ایک صاحب سجّادہ معلوم ہونے لگا۔ اس کی مملکت اور روشِ ہائے سلطنت میں جو باتیں شریعت کے خلاف تھیں وہ سب دُور کر دیں۔ اور محصولاتِ نامشروع اور وجوہاتِ ناجائز بند کر دینے کا حکم دیا۔ کہتے ہیں کہ درگاہ کے احاطے کی دیوار اور بعض عمارتیں سُلطان فیروز تغلق نے بنوائیں۔

مزار مبارک پر، جو شہر بہرائچ سے ۱½ میل کے فاصلے پر ہے، ہر سال جیٹھ کے مہینے میں میلہ لگتا ہے، جس میں لاکھ سے زیادہ آدمی (ہندو اور مسلمان) جمع ہوتے ہیں، اور چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ ایک خصوصیّت اِس میلے کی یہ ہے کہ اس میں زائرین اپنے ساتھ لمبے لمبے بانسوں کے علَم لاتے ہیں، جنہیں چھڑیاں بھی کہتے ہیں۔ ان پر رنگ برنگ کے کپڑوں کی جھنڈیاں لگی ہوتی ہیں۔ بانس کے سرے پر کچھ نقدی باندھی ہوتی ہے۔ جس سے درگاہ کے گنبد کے کلس کو چھُوتے ہیں۔ پھر نقدی پیش کرتے ہیں۔ اگر زائر کی مراد پُوری ہو گئی، تو وہ جھنڈی کو مزار ہی پر چھوڑ جاتا ہے، ورنہ واپس لے جاتا ہے۔

"اخبار الاخیار" میں ہے کہ چھڑیوں کی بدعت شروع میں نہ تھی سالار غازیؒ کی وفات سے چار سو سال بعد شروع ہوئی۔ یعنی نویں صدی ہجری سے۔ گویا حملۂ تیمور کے بعد۔ کہتے ہیں کہ ہندوستان کے ایک لاولد راجہ نے مقبرۂ سالار غازی پر منّت مانی کہ اگر اُس کے ہاں لڑکا ہُوا تو وہ ایک بڑا سا جھنڈا، کمخواب کا غلاف چڑھا کر، اور چاندی سونے کے آویزے اس میں لٹکا کر دروازۂ خانقاہ پر نصب کرے گا۔ اسی سال لڑکا پیدا

ہوا، تو اس نے اپنی نذر پوری کی۔ اُس دن سے یہ رواج ہوا کہ لاولد لوگ اِس طرح سے نذر مانتے ہیں، اور مُراد کے پُورا ہونے پر ایفائے نذر کرتے ہیں۔ ہر سال بڑے بڑے شہروں مثلاً لاہور، دہلی وغیرہ میں سینکڑوں علم جمع کرتے ہیں اور ڈفالی علم کے آگے آگے دَف بجاکر چلتے ہیں۔ جو لوگ خود نہیں بجاسکتے وہ کسی میدان میں دن بھر علموں کو جمع رکھتے ہیں۔ شام کو علموں کا تمام سامان، بانس، کپڑا، آویزے سب ڈفالیوں کو دے دیئے جاتے ہیں۔ ورنہ قافلۂ زائرین جمع ہو کر بہرائچ جاتا ہے [یہ تقسیم ہند سے پہلے کا ذکر ہے، اب کا حال معلوم نہیں]۔

"اکبر نامہ" میں ہے کہ ہندوستان میں رسم ہے کہ لوگ ہر سال رنگا رنگ کے علم بناتے ہیں اور بہت سی نذروں کے ساتھ انہیں بہرائچ لے جاتے ہیں۔ چنانچہ آگرے کے نواح میں باہر سے لوگ آکر جمع ہوتے ہیں، شہر کے بھی بے شمار لوگ اِس مجمع میں جاملتے ہیں اور روانگی سے پہلے یہ مجمع کئی راتوں تک رَتجگا کرتا ہے۔ اژدہام عظیم ہوتا ہے، جس میں اچھے، بُرے، صالح و طالح سبھی جمع ہوتے ہیں۔ ایک دفعہ اکبر بادشاہ بھی بھیس بدل کر سیر تماشے کی غرض سے اِس مجمع میں پہنچ گیا۔ کسی نے پہچان لیا اور کہا ارے یہ تو بادشاہ ہے۔ اکبر نے سنا تو جھٹ آنکھ کو بھینگا اور مُنہ کو ٹیڑھا کرلیا، اور بدستور سیر میں مصروف رہا۔ ان لوگوں نے بغور بادشاہ کو دیکھ کر کہا: ایسی آنکھ اور ایسا مُنہ بادشاہ کا نہیں ہے۔

"خلاصۃ التواریخ" میں جو شاہ اورنگ زیب کے عہد میں تصنیف ہوئی لکھا ہے کہ "گروہ در گروہ لوگ دُور دُور سے زرّیں علم لے کر زیارت کو آتے ہیں، میلہ لگتا ہے۔ بہت سی نذریں پیش کی جاتی ہیں"۔

مولوی سید احمد صاحب "فرہنگِ آصفیہ" کہتے ہیں : "ہر سال قلعۂ مبارک کے نیچے چار گھڑی دن رہے چھڑیاں کھڑی کی جاتی ہیں، اور میدانی جمع ہو کر بہرائچ جاتی ہے۔"

"فرہنگِ قبائل و اقوامِ پنجاب و صوبۂ سرحد" (صفحہ ۶۲۴) میں ہے کہ ماگھ کے مہینے میں ہر بُدھ کو ہندوؤں کی بستیوں میں نشان کا میلہ لگتا ہے۔ سالار مسعود غازی رح نے جب یہ علاقہ فتح کیا، تو میوؤں کو مسلمان بنایا۔ تین پشتینی فقیر سالار کی چھڑی کھڑی کر کے گیت گاتے ہیں اور اسے گاؤں گاؤں لے جاتے ہیں۔

اس مردِ غازی کو خواص و عوام میں جو مقبولیت حاصل ہوئی، اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ انہیں بہت سے القاب سے یاد کیا جاتا ہے چنانچہ گیارھویں صدی ہجری کا ایک مصنف (صاحبِ معارج الولایت) تصدیق کرتا ہے کہ انہیں بہت سے القاب سے یاد کیا جاتا تھا۔ نواحِ دہلی میں انہیں "پیرِ حلیم" کہتے ہیں، اور دیارِ خراسان میں "رجب سالار"، اور بعض جگہوں میں انہیں "غازی میاں"، "بالے میاں" اور "بالا پیر" اور "ہٹیلا پیر" بھی کہتے ہیں۔ اور ان کا لقب "سلطان الشہداء" ہے۔ اسی مصنف نے "مرآۃ سکندری" کے حوالے سے لکھا ہے کہ: "حق سبحانہٗ نے انہیں ولی مادر زاد بنایا تھا، اور اپنے اجداد کرام کے طریقے پر وہ جہادِ اصغر و اکبر میں ساعی رہے ملک رانی کے اشغال کے باوجود وہ شغلِ باطن سے بھی غافل نہ ہوتے تھے۔"

خلاصہ اس گفتگو کا یہ ہے کہ اس نوجوان مردِ غازی نے جب تک اس کے دم میں دم رہا، اعلاء کلمۃ الحق میں سعی کی۔ اور اپنی خداداد قوتوں کو دین کی راہ میں بے دریغ صرف کیا۔ یہاں تک کہ آپ اور آپ کے ساتھیوں پر کربلا وارد ہوئی۔ اس لئے کہ

دین زندہ رہے۔ چنانچہ سنّتِ الٰہی کے مطابق دین اس کربلا کے بعد بھی زندہ ہوا۔ اسی طرح مردِ غازی کے نام اور ان کے کارناموں کو بھی حیاتِ جاوید بخشی گئی۔

حضرت داتا گنج بخشؒ

حضرت داتا گنج بخشؒ کا نام علی اور اُن کے والد ماجد کا نام عثمانؒ تھا۔ اُن کا پورا نسب اور اُن کی نسبت یہ ہے:- علیؒ بن عثمانؒ بن علی الجلّابی ثم الہجویری الغزنوی۔ ان کی کنیت ابوالحسن ہے۔ "حدائق الحنفیہ" میں ہے کہ آپ کا شجرۂ نسب امام حسنؓ تک پہنچتا ہے۔ ان کا تمام گھرانا زہد و تقویٰ کا گھرانا تھا۔ "سفینۃ الاولیاء" میں ہے کہ حضرت داتا صاحب کی اصل افغانستان کے شہر غزنین سے ہے۔ جُلّاب اور ہجویر غزنین کے دو محلّے ہیں۔ آپ پہلے ایک محلّے میں رہتے تھے۔ پھر دُوسرے میں منتقل ہوئے۔ اِس لئے انہیں کبھی جُلّابی اور کبھی ہجویری کہتے ہیں۔ اُن کے والد بزرگوار کی قبر غزنین میں ہے۔ اور ان کی والدۂ ماجدہ کی قبر بھی اسی شہر میں داتا صاحب کے ماموں تاج الاولیاء کی قبر سے متّصل ہے۔ ان تمام قبروں کی زیارت شہزادہ دارا شکوہ نے خود کی (زبیری صاحب کمشنر بہاولپور نے ۲۶ اکتوبر ۱۹۵۹ء کو مجھے بتایا کہ یہ قبریں اب بھی موجود ہیں۔ وہ غزنی گئے تھے اور انہوں نے اِن قبروں کو موجود پایا)۔

"گنج بخش" جناب ہجویری کا لقب ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ آپ کے مزار پر معتکف رہے، جاتے وقت یہ مشہور شعر

گنج بخش فیضِ عالم مظہرِ نُورِ خدا ٭ ناقصاں را پیرِ کامل، کاملاں را راہنما

جس میں آپ کو گنج بخش کہا ہے، پڑھا۔ مگر بعض قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو آپ کی زندگی ہی میں اس لقب سے ملقب کیا گیا تھا۔

مختلف تذکروں میں داتا صاحب کا کچھ نہ کچھ حال دیا ہے، "نفحات الانس" میں انہیں "عالم و عارف" کہا ہے۔ اور "سفینۃ الاولیاء" میں ہے کہ ان کے خوارق و کرامات حدِ حصر سے زیادہ ہیں۔ اور "حدائق الحنفیہ" میں ہے کہ آپ اولیاء متقدمین میں سے ہیں۔ جامع علوم ظاہری و باطنی، عابد، زاہد، متقی، مظہرِ خوارق و کرامات اور حنفی المذہب، لیکن مفصل حالات پرانے تذکرہ نویسوں میں سے کسی نے نہیں لکھے، یہاں تک کہ ان کی تاریخ ولادت و وفات اور ان کے ورودِ لاہور کی تاریخ بھی قطعی طور پر معلوم نہیں۔ اندازے سے کہا جاتا ہے کہ ان کی ولادت پانچویں صدی ہجری کے شروع میں ہوئی ہوگی۔ اور وفات کی تاریخ مشہور ۴۶۵ھ اور ۴۶۹ھ کے درمیان بتائی جاتی ہے۔ مگر قیاس چاہتا ہے کہ ان کا وصال اس سے بہت بعد ہوا، اس کی دلیل ابھی بیان ہوگی۔ مواد کی اس قلت کے باوجود داتا صاحب کی کتاب "کشف المحجوب" میں ان کی زندگی کے بعض کوائف اتفاقاً مذکور ہو گئے ہیں۔ انہیں پر اعتماد کر کے چند باتیں عرض کی جاتی ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید طریقِ تصوّف پر گامزن ہونے سے پہلے داتا صاحب پر ایک دور ایسا بھی گذرا، جس میں وہ عراق میں مقیم اور دنیا طلبی اور فناء اموال میں بے چینی کے ساتھ مصروف رہتے تھے۔ اس زمانے میں انہوں نے بہت سا قرض بھی لے لیا تھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہر کسی کی بیہودہ فرمائش مجھے برداشت کرنا پڑتی تھی۔ لوگ میری طرف رخ کرتے تھے اور میں اُن کی خواہشات کے سرانجام دینے کی مشکل

میں گرفتار تھا۔ اس وقت سیّدان وقت میں سے ایک نے مجھے یہ خط لکھا: "دیکھو بیٹا! جو دل ہوا و ہوس میں مشغول ہے۔ اُس کی خاطر سے تم اپنے دل کو خدائے عزّوجلّ سے نہ ہٹاؤ۔ ہاں، اگر تم ایسے دل کو پاؤ جو تمہارے دل سے گرامی تر ہو، تو اس دل کو راحت دینے کی خاطر تم بے شک اپنے دل کو مشغول کرو، ورنہ رُک جاؤ۔ اس لئے کہ بندۂ دل کے لئے خدا خود کافی ہے"۔ داتا صاحب لکھتے ہیں کہ اس بات سے مجھے فوراً سکونِ دل حاصل ہو گیا۔

ایک دوسرے مقام پر آپ نے اپنی زندگی کا ایک اور واقعہ بھی بیان فرمایا ہے۔ بظاہر ان کے دُنیا کو ترک کرنے کے بعد یہ واقعہ پیش آیا۔ وہ کہتے ہیں۔ "میں، کہ علی ابن عثمان الجلابی ہوں، گیارہ سال تک شادی کی آفت سے محفوظ رہا۔ مگر میری تقدیر میں تھا کہ میں آزمائش میں پڑوں، میں نے طرفِ ثانی کو دیکھا بھی نہ تھا۔ مگر جو صفت میرے سامنے بیان ہوئی، میرا ظاہر و باطن اس کا اسیر ہوا، اور میں کامل طور پر اس میں منہمک ہو گیا۔ نزدیک تھا کہ میرا دین تباہ ہو جائے۔ حق تعالیٰ نے اپنے کامل فضل اور پوری مہربانی سے اپنی نگہداری کو میرے ناچار دل کی حفاظت کے لئے بھیجا اور اپنی رحمت سے مجھے نجات عطا فرمائی۔ والحمد للہ علی جزیل نعمائہٖ"۔

یوں تو داتا صاحب نے بہت سے مشائخ کی صحبت سے فیض پایا۔ لیکن انہوں نے حضرت ابوالعباس شقانی کی نسبت لکھا ہے کہ: "مجھے ان سے کمال انس تھا، اور وہ بھی مجھ پر سچی شفقت فرماتے تھے۔ بعض علوم میں وہ میرے استاد تھے"۔ یہ بزرگ نہ صرف اہلِ تصوّف کے بزرگانِ اجلّ میں سے تھے۔ بلکہ مختلف اصولی اور فروعی علموں میں امام بھی تھے۔ یہ تو تھا علم ظاہر۔ امورِ باطن میں داتا صاحب نے شیخ ابوالفضل محمّد

ابن حسن الختّلی سے فیض پایا۔ خُتّل یا ختلان بدخشان کے مغرب میں دریائے جیحون کے دائیں کنارے پر ایک علاقے کا نام ہے۔ کبھی اس نام کا اطلاق خراسان کے مشرق اور شمال کے تمام بلاد پر بھی ہوتا ہے۔ جناب ختّلی کی نسبت داتا صاحب فرماتے ہیں: "میں طریقت میں ان کا پیرو ہوں، وہ علمِ تفسیر و روایات کے عالم تھے اور تصوّف میں مذہب جنید کے پابند تھے۔ حُصری کے مرید اور اُن کے راز دار تھے ــــ سچّی گوشہ نشینی کی وجہ سے ساٹھ سال تک گوشوں میں چھپا کئے۔ اور اپنا نام خلقت کے درمیان گم کر دیا۔ وہ اکثر جبلِ لُکّام میں رہا کرتے تھے"۔ جبل لُکام سلسلۂ کوہِ لبنان (ANTI-TAUTUS) کا وہ حصّہ ہے، جو انطاکیہ اور مُصّیصہ کے متصل ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ جناب ختّلی نے لمبی عمر پائی، وہ صوفیوں کے لباس اور ان کی رسوم کے پابند نہ تھے، بلکہ اہلِ رسم کے ساتھ سختی سے پیش آتے تھے۔ اس کے بعد داتا صاحب فرماتے ہیں کہ "ایک دن میں اُن کے ہاتھ دُھلا رہا تھا کہ میرے دل میں خیال گذرا کہ جب کام تقدیر اور قسمت سے بنتے ہیں تو کیا ضرور ہے کہ آزاد لوگ خود کو بوڑھوں کا غلام بنائیں۔ شیخ نے مجھے مخاطب کر کے کہا: "بیٹا! میں جانتا ہوں کہ تم نے کیا سوچا ہے، تمہیں معلوم ہے کہ ہر حکم کا ایک سبب ہوتا ہے۔ جب خدا کو یہ منظور ہوتا ہے، کہ وہ ایک عوّان بچے کے سر پر تاجِ کرامت رکھے، تو اسے توبہ کی توفیق دیتا ہے اور اپنے دوست کی خدمت میں مشغول کر دیتا ہے۔ غرض یہ ہوتی ہے کہ یہ خدمت اس کی کرامت کا سبب بن جائے"۔ عوّان دیوانِ سلطانی کے سرہنگوں کو کہتے ہیں۔ اس قصّے سے گمان گذرتا ہے کہ داتا صاحب کے بزرگوں میں سے شاید کسی کا تعلق کبھی اس گروہ سے رہا ہو، مگر اَور کسی مآخذ سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ دمشق کے قریب ایک گاؤں

ہے، جیسے "بیت الجن" کہتے تھے۔ جناب ختلی کا انتقال اس گاؤں میں ہوا۔ جب ان کا وقت قریب آ پہنچا تو داتا صاحب کو یہ وصیّت کی: "تمہیں معلوم رہے کہ ہر مقام پر نیک و بد حال پیدا کرنے والا خدائے عزّوجلّ ہے۔ تمہیں چاہیئے کہ اس کے کام پر جھگڑا نہ کرو اور دل کو رنجیدہ نہ ہونے دو۔" اس کے سوا آپ نے اور کوئی وصیّت نہ کی، اور جان بحق تسلیم کی۔

"تاریخ الاسلام" میں علامہ ذہبی نے جناب ختلی کی تاریخ وفات ۴۶۰ھ دی ہے۔ یہ صحیح ہے تو داتا صاحب کی تاریخ وفات شاید ۴۶۵ھ نہ ہو گی، جو مشہور ہے۔ اس لئے کہ اس صورت میں ان کے سفر لاہور اور قیام لاہور کے لئے صرف چار پانچ سال بچتے ہیں۔

داتا صاحب نے بارہا تجرید و توکّل کے قدم پر طول طویل سفر کئے۔ سارے عالم اسلام میں حدودِ شام سے ترکستان تک اور بحیرۂ خزر سے لاہور تک وہ پھرے نکلے اور بہت سے صوفیان و مشائخ کرام سے ملاقات اور ان سے استفادہ کیا۔ مثلاً شیخ ابو القاسم گرگانی، شیخ ابو سعید ابی الخیر، اور شیخ ابو القاسم قشیری رحمہم اللہ سے۔ آپ نے ان بزرگوں سے مختلف مسائل پر گفتگو کی۔ اور اس طرح سے اقوال کا وہ قیمتی مواد جمع کیا جس سے انہوں نے اپنی کتاب "کشف المحجوب" کے صفحوں کو زینت بخشی، اور ان مسائل کے متعلق صحیح نتائج اخذ کئے۔ اور اپنی عالمانہ رائیں بھی درج کیں۔

"کشف المحجوب" داتا صاحب کی واحد تصنیف ہے جو ہم تک پہنچی۔ اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ داتا صاحب نے نو (۹) کتابیں اور بھی لکھیں۔ مگر وہ سب کتابیں اب ناپید ہیں۔

ب "کشف المحجوب" کے متعلق مولانا جامی لکھتے کہ یہ کتاب (فن) تصوّف کی مشہور اور معتبر کتابوں میں سے ہے۔ اور اس میں مصنّف نے بہت سے لطائف و حقائق جمع کر دیئے ہیں۔ دارا شکوہ نے لکھا ہے کہ "کشف المحجوب" میں کسی کو جائے سخن نہیں۔ وہ ایک کامل مرشد ہے۔ تصوّف پر جو کتابیں فارسی میں لکھی گئیں ان میں سے کوئی بھی اس کتاب کی خوبی کو نہیں پہنچتی۔

داتا صاحب نے یہ کتاب اپنی عمر کے آخری حصّے میں تصنیف کی اور کم از کم اس کا ایک حصّہ لاہور میں لکھا۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں: "اس وقت (اس موضوع پر) اس سے زیادہ لکھنا ممکن نہیں۔ اس لیے کہ کتابیں دارالسلطنت غزنی حرسہا اللہ میں ہیں۔ اور میں دیارِ ہند میں لاہور کے شہر میں، جو ملتان کے مضافات میں ہے۔ ناجنسوں کے درمیان گرفتار ہوں" اس عبارت سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ تحریر کتاب کے وقت داتا صاحب کے پاس کوئی تحریری موادّ مراجعت کے لئے موجود نہ تھا۔ درجنوں آیاتِ شریفہ، ۱۳۷ احادیث اور ۷۵ عربی اشعار جو اس کتاب میں آئے ہیں ان کا زبانی لکھ لینا تو چنداں دشوار نہ تھا، مگر تقریباً تین سو اقوالِ مشایخ اور بیس اکیس کتابوں کی عبارتیں جو بقیدِ مصنّف کتاب میں درج ہیں ان کا حافظے سے درج کرنا قرینِ قیاس نہیں۔

"کشف المحجوب" کی ترتیب یہ ہے کہ جناب ہجویری نے اپنے ہم وطن ابو سعید ہجویری کا ایک سوال نقل کیا ہے۔ اس میں سائل نے تحقیقِ طریقت کا بیان داتا صاحب سے چاہا ہے۔ اور صوفیوں کے مقامات، ان کے مذاہب و مقالات اور ان کے رموز و اشارات کی تشریح آپ سے طلب کی ہے۔ محبّتِ خدا اور اس کے دلوں میں ظاہر ہونے کی کیفیت پوچھی ہے۔ اس کی کنہ و ماہیت سمجھنے میں عقلوں پر جو حجاب چھا جاتے

ہیں، ان کا سبب دریافت کیا ہے۔ داتا صاحب نے ساری کتاب اس سوال کے جواب دینے کیلئے لکھی ہے۔ انہوں نے ابتدائے اسلام سے شروع کر کے تصوّف کا پورا حال بیان کیا ہے۔ صحابۂ اہل بیت، تابعین، اتباع تابعین، اور متاخرین، صوفی اماموں کو، پھر عرب و عجم کے رجالِ صوفیہ کو گنا ہے اور اُن کا حال دیا ہے۔ اس کے بعد کتاب کا اہم ترین باب ہے یعنی مختلف صوفی فرقوں کا فرق، ان کے مذاہب و آیات و مقامات وحکایات۔ اس باب میں گیارہ صوفی فرقوں کا حال بیان کیا ہے اور اکثر فرقوں کا حال بیان کرنے میں تصوّف کے ایک یا زیادہ نکتوں کی مفصل تشریح کی ہے۔ اس باب کے بعد کشف و حجاب کے گیارہ باب دیئے ہیں۔ جن میں تصوّف کے نکتۂ نظر سے ارکانِ اسلام کی تشریح کی ہے۔ صحبت کے آداب، احکام بیان کئے ہیں۔ صوفیوں کی اصطلاحات کی تشریح کی ہے۔ اور آخر میں سماع اور اس کے انواع پر بحث کی ہے۔ "کشف المحجوب" فارسی میں تصوّف کی اوّلین کتاب ہے۔ مگر اس میں تصوّف کی تمام اصطلاحیں عربی میں دی ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تصوّف کی ابتدا عرب ممالک میں ہوئی تھی۔ جناب داتا صاحب اصولِ تصوّف کے ماہر ہیں۔ اسی حیثیت سے انہوں نے یہ کتاب لکھی ہے۔ ان کا انداز مؤرخانہ نہیں ہے۔ ساری کتاب میں شاید ہی کوئی تاریخ دی ہو۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ تصوّف کے مسائل اور نکات کی تشریح کی جائے۔ وہ خود فرماتے ہیں:

> "یہ کتاب راہِ حق بیان کرتی ہے۔ کلمات کی شرح کرتی ہے اور مختلف پردے کھولتی اور ہٹاتی ہے۔"

لاہور میں "کشف المحجوب" دو تین دفعہ چھپی ہے۔ ایک عمدہ ایڈیشن لینن گراڈ اور ایک

سمرقند میں طبع ہُوا۔ اِس کتاب کا اردو اور انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

داتا صاحب نے اپنی عمر کے آخری سال لاہور میں گذارے۔ یہ غزنویوں کا دَور تھا۔ آپ نے یہاں اپنا وقت اشاعتِ اسلام، تلقین، اور تدریسِ علوم میں صرف کیا۔ اور یہیں آپ نے انتقال فرمایا۔ شاید یہ سلطان ظہیرالدین ابراہیم غزنوی کا زمانہ تھا جس نے ۴۵۱ھ سے ۴۹۲ھ تک حکومت کی۔ کہتے ہیں کہ ان کی سنگِ مرمر کی قبر اسی سلطان نے بنوائی تھی، مگر مجاور کسی کو یہ پتھر دیکھنے نہیں دیتے۔ جس سے ممکن ہے قیاسات میں کچھ مدد ملے۔ "فوائد الفواد" میں لکھا ہے کہ ۷۰۸ھ کے آخر میں حضرت نظام الدین اولیاؒ کے سامنے ایک شخص نے ذکر کیا کہ اُس نے لاہور میں داتا صاحب کے مزار کی زیارت کی ہے۔ دارا شکوہ نے "سفینۃ الاولیاء" میں لکھا ہے، کہ "داتا صاحب کی قبر شہر لاہور کے بیچ میں قلعے کے مغرب کی طرف واقع ہے۔ جمعہ کی رات کو زائرین کا ہجوم ہوتا ہے۔ میں نے خود بھی ان کے مزار کی زیارت کی ہے۔" یہ تو دارا شکوہ کے زمانے کا حال تھا، بعد کی صدیوں میں بھی اب تک زائرین بکثرت زیارت کے لئے آتے رہے ہیں اور آتے ہیں، اور حضرت کا فیضان جاری ہے۔ ۲۰ صفر کو ہر سال آپ کا عرس ہوتا ہے۔

(۲)

حضرت داتا گنج بخش اُن قدیم ترین بزرگوں میں سے ہیں، جنہوں نے پنجاب میں اسلام کا پیغام پہنچایا۔ یہ پانچویں صدی ہجری کا زمانہ تھا۔ پنجاب میں سلطان محمدؒ غزنوی کے متواتر حملوں کی وجہ سے اگرچہ مسلمانوں کی سطوت و جبروت کا سکّہ دلوں میں بیٹھ چکا تھا، لیکن عین اسی وجہ اور دیگر وجوہ سے بھی غیر مسلموں کا ردّ عمل مسلمانوں کے سخت

؂ اسی موضوع پر دوسرا مقالہ۔

خلاف تھا۔ اور ان کے دِل اسلام دُشمنی کے جذبات سے لبریز تھے۔ ایسے زمانے میں اِس ملک میں پہنچ کر انہیں لوگوں کے درمیان تبلیغِ اسلام کرنا کسی معمولی فردِ بشر کا کام نہ تھا۔ اِس مطلب کیلئے ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو عالم و عارف ہو، جس کا یقین اور ایمان پہاڑ کی طرح محکم ہو۔ جس کا صدق و صفا للّٰہیت اور بے غرضی یعنی جس کا فقر کامل ہو، جس میں تاریک روحوں کو نورِ اسلام سے منوّر کرنے کا بے پناہ جذبہ موجود ہو، جس میں جذب اور مقناطیسیت بے حساب ہو، جس کی روحانی قوّت ایسی ہو کہ دُشمن کو دوست بنا دے، جو آہنی عزم کا مالک ہو اور حالات کا غلام نہیں، ان کا آقا ہو، جسے اپنے بلند مقصد کے حصُول کے مقابلے میں اپنے آرام و آسایش کی کوئی پروا نہ ہو۔ ایسا پیرِ کامل اور کاملوں کا راہنما وہ جلیل القدر اور عظیم الشان بزرگ تھا جس کی یاد کے لئے ہم آج چند لمحے وقف کرنا چاہتے ہیں اور جس کے ذکرِ خیر سے ہم رحمتِ ایزدی کو دعوتِ نزول دیتے ہیں۔

حضرت داتا صاحب کا نام علی، ان کے والد ماجد کا نام عثمان اور دادا کا نام علی تھا۔ ان کی کنیت ابو الحسن تھی۔ وہ افغانستان کے شہر غزنی کے رہنے والے تھے ان کی تصنیف "کشف المحجوب" کے شروع میں ان کا نام و نسب و نسبت اس طرح سے بیان ہوئی ہے :۔ "علی بن عثمان بن علی الجُلّابی الغزنوی ثمّ الہجویری"۔ دارا شکوہ نے جو خود غزنی گیا تھا "سفینۃ الاولیاء" میں لکھا ہے کہ جلّاب اور ہجویر غزنی کے دو محلّے ہیں۔ پہلے وہ محلہ جلّاب میں رہتے تھے، اس لئے جلّابی کہلائے، پھر وہ محلہ ہجویر میں جا بسے اور ہجویری کہلائے۔ اب یہ دُوسری نسبت زیادہ مشہور ہے۔ دارا شکوہ ہی نے لکھا ہے کہ حضرت شیخ پیر علی ہجویری کے والد اور والدہ کی قبریں بھی غزنی میں ہیں۔ ان

کی والدہ کی قبر ان کے بھائی تاج الاولیاء کی قبر کے پاس ہی ہے۔ غرض حضرت شیخ غزنی کے رہنے والے تھے اور ان کا گھرانا زہد و تقوی کا گھرانا تھا۔ افسوس ہے کہ جناب شیخ کے شخصی حالات بہت کم محفوظ رہے ہیں۔ آپ کی تاریخ ولادت معلوم نہیں اور تاریخ وفات جو مشہور ہے، وہ بھی یقینی نہیں۔ ان کے لاہور آنے کا زمانہ ان کے قیام لاہور کی مدت ان میں سے کوئی بات وثوق کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی بعض باتیں جو انہوں نے اپنے متعلق اپنی کتاب "کشف المحجوب" میں لکھ دی ہیں صرف انہیں پر اعتماد ہو سکتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کی تاریخ وفات کے سلسلے میں بھی اسی کتاب سے مدد لینے کی ضرورت ہے۔

"سفینۃ الاولیاء" مطبوعہ میں دارا شکوہ نے لکھا ہے کہ ان کی وفات کی تاریخ ۴۵۶ھ ہے اور ایک دیگر روایت کی رو سے ۴۶۴ھ ہے (مگر خزینۃ الاصفیا میں ہے کہ "سفینے" میں ۴۶۴ھ اور ۴۶۶ھ دیا ہے) اسی طرح "خزینۃ الاصفیا" ہی میں ہے کہ "نفحات الانس" میں آپ کی تاریخ وفات ۴۶۵ھ دی ہے۔ مگر "نفحات" کے مطبوعہ اور قدیم نسخوں میں، جو میں نے دیکھے ہیں، کہیں آپ کی تاریخ وفات درج نہیں ہے۔ بہرحال آپ کے احاطۂ مزار میں دو جگہ جامی لاہوری کے دو قطعات تاریخ میں ۴۶۵ھ ہی تاریخ دی ہے اور یہی تاریخ "تاثر الکرام" "حدائق الحنفیہ" اور "نزہتہ الخواطر" میں اختیار کی گئی ہے۔ مگر بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ اس سے کئی سال بعد تک زندہ رہے۔

مفصل بحث کا یہ مقام نہیں۔ صرف یہ کہنا کافی ہے کہ حضرت داتا صاحب نے "کشف المحجوب" میں متعدد معاصر شیوخ کا ذکر بصیغۂ ماضی کیا ہے۔ مثلاً کہا ہے

کہ فلاں بزرگ زہد و تقویٰ اور صلاحیت میں ایسے ایسے تھے۔ اب اُن بزرگوں کی وفات کی تاریخیں دیکھیں تو وہ ۴۶۰ھ سے ۴۷۹ھ تک پہنچتی ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ وہ حضرت شیخ کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ جناب ہجویری کی وفات ۴۷۹ھ یا اس کے بعد ہوئی ہو گی۔

ایک اور دلیل یہ ہے کہ "کشف المحجوب" میں وہ فرماتے ہیں کہ اپنے پیر جناب ختلی کی وفات کے وقت وہ ان کی خدمت میں حاضر تھے۔

جناب ختلی کی وفات ذہبی کی "تاریخ الاسلام" کی رُو سے ۴۶۰ھ میں "بیت الجن" کے مقام پر ہوئی۔ یہ مقام دمشق سے کچھ فاصلے پر تھا۔

اگر وہاں سے روانہ ہو کر حضرت شیخ ۴۶۱ھ میں بھی لاہور پہنچ گئے ہوں اور ۴۶۵ھ میں فوت ہو گئے ہوں تو ان کے قیام لاہور کی مدت صرف ۴ سال کے قریب بنتی ہے۔ جب دارا شکوہ یہ کہتا ہے کہ بہت سی سیاحت کے بعد وہ لاہور پہنچے اور یہیں مقیم ہو گئے۔ اور دیارِ لاہور کے لوگ سب اُن کے مرید و معتقد ہو گئے۔ تو اتنا عظیم الشان کام سرانجام دینے کے لئے جو غیر زبان، غیر مذہب اور روایتی متعصب و معاند لوگوں میں سرانجام دیا گیا بہت کم ہے۔

پس اگر بیانِ حسب بالا ان کی تاریخ وصال ۴۷۹ھ یا اس کے بعد تھی، تو اس حساب سے قرینِ قیاس ہے کہ ان کی ولادت بھی چوتھی صدی ہجری کے اواخر، یا پانچویں کے ابتداء میں ہوئی ہو گی۔

"خلاصۃ التواریخ" کا یہ بیان درست معلوم نہیں ہوتا کہ جناب شیخ سلطان محمود کے ساتھ اس ملک میں آئے۔ اس لئے کہ سلطان کے حملوں کا زمانہ بقول لین پول ۳۹۲ھ

تا ۴۱۵ھ (۱۰۰۱ء تا ۱۰۲۴ء) تک تھا۔ پس اگر جناب ہجویری ۴۱۵ھ میں بھی لاہور آئے ہوں تو اُن کی عمر اُس وقت ۱۵، ۲۰ سال کے قریب ہوگی جو ان کے کارناموں کے لئے موزوں عمر نہیں ہے۔

"کشف المحجوب" میں ہے کہ وہ ابوسعید ابی الخیر (م ۴۴۰ھ) کی قبر پر پہنچے۔ یعنی ۴۴۰ھ یا اس کے بعد کسی سال وہ خراسان میں تھے۔ پس اگر وہ ۴۴۰ھ یا اس کے بعد خراسان میں تھے اور ۴۶۰ھ میں دمشق کے نواح میں تھے، تو وہ یا تو لاہور ۴۶۰ھ کے بعد آئے، یا ایک سے زیادہ دفعہ یہاں آئے۔

حضرت شیخ نے بہت سفر کیا۔ اُس زمانے کی مشکلات سفر اور ان کی بے سامانی کو مدِنظر رکھتے ہوئے عقل حیران ہوتی ہے کہ اتنا طول طویل سفر کس طرح ممکن ہوسکا، مگر اس میں شک نہیں کہ تجرید اور توکّل کے قدم پر حضرت شیخ نے عالمِ اسلام میں ایک سرے سے دُوسرے سرے تک گردش کی۔ حدودِ شام سے مشرقی ترکستان تک اور بحیرۂ خزر سے لاہور تک پہنچے اور بے شمار صوفیائے کرام اور مشایخ عظام سے استفادہ کیا۔ چنانچہ بقول ان کے تین سو شیوخ سے صرف خراسان میں ملاقات کی (کشف احوال معاصرین) کہیں سے حدیث سُنی، کہیں سے امور باطنیہ کے نکتے جمع کئے جن اکابر سے ان کی ملاقات ہوئی ان میں مشایخ ذیل بھی شامل تھے۔ شیخ المشایخ ابوالقاسم گرگانی (م ۴۶۴ھ) ابوالقاسم قشیری صاحب "رسالہ قشیریہ" (م ۴۶۵ھ) شیخ ابوسعید ابی الخیر مہنی (م ۴۴۰ھ) جناب ہجویری کے پیر ابوالفضل بن حسن ختلی تھے۔ (م ۴۶۰ھ) اور ختلی ایک واسطے سے شیخ شبلی کے اور حضرت جنید کے مرید تھے ابوالعباس احمد بن محمد الشقانی (م ۴۷۹ھ) بعض علوم میں جناب ہجویری کے

استاد تھے (کشف" طبع بہادل پریس لاہور، ص ۱۲۱) ان بے شمار بزرگوں سے حضرت شیخ نے مختلف مسائل پر گفتگو کی اور ان کے اقوال کا قیمتی اور نایاب ذخیرہ اپنی کتاب میں جمع کیا۔

یوں تو جناب ہجویری نے بہت سی کتابیں لکھیں، جن میں ان کا دیوان بھی شامل ہے۔ مگر سوا "کشف المحجوب" کے ان کی باقی کتابیں اب ناپید ہیں۔ یہ کتاب تصوّف کی معتبر اور مشہور اور قدیم کتابوں میں سے ہے اور حقائق سے لبریز ہے۔ تصوّف پر فارسی میں کوئی کتاب اس کی خوبی کو نہیں پہنچتی (دارا شکوہ)۔ مصنف کی ایک عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کتاب کا وہ حصّہ زیر تصنیف تھا تو وہ لاہور میں تھے۔ یہ کتاب جناب ہجویری نے اپنے ایک ہم وطن کے چند سوالوں کے جواب میں لکھی تھی جو اُس نے تصوّف اور صوفیوں کے متعلق پوچھے تھے۔ آپ نے کتاب میں ابتدائے اسلام سے اپنے زمانے تک تصوّف کی گویا تاریخ بیان کر دی ہے۔ اور عرب وعجم کے کاملانِ تصوّف کا حال دیا ہے۔ پھر گیارہ صوفی فرقوں کا حال بیان کیا ہے اور اس ضمن میں تصوّف کے بعض نکتوں کی تشریح کی ہے۔ یہ کتاب کا اہم ترین باب ہے۔ اس کے بعد آپ نے کشف حجاب کے گیارہ باب دیئے ہیں جن میں صوفیوں کے نقطۂ نظر سے ارکانِ اسلام کی تشریح کی ہے۔ اور تصوّف کی اصطلاحات کی وضاحت فرمائی ہے۔ آخر کتاب میں سماع کی بحث ہے۔ یہ کتاب لاہور میں چند بار چھپی ہے۔ اس وقت بھی ایک صاحب لاہور میں، اور ایک کراچی میں اس کے ایڈیشن مرتب کر رہے ہیں، لینن گراڈ میں اچھا ایڈیشن چھپا ہے۔ گو متن میں تصحیح کی گنجائش ابھی ہے۔ کتاب کا اردو اور انگریزی ترجمہ بھی چھپ چکا ہے۔ پچاس برس ہوئے اردو ترجمہ "ظہیر المطلوب" کے نام

سے لاہور میں طبع ہوا۔ اور انگریزی ترجمہ مطبوعات وقفیۂ گب میں شامل ہے۔ صوفیا کے طبقے میں یہ کتاب ہمیشہ مقبول رہی ہے۔ برنی نے ۷۵۸ھ کے حدود میں لکھا ہے کہ اس کے زمانے میں صوفیوں کی جو کتابیں لوگوں کو بہت مطلوب تھیں۔ ان میں "کشف المحجوب" بھی تھی۔

حضرت شیخ کی قبر لاہور میں مشہور و معروف ہے۔ اور صدیوں سے زیارت گاہ خلائق ہے۔ اس قبر کا ذکر سب سے پہلے "فوائد الفواد" میں ملتا ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاء کے سامنے کسی نے ۷۰۸ھ میں ذکر کیا کہ وہ لاہور میں حضرت شیخ کی قبر کی زیارت کر کے آیا ہے۔

(۳)

شمال مغرب سے آنے والے مبلّغانِ اسلام کی صفِ اوّل میں حضرت داتا گنج بخش کا نام نامی شامل ہے۔ ان کے اجداد افغانستان کے شہر غزنیں کے رہنے والے تھے ان کی کنیت، اصل نام اور نسب یوں ہے :- ابوالحسن علی بن عثمان بن علی جُلّابی ہجویری غزنوی' آپؒ کا شجرۂ نسب امام حسنؓ تک پہنچتا ہے۔

مختلف تذکروں میں داتا صاحب کا حال اختصار کے ساتھ دیا ہے اور آپ کے فضائل بیان ہوئے ہیں۔ "نفحات الانس" میں انہیں "عالم و عارف" کہا ہے۔ اور "سفینۃ الاولیاء" میں ہے کہ ان کے خوارق وکرامات حدو نہایت سے زیادہ ہیں۔ اور "حدائق الحنفیہ" میں ہے کہ آپ اولیاء متقدمین میں سے ہیں۔ جامع علوم ظاہری و باطنی عابد' زاہد' متقی' مظہر خوارق و کرامات اور حنفی المذہب ——— لیکن مفصل حالات پرانے تذکرہ نویسوں میں سے کسی نے نہیں لکھے۔ یہاں تک کہ ان کی تاریخ ولادت ووفات اور ان کے ورودِ لاہور کی تاریخ بھی

ے اسی موضوع پر تیسرا مقالہ۔

قطعی طور پر معلوم نہیں۔

یوں تو داتا صاحب نے بہت سے مشائخ کی صحبت سے فیض پایا۔ لیکن امورِ باطن میں داتا صاحب نے شیخ ابوالفضل محمد بن حسن الختلی سے فیض پایا۔ ختل یا ختلان بدخشان کے مغرب میں دریائے جیحوں کے دائیں کنارے پر ایک علاقے کا نام ہے۔ کبھی اس نام کا اطلاق خراسان کے مشرق اور شمال کے تمام بلاد پر بھی ہوتا ہے۔ جناب ختلی کی نسبت داتا صاحب فرماتے :۔ طریقت میں میں اُن کا پیرو ہوں۔ وہ علم تفسیر و روایات کے عالم تھے۔ اور تصوّف میں مذہب جنید کے پابند تھے۔ حصُری کے مرید اور ان کے راز دار تھے....

سچی گوشہ نشینی کی وجہ سے ساٹھ سال تک گوشوں میں چھپا کیے اور اپنا نام خلقت کے درمیان گُم کر دیا۔ وہ اکثر جبل لکام میں رہا کرتے تھے (جبل لکام سلسلہ کوہ لبنان کا جزو ہے۔ پانی کے چشمے، پھل دار درخت اس میں عام ہیں۔ گوشہ نشین زاہدوں اور صلحاء سے یہ پہاڑ بقول ابن بطوطہ کبھی خالی نہیں رہا۔

داتا صاحب نے بارہا تجرید و توکّل کے قدم پر طول طویل سفر کیے۔ سارے عالم اسلام میں حدودِ شام سے ترکستان کی اسلامی سرحد تک اور بحیرۂ خزر سے لاہور تک وہ پھر نکلے۔ انہوں نے "کشف المحجوب" میں خود ذکر کیا ہے کہ وہ دمشق، رملہ، بیت الجن، آذربائیجان، بغداد و نواحی خوزستان، فارس، طوس، نیشاپور، بسطام، میہنہ، سرخس، مرو، بخارا، اُذکند، جبل بتم (جو سمرقند کے مشرق میں ہے) ان تمام مقامات میں گئے اور یہ فہرست غالباً مکمل نہیں۔ مختلف مقامات میں انہوں نے بہت سے صوفیوں اور مشائخ کرام سے ملاقات اور ان سے استفادہ کیا۔

اس سیاحت کے ضمن میں چند دلچسپ باتیں انہیں ہندوستان کے متعلق معلوم ہوئیں، وہ

فرماتے ہیں کہ: اہلِ ہند سب روح کو قدیم اور فاعل اور مدبّرِ اشیا، مانتے ہیں۔ وہ اُسے پُوجتے ہیں اور کہتے ہیں کہ روح ایک سے دُوسرے میں منتقل ہوتی ہے۔ ہندوستان میں داتا صاحب نے زہرِ قاتل میں ایک کرم دیکھا جس کی زندگی اسی زہر سے تھی۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ مشہور ہے کہ ہندوستان میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا ہے جو دشت میں گا کر ہرنوں کو سُلا دیتے ہیں، پھر انہیں پکڑ لیتے ہیں۔

"کشف المحجوب" داتا صاحب کی واحد تصنیف ہے جو ہم تک پہنچی ہے، مگر اسی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ داتا صاحب نے نو اور کتابیں بھی لکھیں۔ یہ نو کتابیں اب ناپید ہیں۔ ان میں اُن کا دیوان بھی شامل تھا۔ مگر اب اس میں سے صرف ایک شعر باقی ہے جو "کشف المحجوب" میں درج ہے۔ یعنی ؎

فنیت فنائی بفقد ہوائی ؏ فصار ہوائی فی الامور ہواک

ترجمہ:- "میری خواہش کے کھونے سے میری فنا ختم ہوگئی۔ اس کے بعد میں امور میں وہی چاہنے لگا، جو تُو چاہتا ہے۔" (کشف المحجوب طبع سمرقند ص ۲۹۶)

"کشف المحجوب" کے متعلق مولانا جامی لکھتے ہیں کہ یہ کتاب (فن) تصوّف کی معتبر اور مشہور کتابوں میں سے ہے۔ اور اس میں مصنّف نے بہت سے لطائف اور حقائق جمع کر دیئے ہیں۔ دارا شکوہ نے لکھا ہے کہ "کشف المحجوب" میں کسی کو جائے سخن نہیں۔ وہ ایک کامل مرشد ہے۔ تصوّف پر جو کتابیں فارسی میں لکھی گئیں۔ ان میں سے کوئی بھی اس کتاب کی خوبی کو نہیں پہنچتی۔" داتا صاحب نے یہ کتاب اپنی عمر کے آخری حصے میں تصنیف کی اور کم از کم اس کا ایک حصّہ لاہور میں لکھا۔

کشف المحجوب کی ترتیب یہ ہے کہ جناب ہجویری نے اپنے ہم وطن ابو سعید

ہجویری کا، جن کی قبر بقول چشتی داتا صاحب کے مزار مبارک کے پاس ہی ہے۔ ایک سوال نقل کیا ہے۔ داتا صاحب نے ساری کتاب اس سوال کا جواب دینے کے لئے لکھی ہے۔

تصوف پہ پہلی فارسی کتاب جو ہم تک پہنچی ہے وہ ابو ابراہیم اسمٰعیل مستملی بخاری متوفی ۴۳۴ھ کی کتاب "شرح تعرف" ہے۔ جو دیوبند میں چھپی، مگر پشاور یونیورسٹی کے نسخے سے مقابلہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ دیوبند والے نسخے میں کتاب کی پرانی زبان کو بدل دیا گیا ہے۔ "شرح تعرف" کے بعد "کشف المحجوب" ہے جو فارسی میں تصوف کی قدیم ترین کتابوں میں سے ہے۔

اصولِ اسلام کی تشریح کرتے ہوئے داتا صاحب نے صوفیاء کا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ مثلاً وہ نماز کے متعلق فرماتے ہیں:۔

"جان لو کہ نماز ایسی عبادت ہے کہ ابتدا سے انتہا تک مرید اس میں راہِ حق پاتے ہیں اور مقامات کا انکشاف اس میں ہوتا ہے۔ چنانچہ طہارت مریدوں کے لئے توبہ کی جگہ لیتی ہے۔ قبلہ راست کرنا پیر پکڑنا ہے۔ قیام بجائے مجاہدۂ نفس ہے۔ قرارت بجائے ذکرِ دائم اور رکوع بجائے تواضع، سجدہ بجائے معرفت نفس ہے۔ تشہد بجائے مقام انس اور سلام پھیرنا دُنیا سے گوشہ گیری اور بند مقامات سے باہر نکل آنے کے بجائے ہے۔"

حج کے متعلق ارشاد ہوتا ہے: "حج دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک غیبت (الٰہی) میں اور دوسرا حضور (الٰہی) میں۔ جو شخص مکے کے قرب و جوار میں غیبت میں ہے وہ ایسا ہے، گویا اپنے گھر میں غیبت میں ہے۔ اس لئے کہ ایک غیبت دوسری غیبت سے بہتر نہیں ہوتی۔ اور وہ جو اپنے گھر کے اندر حضور میں ہے، وہ ایسا ہے گویا مکے میں حضور میں ہے۔ اس لئے کہ ایک حضور

دوسرے حضور سے بہتر نہیں ہوتا۔ پس حج ایک مجاہدہ ہے جس سے مقصود مشاہدہ ہے، اور مجاہدہ مشاہدے کی وجہ نہیں بلکہ اس کا ذریعہ ہے۔ پس مقصودِ حج خانہ کعبہ کی زیارت نہیں بلکہ مشاہدے کا حصول ہے۔

اس سے کچھ پہلے داتا صاحبؒ نے حضرت بایزید بسطامی کا قول نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں پہلے حج میں میں نے گھر (یعنی خانہ کعبہ) کے سوا کچھ نہ دیکھا۔ دوسری دفعہ گھر بھی دیکھا اور گھر والے کو بھی دیکھا۔ تیسری دفعہ صرف گھر والے کو دیکھا اور گھر کو نہ دیکھا۔

حقیقتِ سماع میں صوفیاء کے مراتب کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ایک درویش کو میں نے بچشمِ خود جبالِ آذربائیجان میں دیکھا تھا کہ وہ چلتے چلتے یہ اشعار گنگنا رہا تھا ؎

واللہِ ماطلعتْ شمسٌ ولاغربتْ ٭ الّا وانت مُنی قلبی ووسواسی

ولاجلستُ الیٰ قومٍ اُحدِّثهم ٭ الّا وانت حدیثی بین جُلّاسی

ولاتنفّستُ محزوناً ولاطرِباً ٭ الّا وحُبُّكَ مقرونٌ بانفاسی

ولاهممتُ لشُربِ الماءِ من عطشٍ ٭ الّا رایتُ خیالاً منك فی الكاْسِ

فلوقدرتُ علی الاتیانِ زرتُكمُ

سحباً علی الوجهِ اومشیاً علی الراسِ (کشف المحجوب ص۵۲۵)

ترجمہ:۔ "خدا کی قسم! سورج کبھی طلوع نہ ہوا اور کبھی غروب نہ ہوا ۔۔۔۔ الّا یہ کہ

تم میرے دل کی آرزو اور میرے دماغ کے خیالات ہو!

"اور میں نے کبھی ہم نشینوں میں بیٹھ کر بات چیت نہ کی! اِلّا یہ کہ میرے ہم نشینوں میں میری گفتگو کا موضوع تم تھے!"

"اور میں نے کبھی غم یا خوشی میں سانس نہ لیا، اِلّا یہ کہ تمہاری محبت میرے سانس کے ساتھ ساتھ جاری تھی!"

"اور میں نے کبھی پیاس میں پانی نہ پیا، اِلّا یہ کہ تمہاری صورت مجھے پانی کے پیالے میں نظر آئی۔"

"اگر مجھ میں طاقت ہوتی، تو میں آکر تمہاری زیارت کرتا، ماتھا رگڑتا ہوا، سر کے بل چلتا ہوا!" —— یہ شعر پڑھتے ہی اس کی حالت غیر ہو گئی تھوڑی دیر تک بیٹھا، ایک پتھر سے پیٹھ لگالی اور دم دے دیا۔

داتا صاحب نے اپنی عمر کے آخری سال لاہور میں گذارے۔ یہ غزنویوں کا دور تھا آپ نے یہاں اپنا وقت اشاعتِ اسلام، تلقین اور تدریسِ علوم میں صرف کیا۔ اس میں بہت دقتیں پیش آئی ہوں گی۔ اس کا اندازہ اُن بیانات سے ہو سکتا ہے جو البیرونی نے "کتاب الہند" میں درج کئے ہیں۔ بیرونی داتا صاحب سے کچھ عرصہ پہلے پنجاب میں آیا تھا۔ وہ لکھتا ہے، "محمود نے ہندوؤں کی حکومتوں کو تہ و بالا کر دیا تھا۔ اس سے وہ عام طور پر مسلمانوں سے سخت نفرت کرنے لگے تھے۔ انہیں اپنے علم و دانش پر سخت غرور تھا۔ اس لئے کسی مسلمان کی علمی بات کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اُن کے رسومِ بد، مثلاً بت پرستی، ذات پات کی پابندی، بچپن کی شادی، دیوداسیوں کا رواج وغیرہ وغیرہ، یہ وہ باتیں تھیں کہ صدیوں سے ان کے دلوں میں جمی ہوئی

تھیں۔ ان باتوں کے علاوہ زبان کی مغائرت ایک بہت بڑا مانع تھا۔ امیر خسرو کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کی زبان اُس وقت بھی پنجابی ہی تھی، جس کا نام امیر نے "لاہوری" لکھا۔ بغیر اس زبان کے جانے کے کسی کو دعوتِ اسلام دینا کیسے ممکن تھا؟ لیکن داتا صاحب نے ان مشکلات پر قابو پایا، اور نہایت کامیابی سے دعوت و تبلیغِ اسلام کے فرائض ادا کئے۔

داتا صاحب کا انتقال لاہور ہی میں ہوا۔ یہ سلطان ظہیر الدین ابراہیم غزنوی کا زمانہ تھا جس نے ۴۵۱ھ سے ۴۹۲ھ تک حکومت کی۔ کہتے ہیں کہ داتا صاحب کی موجودہ سنگِ مرمر کی قبر اسی سلطان نے بنوائی تھی۔ مغلوں کے زمانے سے قبر کے محلِ وقوع کا ذکر بھی ملتا ہے۔ چنانچہ انگریز سیّاح فنچ Finch نے عہدِ جہانگیری میں اس کا ذکر کیا ہے اور دارا شکوہ نے قلعۂ لاہور سے آکر اس کی زیارت کی۔ یوں تو فوائد الفواد سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ۷۰۸ھ میں لوگ داتا صاحب کی قبر کی زیارت کو آتے تھے۔ مگر مغلوں کے عہد میں قبر پر بہت زیادہ ہجوم ہونے لگا۔ چنانچہ عہدِ شاہجہان کا ایک شاعر لکھتا ہے ؎

مزارِ دُرنثارِ شاہِ ہجویری ندیدستی ؛ کہ نحل آسا ببیر امونش جوشِ انس و جان بینی

"تم نے شاہ ہجویری کی دُرنثار قبر کی زیارت نہیں کی؟ کہ اس کے گرد اگرد تمہیں شہد کی مکھیوں کی طرح انس و جان کا جوش نظر آئے گا"

آج بھی ۲۰ صفر کو ہر سال آپ کا عرس ہوتا ہے۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

آج ہم جناب غوثِ اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی رح کا ذکرِ خیر کرنا چاہتے ہیں جو اولیاءاللہ میں سب سے زیادہ مشہور، نامور واعظ، اور قادری طریقے کے بانی تھے۔ بحیرۂ خزر کے

جنوب مغربی حصے میں سفید رود ڈیلٹا بنا کر گرتا ہے۔ گھنے جنگلوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں یہاں سے بتدریج بلند اور بلند تر ہو کر البرز کی چوٹیوں پر ختم ہوتی ہیں۔ اس ڈیلٹا اور کہستان والے علاقے کو ایرانی "گیلان" اور عرب "جیل" یا "جیلان" کہتے ہیں۔ گیلان چھوٹا سا علاقہ ہے۔ اس کے ایک گاؤں میں جس کا نام "نیف" تھا ۴۷۰ھ (۱۰۷۷ء) یا ۴۷۱ھ میں جناب شیخ عبدالقادر جیلانی پیدا ہوئے۔ اسی لئے آپ کو گیلانی، یا جیلی، یا جیلانی کہتے ہیں۔ آپ ابوصالح بن جنگی دوست کے بیٹے ہیں۔ لقب محی الدین اور کنیت ابومحمد تھی۔ پس آپ کا پورا نام و نسب اور نسبت محی الدین ابومحمد عبدالقادر بن ابی صالح بن جنگی دوست الجیلانی" ہے۔ آپ کا نسب حضرت حسینؓ بن علیؓ تک پہنچتا ہے۔ لیکن جناب شیخ نسب کو اہمیت نہیں دیتے تھے ع کہ درین راہ فلان ابن فلان چیزے نیست!

اور اولاد کو بھی اس کے ذکر سے منع کرتے تھے۔ چنانچہ آپ کے پوتے قاضی القضاۃ عماد الدین نصر نے ایک شعر میں کہا:۔

"ہمارے جد نے اپنی اصل چھپائی۔ اس کا راز یہ تھا کہ آپ فرماتے تھے، کہ میری زینت فقر ہے۔" (ترجمہ)

اپنی تعلیم کی تکمیل کے لئے آپ نے ۱۸ برس کی عمر میں وطن چھوڑا اور ۴۸۸ھ (۱۰۹۵ء) میں بغداد آئے۔ اس کے بعد کے دور کے بتیس سال یعنی ۵۲۱ھ (۱۱۲۷ء) تک کے حالات بہت کم معلوم ہیں۔ جو چند باتیں معلوم ہیں، وہ یہ ہیں کہ بغداد سے روانہ ہو کر آپ نے حج کیا۔ اسی دور میں شادی بھی کی۔ اور اپنی تعلیم بھی مکمل کی۔ آپ نے قاضی ابوسعید مخرمی امام حنبلیہ اور دوسرے علماء سے فقہ حنبلی پڑھی اور اصول و فروع کو مضبوط کرلیا ابن باقلانی اور ان کے طبقے کے علماء سے حدیث پڑھی اور تبریزی شارح حماسہ سے

ادب پڑھا۔ پھر علم و وعظ میں مشغول ہو کر اس میں کمال پیدا کیا، اور اپنے زمانے کے مشہور زاہد اور صوفی شیخ حماد دباس (م ۵۲۵ھ / ۱۱۳۱ء) کی صحبت میں رہ کر علمِ طریقت اخذ کیا اور اپنے استاد المخرمی سے خرقہ پہنا۔ اب آپ نے گوشہ نشینی اختیار کی اور ریاضت اور سیاحت اور مجاہدہ اور شب بیداری شروع کی اور ویرانوں اور صحراؤں میں رہنا شروع کیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کو خلقت پر ظاہر کیا اور قبولِ عام عطا کیا۔ آپ پچاس برس کے تھے، جب آپ نے ۵۲۱ھ / ۱۱۲۷ء میں مجلسِ وعظ منعقد کی، اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی زبان پر حکمت جاری کی۔ چھ برس بعد ۵۲۷ھ میں آپ اپنے شیخ کے مدرسے میں درس اور فتویٰ میں مشغول ہو گئے۔ یہ مدرسہ بغداد کے ایک اندرونی دروازہ "بابِ ازج" سے قریب تھا۔ اور مدرسہ نظامیہ سے کچھ زیادہ دُور نہ تھا۔ دریائے دجلہ کے بائیں کنارے پر مدرسہ نظامیہ تھا۔ بخطِ مستقیم اس سے تقریباً دو فرلانگ شمال کی طرف "بابِ ازج" تھا اور اس سے دو فرلانگ شمال مشرق کی طرف یہ مدرسہ تھا، جو آپ کے استاد المخرمی نے بنوایا تھا۔ جب یہ مدرسہ جنابِ شیخ کے سپرد ہوا تو آپ نے اس کی توسیع کی اور اسی میں رہنے لگے اور اسی مدرسے میں آخر تک درس دیتے رہے۔ اور وہاں اور "رباطِ صوفیہ" میں، جو آپ کے لئے بنائی گئی مجالس وعظ منعقد کرتے رہے۔ چنانچہ آپ درس و فتوے میں تینتیس اور وعظ و ارشاد میں چالیس برس تک مشغول رہے، اور یہیں ۹۰ برس کی عمر میں آپ کا وصال ہوا۔ اور مدرسے کے ایوان میں آپ کو دفن کیا گیا۔

آپ کا حلیہ مبارک اہلِ اخبار نے یوں بیان کیا ہے: رنگ گندمی۔ ابرو ملے ہوئے، پیشانی کشادہ، ڈاڑھی طویل و عریض، سینہ چوڑا، بدن نحیف، آپ علماء کا لباس پہنتے تھے۔ طیلسان بھی کبھی کبھی پہنتے تھے۔ بعض اوقات نہایت قیمتی لباس بھی پہنتے تھے،

نہایت خوش خلق اور شرمگیں اور کریم الطبع اور مہربان و شفیق تھے۔

آپ فارسی اور عربی دونوں زبانیں بولتے تھے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں وعظ کہنے میں آپ کو تامل تھا۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ: جناب یوسف ہمدانیؒ جن کی نسبت لوگ کہتے تھے کہ وہ قطب ہیں، بغداد آئے، اور رباط میں مقیم ہوئے۔ اُن کا ذکر سُن کر میں اُن کی طرف گیا۔ مجھے دیکھ کر اُٹھے، مجھے بٹھایا اور فراست سے مجھے پہچانا اور میری مشکل حل کی۔ پھر مجھ سے فرمایا کہ "لوگوں سے خطاب کیا کر۔" میں نے کہا: "یا سیّدی! میں ٹھیٹھ عجمی، گونگا ہوں، میں فصحاء بغداد سے کیونکر خطاب کروں؟" فرمایا: "تم نے فقہ، اصول، خلاف، لغت، تفسیر قرآن سب کچھ یاد کیا، ابھی (تم سمجھتے ہو) تمہیں لوگوں کو مخاطب کرنا مناسب نہیں! منبر پر چڑھو اور لوگوں کو مخاطب کرو۔ اس لئے کہ مجھے تم میں کھجور کا وہ چھوٹا سا پیڑ نظر آتا ہے جو عنقریب تناور درختِ خُرما بن جائے گا۔"

اس کے بعد وہ زمانہ آیا جس میں شیخ کے دل پہ کلام امنڈنے لگا اور یہ عالم ہو گیا کہ اگر آپ نہ بولتے تو بقول آپ کے گلا گھٹنے لگتا اور چُپ رہنا آپ کے بس کی بات نہ رہی۔ شروع میں تو دو تین آدمی جو پاس ہوتے آپ کی باتیں سُنتے۔ پھر آپ کا چرچا ہوا اور خلقت آپ پر امنڈ آئی، تاآنکہ مجلسِ وعظ میں ستّر ستّر ہزار آدمی جمع ہونے لگے، جن میں نہ صرف عوام بلکہ اکابر مشائخ عراق، اعیانِ علماء اور صدر و مفتی بھی حاضر ہوتے تھے۔

آپ نے اصول و فروع اور تصوّف پر کئی کتابیں لکھیں۔ آپ کی ۵۲ تصنیفات کا حال براکلمان نے دیا ہے۔ ان میں سے کتاب "الغنیہ لطالب طریق الحق" "فتوح الغیب" اور "الفتح الربانی" خاص طور پر مشہور ہیں۔ ان کتابوں میں زیادہ تر آپ کے وعظوں اور

خطبوں کو جمع کیا گیا ہے۔ "غنیہ" میں چند مجالس میں آدابِ شرعیہ یعنی فرائض و سنن اور ہیئاتِ علماء و مشائخ اور معرفتِ پروردگار، اور قرآن و حدیث سے پندگیری۔ اور اخلاقِ صالحین کا ذکر ہے۔ کتاب میں ایک فصل ہے۔ جس میں بہتر اسلامی فرقوں کا حال بھی دیا ہے اور صوفیوں کے آداب کا بھی ذکر کیا ہے۔ "فتوح الغیب" میں مختلف مضامین کے اٹھتر (۷۸) مقالے ہیں، جن کو جناب شیخ کے لڑکے ابو عبد الرحمٰن عیسیٰ نے جمع کیا۔ اس کے آخر میں ایک تکملہ ہے جس میں آپ کی وفات کا حال اور وصایا درج ہیں۔ "الفتح الربانی" میں باسٹھ (۶۲) وعظ جمع کئے گئے ہیں، جو آپ نے ۵۴۵ھ و ۵۴۶ھ (۱۱۵۰ء تا ۱۱۵۲ء) میں اپنے مدرسے یا "رباطِ صوفیہ" میں دیئے۔ اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ سیدھے سادے الفاظ میں وعظ فرماتے تھے اور صاف اور عام فہم زبان میں دین کی تعلیم دیتے تھے۔ بیان فصیح ہے مگر تکلف و آورد سے خالی، جذبیت، جوش اور حقانیت سے معمور اور خلوص اور بنی نوع کی خیر خواہی کے جذبات سے لبریز۔ یہ تینوں کتابیں چھپ چکی ہیں۔ غنیہ اور فتوح کا اردو ترجمہ بھی ایک ہی جلد میں متن کے ساتھ چھپ چکا ہے۔ غنیہ کا فارسی ترجمہ ملا عبد الحکیم سیالکوٹی نے شیخ بلاول قادری لاہوری کے فرمانے پر کیا۔ اسی طرح فتوح کا جرمن اور انگریزی ترجمہ بھی چھپ چکا ہے۔ فتح ربانی کا فارسی ترجمہ اسلامیہ کالج پشاور کے ایک نسخے میں متن کے ساتھ موجود ہے مگر اب تک طبع نہیں ہوا۔

سبطِ ابن الجوزی اور دوسرے مؤرخوں کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب شیخ کی ان مجالسِ وعظ میں بہت سے لوگ گناہوں سے توبہ کرتے اور توبہ کی علامت کے طور پر سر کے بال منڈوا دیتے۔ اسی طرح بہت سے یہود و نصاریٰ جناب شیخ کے ہاتھوں پر اسلام لائے۔ آپ نے خود فرمایا کہ: پانچ سو سے زیادہ آدمی میرے ہاتھ پر اسلام لائے، اور

لاکھ سے زیادہ عیّاروں اور ڈاکوؤں نے میرے ہاتھ پر توبہ کی۔ ان بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخؒ کی شخصیت واعظ کی حیثیت سے ایک زبردست شخصیت تھی اور آپ کے کلام مبارک میں تاثیر ایسی تھی کہ دلوں کو موم کر دیتی تھی۔ کہتے ہیں کہ آپ کا صاحب زادہ عبدالوہّاب بہت سے شیوخ سے علم پڑھ کر بغداد واپس آیا۔ اور اپنے والد ماجد کی اجازت سے آپ کی موجودگی میں وعظ کہا، علمی نکتے بیان کئے اور نصیحت کی، لیکن لوگ متاثر نہ ہوئے نہ کسی کا دل نرم ہوا۔ نہ کوئی آنسو بہا۔ لوگوں نے جناب شیخ سے التجا کی کہ آپ بھی کچھ فرمائیں آپ خود کھڑے ہوئے اور فرمایا: میں کل روزے سے تھا۔ گھر والوں نے میرے لئے انڈے تلے اور پیالے میں ڈال کر طاق میں رکھے لیکن بلّی آئی اور پیالہ گرا کر توڑ دیا۔ آپ نے یہ بیان ابھی ختم بھی نہ کیا تھا کہ سامعین نے فریاد کرنا اور رونا اور چیخنا شروع کر دیا۔

آپ کی تعلیمات اور آپ کے مواعظ میں جن باتوں پر زور دیا گیا ہے۔ شاید ان کا کچھ نہ کچھ اندازہ ان چند اقتباسات سے ہو سکتا ہے جس کا ترجمہ ہم آپ کو سناتے ہیں:۔

توحید کے متعلق فرماتے ہیں:۔ "دُنیا اور آخرت کو ملا کر یکجا کر دو اور تنہا اپنے مولا عزّوجلّ کے سامنے جاؤ۔ دل کے اعتبار سے برہنہ دُنیا اور آخرت کے بغیر، اس کے سامنے غیر اللہ سے مجرّد ہونے کے سوا نہ جاؤ۔ خالق سے ہٹ کر خلق کی قید میں مقیّد نہ ہو۔ ان اسباب کو قطع ان ارباب کو دُور کرو۔ جب قدرت پالو تو دُنیا کو تو اپنے نفس کے لئے رکھو، آخرت کو دل کے لئے۔ اور مولیٰ کو اپنے باطن کے لئے۔"

پھر فرماتے ہیں:۔ "خلق کی طرف کے دروازے بند کرو اور اپنے اور خدا کے درمیان کا دروازہ کھولو۔ اپنے گناہوں کا اقرار کرو۔ اپنی تقصیر کا عذر اس کے سامنے پیش کرو اور یقین رکھو کہ سوائے اس کے کوئی ضرر یا نفع پہنچانے والا "عطا کرنے والا" اور

روکنے والا نہیں ہے۔ اس یقین کے بعد تمہارے دل کی آنکھ کی نابینائی جاتی رہے گی اور تمہاری بصارت اور بصیرت کام کرنے لگے گی۔"

خلقت کے ساتھ حسنِ معاشرت کے متعلق فرماتے ہیں:۔" حدودِ شرع کے اندر رہ کر لوگوں کے ساتھ حسنِ معاشرت خوب ہے اور شرع کی اجازت سے لوگوں کے ساتھ موافقت اچھی اور مبارک بات ہے۔ لیکن اگر حدودِ شرع میں سے کسی حد کر توڑتا ہے اور شرع اجازت نہ دے تو لوگوں کا ساتھ نہیں دیا جا سکتا۔"

مفلس اور ناداروں کی امداد کے متعلق فرمایا:۔" اے مال والے! اگر دُنیا اور آخرت کی بہتری چاہتا ہے تو اپنے مال سے کچھ فقیروں کو بھی دے ڈال۔ نبیؐ سے روایت ہے آپؐ نے فرمایا:" لوگ اللہ کے عیال ہیں اور اللہ عزّ وجلّ کو سب سے پیارا وہ ہے، جو اللہ کے عیال کو سب سے زیادہ نفع پہنچائے۔ لوگو! پیٹ بھر کر کھاتے ہو اور تمہارے پڑوسی بھوکے ہیں، پھر تمہارا دعویٰ ہے کہ تم مؤمن ہو۔ تمہارے سامنے بہت سا کھانا تمہارے اور تمہارے گھر والوں کی ضرورت سے زیادہ ہو اور دروازے پر سائل کھڑا رہے اور مایوس لوٹا دیا جائے!"

دُعا فرماتے ہیں: " اے اللہ سب کو ہدایت دے، سب کو توبہ کی توفیق دے سب پر رحم کر"۔ فرماتے ہیں:۔" زندگی کا دروازہ جب تک کھلا ہے۔ اسے غنیمت جان! وہ جلد ہی بند ہو جائے گا۔ جب تک بس چلتا ہے، نیک کام کر اور اسے غنیمت جان! توبہ کے دروازے کو غنیمت جان! وہ تمہارے لئے کھلا ہے۔ اپنے نیک بھائیوں سے مل بیٹھنے کے دروازے کو غنیمت جان، وہ تمہارے لئے کھلا ہے۔"

اکثر مؤرخین نے جناب غوثِ اعظم کی کرامتوں کا ذکر کیا ہے۔ علامہ ذہبی نے کئی

معتبر روایتیں ان کے "تکلّم علی الخواطر" یعنی (Thought-Reading) کی دی ہیں شیخ عزالدین بن عبدالسلام کہتے ہیں: "کسی بزرگ کی کرامتیں سوا شیخ عبدالقادر جیلانی کے، ہمارے پاس تواتر کے ساتھ نہیں پہنچیں۔ پنجاب کا بچہ بچہ ان کی کرامتوں کے ذکر سے [redacted]نوس ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی زندگی ہی میں آپ کے داعیوں کے ہاتھ پر یمن، شام اور مصر میں لوگ قادری طریقے میں داخل ہوئے۔ مغرب، سودان، روم اور ہند اور پنجاب میں صدیوں سے لوگ آپ سے عقیدت رکھتے ہیں۔ نذریں نیازیں دیتے رہے ہیں اور اب بھی دیتے ہیں۔

اولیاء اللہ اور خاصانِ خدا میں شیخ داؤد کرمانی شیر گڑھی، شاہ ابو المعالی حضرت میاں میر، شیخ ملّا شاہ، نوشاہ گنج بخش اور ان کے متبعین، شاہ عنایت لاہوری اور میر بھلے شاہ قصوری، بہت سے گیلانی اور بہت سے اور بزرگ قادری طریقے کے پیرو تھے اور اس ملک اور ہندوستان اور مغرب کے بہت سے لوگ آپ کے روضے کی زیارت کے لیئے بغداد جاتے ہیں۔ یہ روضہ ۹۴۱ھ (۱۵۳۵ء) میں ترکیہ کے سلطان سلیمان عثمانی نے بنوایا۔ اس پر نہایت خوبصورت کاشی کار گنبد ہے۔ اس کے پاس ہی مسجد ہے اور اس کا پست سفید گنبد بھی عظیم الشان اور وسیع گنبد ہے۔ بیگم بھوپال نے یہاں ایک گھنٹہ گھر بھی بنوایا ہے۔ جناب غوث اعظم کی درگاہ شریف کے ساتھ بہت سے اوقاف ہیں۔ جن میں اراضیات، باغات اور گاؤں شامل ہیں۔

جناب غوث اعظم کے وصال کے بعد آپ کا مدرسہ آپ کے صاحبزادے عبدالوہاب کے اور ان کے بعد ان کے بیٹے عبدالسلام کے اور ان کے بعد ان کے عم زاد بھائی قاضی القضاۃ نصر بن عبدالرزاق کے سپرد ہوا تھا۔ مگر مدرسہ اور رباط دونوں

کو غالباً ۶۵۶ھ (۱۲۵۸ء) کے حملۂ مغول میں نقصان پہنچا۔ موجودہ عمارات سلطان سلیمان کے زمانے کی ہیں۔

خواجہ غریب نوازؒ

خواجہ معین الدین چشتیؒ کے حالات اور کارنامے!

اولیاء اللہ کے احوال اور ان کے اقوال پر غور کرنے سے دل میں سرور اور نور پیدا ہوتا ہے اور شکوک و شبہات کی تاریکیاں دور ہو جاتی ہیں۔ روح میں تازگی آتی ہے اور قوتِ عمل میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور اگر ہم میں استفاضۂ انوار کی صلاحیت نہ بھی ہو تو یہ سوال تو دل میں ضرور پیدا ہوتا ہے کہ یہ گروہ جنہوں نے راہِ طلب میں جانبازی دکھائی اور مال و اسباب فدا کیا اور آرام و آسایش سے منہ موڑا اور اپنی عمریں مجاہدات میں صرف کیں ؎

زین طلب گر نہ خدا یافتہ اند ٭ این ہمہ بہرچہ بشتافتہ اند!

کاملوں کی دولتِ صحبت اگر ہمیں میسر نہ آئی تو ان کے حالات سننے اور تلاش کرنے میں جو خیر و برکت ہے۔ اسے کیوں نہ حاصل کیا جائے؟

اولیاء اللہ کا وجود رحمتِ ایزدی ہے۔ ان کے مناقب و احوال کے سننے سے نہ صرف ان سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ جو بجائے خود نزولِ رحمت کا موجب ہے بلکہ ان کے حسنِ عمل، کردارِ نیک، اور گفتارِ راست سے بھی محبت پیدا ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے قرنوں کے بعد بھی اب تک ان کا ذکرِ خیر زبانوں پر جاری ہے۔ اور جس کے باعث ان بزرگوں کو سعادتِ سرمدی حاصل ہوئی۔

اسی مقصد سے خواجۂ راستین معین الدین محمد چشتی رحمتہ اللہ علیہ، معروف بہ "آفتابِ ملکِ ہند" کی مقدس زندگی اور کارناموں کا تذکرہ نشر کیا جاتا ہے۔ جو اکابرِ اولیائے ہند میں سے ہیں اور جن کا شمار سلسلۂ چشتیہ کے بزرگ ترین افراد میں ہے۔

خواجہ صاحب چشتی اس لئے کہلائے کہ جس سلسلے میں یہ بیعت ہوئے۔ وہ بزرگانِ چشت کا سلسلہ تھا۔ چشت افغانستان کے علاقہ ہرات سے مشرق میں ایک بستی کا نام تھا حمداللہ مستوفی نے ۷۴۰ھ میں لکھا ہے کہ چشت اوسط درجہ کا شہر ہے۔ اس نام کی ایک ولایت بھی ہے جس میں تقریباً پچاس گاؤں ہیں۔ یہ ولایت ہری رود سے منسوب تھی۔

سلسلۂ چشتیہ کے متعدد بزرگ مثلاً خواجہ ابو احمد ابدال (متوفی ۳۵۵ھ) جو بعض کے نزدیک بانی سلسلہ ہیں، ان کے بیٹے محمد بن ابی احمد معاصر سلطان محمود غزنوی (متوفی ۴۱۱ھ) اور خواجہ مودود (متوفی ۵۲۷ھ) سب چشت کے تھے۔ اسی لئے چشتی کہلاتے تھے۔ خواجہ معین الدین علیہ الرحمتہ کا سلسلہ دو واسطوں سے انہی خواجہ مودود چشتیؒ تک پہنچتا ہے۔ اسی لئے خواجہ معین الدین بھی چشتی کہلاتے ہیں۔

خواجۂ بزرگ معین الدین محمد ملکِ سیستان میں پیدا ہوئے، سیستان کا علاقہ ایران اور افغانستان کے درمیان واقع ہے۔ آج اس کا رقبہ کوئی سات لاکھ مربع میل ہے۔ ۱۹۰۶ء میں اندازہ کیا گیا تھا کہ سیستان ۲ لاکھ ۵ ہزار نفوس پر مشتمل ہے سیستان کو عرب "سجستان" کہتے ہیں اور منسوب بہ سجستان کو وہ خلافِ قیاس سجزی کہتے ہیں۔ خواجہ صاحب کو بھی اسی بناء پر خواجہ معین الدین سجزی کہتے ہیں، یعنی سیستانی۔

آپ کے والد ماجد کا نام خواجہ غیاث الدین حسن تھا۔ جو حسینی سادات میں سے تھے۔ وہ ایک بزرگِ صالح تھے۔ اور زراعت و باغبانی میں مشغول رہتے تھے۔ جب

خواجہ صاحب پندرہ سال کے ہوئے تو ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اور ایک باغ اور ایک پن چکی خواجہ صاحب کے حصّے میں آئی، جن کے ذریعے وہ اپنی معاش حاصل کرنے لگے۔ ایک دن خواجہ صاحب باغ کے درختوں کو پانی دے رہے تھے کہ ایک مجذوب، جو ان کے وطن میں مقیم تھے اور ابراہیم قندزی کہلاتے تھے۔ خواجہ کے باغ میں آئے، خواجہ نے درویش ابراہیم کو آتے دیکھا تو دوڑ کر ان کا ہاتھ چوما۔ اور ایک درخت کے نیچے انہیں بٹھا کر ایک خوشہ انگور کا پیش کیا۔ اور ادب سے دو زانو ہو کر ان کے سامنے بیٹھ گئے۔ درویش ابراہیم نے تل کی کھلی نکالی اور چبا کر خواجہ صاحب کے مُنہ میں ڈالی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے کھاتے ہی خواجہ صاحب کے باطن میں ایک نُور روشن ہُوا اور ان کا دل املاک وخانہ سے سرد ہو گیا۔ درویش کے یُمن نظر سے دردِ طلب خواجہ کے دل میں اس طرح پیدا ہُوا کہ انہوں نے تمام اسباب واملاک کو بیچ دیا اور جو کچھ وصول ہُوا اُسے درویشوں میں بانٹ دیا۔ جب تعلقاتِ ظاہری قطع ہو گئے تو خواجہ نے سفر اختیار کیا اور سمرقند و بخارا پہنچے۔ وہاں پہنچ کر قرآن مجید حفظ کیا اور علم ظاہری حاصل کرتے رہے۔

ایک مدّت کے بعد وہ وہاں سے روانہ ہوئے اور شیخ المشایخ خواجہ عثمان ہرونی ؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ہرون جس کی طرف خواجہ عثمان منسوب ہیں، نیشاپور کے علاقے میں ہے۔ خواجہ عثمان کی خدمت میں خواجہ معین الدین بیس سال تک ریاضاتِ شاقہ اور مجاہداتِ دُشوار میں مصروف رہے۔ سفر و حضر میں وہ جنابِ خواجہ عثمان ؒ کی خدمت میں حاضر رہتے۔ اور خواجہ کا جامۂ خواب آپ کے سپرد رہتا۔ بیس برس کے بعد حضرت خواجہ عثمان نے خواجہ معین الدین ؒ کو خرقۂ خلافت عطا کیا۔ پھر آپ نے مُرشد سے

رخصت حاصل کی۔

ہفت اقلیم رازی میں خواجہ صاحب کی ایک تحریر نقل کی گئی ہے، جو ان کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی۔ اس میں خواجہ صاحب فرماتے ہیں: "بغداد کی مسجد جنید میں میں نے خواجہ عثمان ہرونی کی دولت ملازمت حاصل کی۔ فرمایا "دوگانہ پڑھو"۔ میں نے پڑھا۔ پھر فرمایا "قبلہ رُو بیٹھو"۔ بیٹھا۔ فرمایا "سورۃ البقرہ پڑھو"۔ میں نے تعمیل کی۔ اس کے بعد فرمایا: "بیس بار کلمہ سبحان اللہ پڑھو"۔ میں نے پڑھا۔ پھر فرمایا: "آؤ میں نے تمہیں خدا تک پہنچا دیا ہے" پھر قینچی لے کر چار تَرکی کلاہ تراشی اور گلیم خاص مجھے عطا کی۔ پھر کہا: "بیٹھو اور ہزار مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھو۔ ہمارے خانوادے میں یہی ایک دن اور ایک رات کا مجاہدہ ہوتا ہے جاؤ اور ایک رات اور ایک دن کو زندہ رکھو (یعنی جاگ کر عبادت میں مشغول رہو) جب دوسرا دن ہوا تو میں خواجہ کی خدمت میں گیا۔ فرمایا: "اوپر دیکھو" جب میں نے آسمان کی طرف منہ کیا تو پوچھا "کیا نظر آتا ہے؟" میں نے عرض کیا "عرش عظیم تک (راہ) کھلی ہے" پھر کہا "زمین میں کیا مشاہدہ کرتے ہو؟" عرض کیا "تحت الثریٰ تک میرے سامنے ہے" پھر اپنی دو انگلیاں کھولیں اور کہا: "کیا نظر آتا ہے؟" میں نے عرض کیا: "۱۸ ہزار جہانوں کا مشاہدہ کر رہا ہوں"۔ پھر فرمایا: "جاؤ تمہارا کام مکمل ہو گیا"۔

غرض جب حضرت خواجہ معین الدین کو پیر کامل نے رخصت دی تو آپ نے مسافرت اور غربت اور جہاں گردی کی زندگی شروع کی جس میں وہ خراسان، الجزیرہ، عراقِ عجم، عراقِ عرب اور آذربائیجان اور پھر ماوراء النہر ہوتے ہوئے غزنی کے راستے سے ہندوستان آئے۔ اس طول طویل سفر میں آپ نے ملک ملک کے اولیاء اللہ کی صحبت سے انواع فیض و جمعیت باطن حاصل کی۔ معرفت الٰہی کا سرمایہ بہم پہنچایا اور اسرار ایزدی

کا گنجینہ جمع کیا۔

چھٹی اور ساتویں صدی ہجری کا زمانہ تصوّف کے انتہائی ارتقاء کا زمانہ ہے مقبولان بارگاہِ الٰہی اور اولیاء اللہ جتنے اس دَور میں نظر آتے ہیں، وہ اس کے بعد کسی دَور میں نظر نہیں آتے۔

چنانچہ حضرت خواجہ معین الدین سنجار میں شیخ نجم الدین کبری کی خدمت میں ۲½ ماہ تک رہے۔ پھر حضرت شیخ عبد القادر جیلانی کی خدمت میں پہنچے۔ حضرت شیخ کوہِ جُودی کے دامن میں ایک مقام پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ جو بغداد سے سات منزل پر تھا۔ درویش جمالی صاحب "سیر العارفین" لکھتے ہیں کہ: "جس حجرے میں خواجہ معین الدین حضرت شیخ کے پاس ٹھہرے تھے وہ اب بھی موجود ہے اور اس کی مرمّت ہوتی رہتی ہے۔ میں نے اس بقعۂ مبارکہ کی زیارت کی ہے اور دوگانہ اس میں ادا کیا ہے۔" اسی طرح حضرت خواجہ نے بغداد میں شیخ ضیاء الدین ابو النجیب سہروردی اور ان کے مرید شیخ شہاب الدین عمر سہروردی اور شیخ اوحد الدین کرمانی کی زیارت کی اور ہمدان میں شیخ یوسف اور تبریز میں شیخ ابو سعید تبریزی اور استرآباد میں شیخ ناصر الدین اور غزنی میں شمس العارفین عبد الواحد کے حضور میں پہنچے۔

اس جہاں گردی کے زمانہ میں حضرت خواجہ لوگوں سے بہت کم ملتے۔ عموماً تنہا سفر کرتے۔ پہاڑ اور صحراء کے دامن میں بود و باش رکھتے۔ کسی بستی میں پہنچتے تو اکثر وہاں کے گورستان میں ٹھہرتے۔ روزانہ دو دفعہ قرآن مجید ختم کرتے۔ کہیں ٹھہرتے اور شہرت ہوجاتی یا لوگ ان کے حالات سے مطّلع ہوجاتے تو چپ چاپ وہاں سے روانہ ہوجاتے۔ کہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ تیر و کمان پاس رکھتے تھے۔ اپنی خواہش شکار سے

بہم پہنچاتے تھے۔ جامہ دوتائی (یعنی پوشش زیر قبا) پہنتے۔ اگر یہ جامہ کہیں سے پھٹ جاتا تو پاک چیتھڑا جس طرح کا بھی مل جاتا۔ اس کو لے کر پیوند لگا لیتے۔ درویش جمالی نے لکھا ہے کہ جب خواجہ قطب الدین اوشی حضرت خواجہ کے مرید ہوئے تو آپ نے وہی جامہ خواجہ قطب الدین کو عطا کیا اور خواجہ اوشی نے اپنی رحلت کے وقت وصیت کی کہ وہی جامہ شیخ فرید الدین اجودھنی کو دیا جائے اور وہ جامہ قاضی حمید الدین ناگوری کے سپرد کیا کہ شیخ فرید الدین کو پہنچا دیں۔ اس وقت شیخ فرید الدین ہانسی میں تھے۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیاء نے "فوائد الفواد" میں کہا ہے کہ میں نے وہ دوتائی مرقع دیکھا ہے۔

غزنی سے حضرت خواجہ معین الدین لاہور کو روانہ ہوئے۔ "سیر الاقطاب" میں ہے کہ حضرت خواجہ، زیارتِ خانہ کعبہ سے مشرف ہو کر مدینہ منورہ گئے۔ وہاں سے ارشاد ہوا کہ ہندوستان جاؤ۔ اس لئے خواجہ صاحب لاہور آئے۔ اس زمانے میں شیخ المشایخ حسین زنجانی لاہور میں موجود تھے۔ خواجہ صاحب اور حضرت زنجانی میں ملاقات ہوئی اور ان کے درمیان حد درجہ محبت و اتحاد قائم ہو گیا۔ خواجہ صاحب حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار پر بھی حاضر ہوئے۔ ان کا حجرۂ چلّہ کشی اس مزار کے پاس اب تک موجود ہے۔

لاہور سے خواجہ صاحب دہلی پہنچے اور چند مہینے وہاں ٹھہرے۔ چونکہ لوگوں کی آمد و رفت آپ کے پاس زیادہ ہوئی۔ یہ ہجوم آپ کو پسند نہ آیا اور آپ نے اجمیر کا عزم فرمایا۔ اس وقت چوہان راجپوتوں کا سردار اجمیر کا راجہ پرتھوی راج تھا۔ جسے رائے پتھورا بھی کہتے ہیں۔ وہ اس وقت اجمیر میں تھا۔ اجمیر دامنِ کوہ میں واقع، اور

اس میں ایک جھیل ہے۔ جس کا دور تین کوس کا ہے۔ حضرت خواجہ اس جھیل کے کنارے جا ٹھہرے اور وہیں عبادت مولیٰ میں مشغول رہنے لگے۔ کچھ عرصہ کے بعد حضرت خواجہ کے عقیدت مندوں میں سے ایک شخص کو کسی وجہ سے راجہ نے ایذا پہنچائی اور اس کی التجا پر حضرت خواجہ نے راجہ کے پاس اس کی سفارش کی۔ راجہ نے اس سفارش کے قبول کرنے کی سعادت نہ پائی اور کہا: یہ شخص یہاں آیا ہے اور بیٹھا غیب کی باتیں کرتا ہے۔ حضرت خواجہ نے یہ سنا تو فرمایا: "پتھورا را زندہ گرفتیم و دادیم" انہی دنوں میں یعنی ۵۸۸ھ میں سلطان معز الدین سام یعنی شہاب الدین غوری غزنی سے ہندوستان آیا۔ تھانیسر کے قریب رائے پتھورا سے جنگ ہوئی جس میں راجپوتوں کو شکست ہوئی اور رائے پتھورا اسیر ہو کر مارا گیا۔ اور ڈیڑھ سو راجے جو اس کے ہمراہ آئے تھے۔ ان میں سے اکثر اسی معرکہ میں کام آئے۔ اس عظیم الشان فتح کے بعد تقریباً سارے شمالی ہند میں اسلامی حکومت قائم ہو گئی۔

درویش جمالی لکھتے ہیں کہ حضرت خواجہ کے آثار کی برکت سے اس علاقے کے غیر مسلم شرف ایمان سے مشرف ہوئے اور جو ایمان نہ لائے وہ نذر و فتوح ان کی خدمت میں بھیجتے رہے۔ اب تک ان غیر مسلموں کی اولاد اسی طرح معتقد ہے۔ ہر سال آتے ہیں اور آپ کے آستانہ کی خاک پر سر رکھتے ہیں اور مجاوران روضۂ مطہرہ کی خدمت کرتے ہیں۔

اسی مصنف نے لکھا ہے کہ حضرت خواجہ جب دہلی تشریف لائے تھے تو اس مکان میں ٹھہرے تھے۔ جہاں اب شیخ رشید مکی کی قبر ہے۔ ان کی مسجد کے آثار سے ابھی تک ایک محراب باقی ہے۔ "اذکار ابرار" میں ہے کہ سلطان شمس الدین التمش کے زمانے

میں (یعنی ۶۵۷ھ اور ۶۳۳ھ کے درمیان) حضرت خواجہ دو دفعہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے پاس اجمیر سے دہلی تشریف لائے اور ہر دفعہ اسی مکان میں اُترے جس میں پہلی دفعہ اترے تھے) پہلی بار جو دہلی سے اجمیر گئے تو سیّد وجیہ الدین حسینی کی صاحبزادی کے ساتھ نکاح کر کے ہمراہ لے گئے۔ یہ وجیہ الدین سیّد حسین مشہدی فوجدار اجمیر کے عمّ بزرگوار تھے۔ سیّد حسین کو سلطان قطب الدین ایبک نے اجمیرؔ کا فوجدار بنا کر بھیجا تھا۔ جناب خواجہ نے ۲۷ سال تاہل کی زندگی بسر کی۔ آپ کے کئی صاحب زادے تھے۔

"اخبار الاخیار" میں جناب خواجہ کی تاریخ وصال رجب ۶۳۶ھ دی گئی ہے عمر مبارک سو سے چند سال کم تھی۔ آپ اجمیر ہی میں مدفون ہوئے۔ پہلے قبر اینٹوں کی تھی بعد میں اس قبر کو تو اسی طرح رہنے دیا گیا مگر اس کے اوپر پتھر کا صندوق بنا دیا گیا۔ قبر اسی سبب سے بلند ہے۔ خواجہ صاحب کی قبر کے اوپر کوئی عمارت نہ تھی۔ نویں صدی ہجری میں خواجہ حسین ناگوری نے جو ایک مشہور ولی اللہ شیخ حمید الدین صوفی ناگوری کی اولاد میں سے تھے اور جو سالہا سال تک حضرت خواجہ بزرگ کی قبر پر مجاور رہ کر عبادتِ الٰہی میں مشغول رہے تھے۔ سب سے پہلے اُنہوں نے اس روضہ کی عمارت کی بنیاد رکھی۔ بعد میں دروازہ اور خانقاہ کی تعمیر بعض سلاطینِ ہند نے کی۔ آج اس کی عمارت نہایت عالی شان ہے۔

خواجہ بزرگ کے وصال کے بعد بہت سے بادشاہ آپ کے روضہ میں نذریں بھیجتے رہے خصوصاً جلال الدین محمد اکبر بادشاہ جو حضرت خواجہ صاحب کا بہت زیادہ معتقد تھا "اکبر نامہ" میں ہے کہ ۹۶۹ھ میں اکبر شکار کے ارادے سے آگرہ سے فتح پور کی

طرف روانہ ہوا۔ راستہ میں ایک گاؤں پڑا، جس کا نام "منڈھاکر" تھا۔ ان کے قریب ہندی گایکوں کا ایک گروہ خواجۂ بزرگ کے مناقب سے متعلق اشعارِ دلفریب گانے میں مصروف تھا۔ بادشاہ نے یہ شعر سُنے تو اس کے دل میں حضرت خواجہ کے مرقدِ مبارک کی زیارت کا شوق پیدا ہوا، اور عین شکارگاہ سے بادشاہ نے مقربانِ بساطِ حضور کے ہمراہ جو شکار میں ساتھ تھے اجمیر کا رخ کیا۔ خواتین جو ساتھ تھیں اُن کے متعلق حکم دیا کہ وہ ماہم انگہ کے ساتھ میوات کے راستے سے آہستہ آہستہ اجمیر پہنچ جائیں اور وہ خود نہایت تیزی کے ساتھ اجمیر پہنچا۔ اور حضرت خواجہ کے روضہ کی زیارت کی۔ "تاریخ فرشتہ" میں ہے کہ اکبر بادشاہ زمانہ بادشاہی کے زمانے میں کئی سال پیادہ پا اجمیر کا سفر کیا اور روضۂ مبارک کی زیارت مشرف ہوا۔ ان میں سے ایک سفر کا حال "توزکِ جہانگیری" کے دیباچے میں یوں ہے کہ جب جہانگیر پیدا ہوا تو اکبر بادشاہ نے پیادہ اجمیر کا سفر کیا اور ۱۲ کوس روزانہ کے وہ سترھویں دن روضۂ مقدسہ پر پہنچا۔ جبینِ اخلاص اس آستانہ پر رگڑی اور زیارت ادا کئے اور خیرات و صدقات سے مستحقوں کو مالامال کر دیا۔ چونکہ ہر سال گروہ در گروہ عرس کے موقع پر آ کر جمع ہوتے تھے۔ اکبر بادشاہ نے ہی ان کی آسایش کے لیے فتح پور سے اجمیر تک ہر کوس پر پختہ کنواں اور بلند منارہ بنوایا، کہ رہروؤں کے لئے دلیلِ راہ ہو۔

خواجہ بزرگ ہندوستان میں اس وقت پہنچے، جب یہاں حکومتِ اسلام قائم ہونے کو تھی۔ اولیاء اللہ میں وہ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے انوارِ شریعت و طریقت مُلکِ ہند میں شائع کئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو ساتویں صدی کا مجدد کہتے ہیں۔ کیونکہ ان کے زمانے میں اسلام کی بنیاد اس ملک میں محکم ہوئی۔ دینِ اسلام کو ایک حیاتِ تازہ حاصل

ہوئی اور اولیاء اللہ کا اس ملک میں وہ سلسلہ شروع ہوا۔ جس کے سرسلسلہ حضرت خواجہ صاحب تھے۔ یہ اُنہی کے نفسِ قدسی کا تصرّف تھا کہ بلاواسطہ اور بالواسطہ راجپوتانہ اور شمالی ہند کے دُوسرے علاقوں کے لوگ حلقہ بگوشانِ اسلام میں داخل ہوئے۔ بلاواسطہ یوں کہ حضرت خواجہ صاحب نے خود دہلی اور اجمیر میں سینکڑوں لوگوں کو مشرف باسلام کیا۔ جناب قطب الدین اوشی لکھتے ہیں۔ کہ "جب حضرت خواجہ کا قدم مبارک اجمیر پہنچا تو اسلام اتنا پھیلا کہ اس کی حد نہ تھی"۔ بالواسطہ اس طرح کہ بہت سے مشایخ اور اولیاء کرام حضرت خواجہ کے زیرِ تربیت تیار ہوئے۔ جنہوں نے اسلام کا پیغام اس ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچایا۔ ان میں خواجہ قطب الدین اوشی اندجانی بھی ہیں جو ۵۲۲ھ میں خواجہ صاحب کے مرید ہوئے۔ وہ خود "دلیل العارفین" میں لکھتے ہیں کہ "بغداد میں امام ابواللیث سمرقندی کی مسجد میں شیخ شہاب الدین سہروردی اور شیخ اوحدالدین کرمانی، اور کئی بزرگوں کی موجودگی ہیں میں نے اپنا دستِ ارادت خواجہ بزرگ کے ہاتھ میں دیا۔ بعد میں سلطان ایلتمش کے عہد میں خواجہ قطب الدین ہندوستان آئے اور دہلی میں مقیم ہو کر اس نواح کے لوگوں کو فیض پہنچایا۔ خواجہ قطب الدین کے مرید اور خلیفہ شیخ فریدالدین گنج شکر اجودھنی ہیں۔ جنہوں نے مغربی اور مشرقی پنجاب میں تبلیغ کے فرائض انجام دیئے۔ شیخ فریدالدین گنج شکر کے مرید اور خلیفہ حضرت نظام الدین اولیاء ہیں جو اپنے پیر کی اجازت سے دہلی آئے اور بے شمار طالبانِ راہِ حق ان سے مستفیض ہوئے۔ اور ان کے خلفاء اقطارِ ہند میں رہنمائیِ خلق کے لئے پھیل گئے۔ ان میں سے شیخ نصیرالدین چراغ دہلی اور امیر خسرو کا حلقۂ عمل دہلی میں تھا۔ اور شیخ وجیہ الدین یوسف کا چندیری میں۔ اور شیخ یعقوب اور شیخ کمال کا مالوہ میں۔ اور مولانا غیاث الدین کا دھار میں اور مولانا مغیث الدین

کا اُجین میں، اور شیخ حسام الدین کا گجرات میں، اور شیخ برہان الدین غریبؒ اور خواجہ حسن کا دکھن میں۔ (قدس اللہ اسرارہم اجمعین)

غرض خواجہ معین الدین کا صدق و صفا ان مختلف صورتوں میں صدیوں تک خلق خدا کی ہدایت کا موجب بنا رہا اور آج تک بنا ہوا ہے۔ اور چھوٹے بڑے، اور مسلم اور غیر مسلم سب نے برابر اس سے فیض پایا ہے۔ اور شاہ و گدا نے یکساں اس آستانے سے نفع اٹھایا ہے۔

لاہور میں ایک دیوان چھپا تھا جسے "دیوان خواجہ معین الدین چشتیؒ" کے نام سے چھاپا گیا تھا۔ دیوان کی یہ نسبت صحیح نہیں ہے۔ مضمون اور زبان کے اعتبار سے یہ کئی صدی بعد کا کلام ہے۔ اور اس دیوان کے بہت سے اشعار "مدارج النبوت فی معارج الفتوت" میں پائے جاتے ہیں۔ "مدارج" ملا معین الدین فراہی معروف ملا مسکین کی تصنیف ہے۔ جو معین یا معینی تخلص کرتے تھے۔ غالباً یہ دیوان اُن کا ہے۔ البتہ "ہفت اقلیم" میں امین احمد رازی نے لکھا ہے۔ کہ خواجہ بزرگ گاہے گاہے کوئی مفرعہ یا شعر بھی کہہ دیتے تھے۔ چنانچہ یہ بیت آپ کا ہے ؂

لب ببند و چشم بند و گوش بند گر نہ بینی نور حق بر من بخند

گمان ہوا تھا کہ یہ شعر شاید مولانا رومؒ کا ہو۔ مگر مثنوی میں نہیں ملتا۔ اس لیئے ممکن ہے صاحب "ہفت اقلیم" کا قول درست ہو۔

حضرت خواجہ بزرگ کے مرید اور خلیفہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے "دلیل العارفین" میں خواجہ بزرگ کے ملفوظات جمع کئے ہیں۔ ان میں چند کلمات مبارکہ یہ بھی ملتے ہیں۔ ایک بار آپ کی مجلس میں نماز کا ذکر ہوا تو شیخ الاسلام نے

فرمایا کہ: "منزل گاہ قرب سے لوگ صرف نماز ہی میں نزدیک ہو سکتے ہیں۔ اس لئے کہ نماز ہی معراج المؤمنین ہے۔ اور حق سے پیوستگی کے سب مقامات سے برتر یہی نماز ہے"

پھر فرمایا کہ: "نماز وہ راز ہے جو بندہ اپنے پروردگار سے کہتا ہے۔ اور راز کہنے میں قرب اسی کو حاصل ہوتا ہے جو اس راز کے لائق ہے۔ اور راز نماز ہی میں کہا جاتا ہے"۔ حدیث قدسی میں لکھا ہے کہ نماز پڑھنے والا اپنے پروردگار سے اپنا راز کہتا ہے۔

اسی کتاب میں ہے کہ آپ کی مجلس میں ایک دفعہ ذکر ہوا کہ محبت میں صادق کون ہے آپ نے فرمایا: "محبت میں صادق وہ ہے کہ جب دوست کی بھیجی ہوئی بلا اُس پر نازل ہو تو وہ خوشی سے اس بلا کو قبول کرے۔"

ایک بار فرمایا: "جہان کی ہر چیز میں جو کُن فیکون کی قدرت موجود ہے عجائبات نمایاں ہیں۔ اگر آدمی اس وسعت میں مستغرق ہو تو کھو جائے اور ہوش اور حواس سے عاری ہو جائے [بقول عرفی ؎

ہر کس نہ شناسندۂ راز است وگرنہ ٭ این ہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است]

یہ چند کلمات قدسی صفات بھی آپ ہی کے ہیں:۔

"محبت کی علامت یہ ہے کہ تم مطیع رہو اور ڈرو کہ مبادا دوست تمہیں دُور ہٹا دے"

"اہلِ معرفت کی عبادت پاسِ انفاس ہے۔"

"بدبختی کی علامت یہ ہے کہ گناہ کرے اور امید رکھے کہ میں مقبول ہوں گا۔"

"حقیقی متوکل وہ ہے کہ رنج و محنت خلق سے اٹھائے مگر نہ کسی سے شکایت کرے نہ کسی سے حکایت کہے۔"

"گناہ سے تمہیں اتنا ضرر نہیں پہنچتا، جتنا اپنے مسلمان بھائی کی بے حرمتی کرنے، اور

"…سے حقیر سمجھنے سے ہوتا ہے۔"

ایک بار فرمایا: "خواجہ حسن ہرَوَنی سے میں نے سُنا کہ جس شخص میں تین خصلتیں ہوں، تحقیق جانو کہ حق تعالیٰ اسے دوست رکھتا ہے: اوّل، سخاوت، جو دریا کی طرح کی سخاوت ہو۔ دوم، شفقت، جو آفتاب کی طرح کی شفقت ہو۔ سوم، تواضع، جو زمین کی طرح کی تواضع ہو۔"

موت کا ذکر ہوا تو آپ نے فرمایا: "موت ایک پُل ہے جو دوست کو دوست تک پہنچاتا ہے۔"

جب آپ نے خواجہ قطب الدین کو آخری مرتبہ رخصت کیا تو فرمایا: جہاں رہو کسی کی دل خراشی نہ کرنا۔ جس جگہ رہو مردِ دین کر رہنا۔"

(۲)

حضرت معین الدین چشتیؒ کے تبلیغی اور ثقافتی کارنامے

آفتابِ ملکِ ہند خواجۂ بزرگ معین الدین محمد چشتی اس ملک میں سلسلۂ چشتیہ کے بانی اور مشایخ کبار کے سردار ۵۳۷ھ (۱۱۴۲ یا ۱۱۴۳ء) میں سیستان میں پیدا ہوئے۔ اس لیے سجزی کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ چشت، جس کی طرف یہ سلسلہ منسوب ہے، ہرات کے مشرق میں بالائی ہری رود کی ایک ولایت اور شہر ہے۔ شہر چشت جو اوبہ سے مشرق کی طرف دو دن کی راہ پر ہے۔ جسے "نزہتہ القلوب" (ص ۱۵۴) میں متوسط درجہ کا شہر بتایا گیا ہے آج کل "خواجہ چشت" کہلاتا ہے۔ اور یہیں سے غور کا علاقہ شروع ہوتا ہے (حدود العالم ص ۳۴۳، لیسٹرینج نقشہ ۸، خشت فرشتہ طبع پرگز ۲: ۱۲۔ مشہور ترک فاضل آقائے

زکی ولیدی طوغان تے جو زیارت کے لیۓ اجمیر بھی پہنچے تھے۔ مجھے بتایا کہ دراصل چشت ترکستان کے مواضع میں سے ہے۔ اور یہ والا چشت بعد میں اس نام پر آباد ہوا۔ غرض خواجہ صاحب کا نشو و نما خراسان میں ہوا۔ آپ ۱۵ رسال کے تھے کہ آپ کے والد بزرگوار غیاث الدین حسن کا انتقال ہوا۔ ایک باغ اور پن چکی جو ورثہ میں ملی اس سے گذر اوقات کرنے لگے۔ وہیں ایک مجذوب ابراہیم قندزی رہتے تھے۔ وہ ایک دن باغ میں آئے ان کی ملاقات کے بعد جناب خواجہ کو جذب الٰہی نے ایسی کشش کی کہ ان کا دل گھربار اور املاک سے سرد ہو گیا۔ آپ نے دو تین دن کے بعد اسباب و املاک بیچ کر فقیروں میں بانٹ دیا اور سفر پر روانہ ہو گئے۔ کچھ مدت سمرقند اور بخارا میں ٹھہرے۔ قرآن مجید حفظ کیا اور علم ظاہری پڑھا۔ پھر عراق عرب کی طرف روانہ ہوئے۔ نواح نیشاپور کے ایک قصبے ہروَن میں شیخ المشایخ خواجہ عثمان ہرونی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور چند سال تک ریاضت و مجاہدہ میں مشغول رہے۔ خواجہ عثمان نے مسافرت اختیار کی تو خواجہ صاحب سفر میں برسوں تک ان کے ہمراہ رہے۔ ان کا لوٹا اور بستر سر پر رکھے منزل بہ منزل ان کے ساتھ چلتے رہے۔ آخر شیخ المشایخ سے خرقۂ خلافت پایا۔ اس وقت آپ کی عمر ۵۲ سال تھی (معارج الولایۃ) اس کے بعد آپ نے خدا شناسوں کی ملاقات کے ارادے سے جہاں گردی شروع کی۔ شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی کی خدمت میں پہنچے اور ۵ مہینے سے زائد مدت میں ان سے فیض حاصل کیا۔ اسی طرح سنجار، بغداد، ہمدان، تبریز، مہنہ، خرقان، استرآباد، ہرات، سبزوار، حصار شادمان، بلخ وغیرہ مقامات پر مختلف اولیا اللہ کی خدمت میں تھوڑے تھوڑے روز حاضر رہ کر معرفت الٰہی کا سرمایہ بہم پہنچایا۔ اور وہ غزنی کے راستے لاہور آئے۔ اور دو مہینے مخدوم علی ہجویری

کے مزار پُر انوار پر معتکف رہے۔ شیخ المشائخ حسین زنجانی لاہور میں تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی۔ اسی زمانے میں سلطان معزّ الدین محمد سام نے دہلی فتح کر کے قطب الدین ایبک کے سپرد کی تھی۔ مگر خود غزنی کی طرف واپس جاتے ہوئے دمیک کے مقام پر شہادت پائی خواجہ صاحب دہلی پہنچے اور وہاں کچھ عرصہ ٹھہرے۔ کہتے ہیں کہ ان کے قیام دہلی کے اثناء میں سات سو آدمیوں نے اسلام قبول کیا۔ مگر خاص و عام کے اژدہام سے گھبرا کر خواجہ صاحب خطّۂ اجمیر کی طرف روانہ ہو گئے۔ شہر اجمیر کو چوہانوں نے ۱۴۵ھ میں اروَنی پربت کی ایک پہاڑی تار اگڑھ کے دامن میں بسایا تھا۔ تار اگڑھ کی چوٹی پر قلعہ ہے جس کی بلند اور مضبوط فصیل ایک وسیع سطح مرتفع کو گھیرے ہوئے ہے۔ فصیل کا محیط ۲ میل ہے۔ قلعہ کا راستہ نہ صرف دشوار گذار ہے، بلکہ قلعہ اور بیرونی استحکامات کی زد میں ہے۔ اجمیر سے تین کوس پر ایک جھیل ہے جو قدیم سے ہندوؤں کی پرستش گاہ ہے۔ ہر سال چھ دن یہاں میلہ لگتا ہے۔ اور لوگ یہاں اشنان کرتے ہیں اور کتب ہنود کے مطابق یہ جھیل سب معبدوں کے مرشد کا مقام رکھتی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ قیامت یہاں سے شروع ہو گی۔ ان کے نزدیک اگر کسی نے جہان بھر کے پاک مکانوں میں اشنان کیا ہو مگر اس جھیل میں نہ کیا ہو تو اُسے ثواب نہیں ملتا۔ جناب خواجہ ۵۸۸ھ (۱۱۹۲ء) میں جب ہندو مت کے اس گڑھ میں تشریف لائے تو صورتِ احوال یہ تھی کہ اجمیر کا کچھ علاقہ مسلمان فتح کر چکے تھے۔ اور اس میں سلطان ایبک نے سیّد حسین مشہدی کو داروغہ مقرر کیا ہوا تھا۔ مگر ایک فرسنگ جگہ ابھی چوہانوں کے قبضے میں تھی۔ قلعہ کہیں ۵۸۹ھ (۱۱۹۳ء) میں مسلمانوں کے قبضے میں آیا اور یہاں کا راجہ رائے پتھورا سلطان معزّ الدین سام کے ہاتھوں اسیر ہوا۔ جناب خواجہ کے فیضِ صحبت اور تبلیغ کے اثر سے اس نواح کے بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ کہتے ہیں، کہ

سلطان شمس الدین التمش کے زمانے میں آپ دربارِ دہلی تشریف لے گئے ورنہ اجمیر ہی میں قیام رہا اور یہیں ۶۳۳ھ (۱۲۳۶ء) میں آپ کا وصال ہوا۔ اور وہیں آپ کو دفن کیا گیا۔ احسان مند اور منّت پذیر دُنیا مسلمان اور ہندو، شاہ و گدا اُس وقت سے اب تک آپ کی قبر پر زیارت اور برکت کے حصُول کے لئے حاضر ہوتے رہے ہیں، اور حاضر ہوتے ہیں۔

حضرت خواجہ صاحب نے اِس نواح میں تبلیغ کیونکر کی، اس کے حالات ہماری تاریخوں میں محفوظ نہیں ہوئے۔ اِس لئے کہ دعوت و تبلیغ ہمارے ہاں جماعتی یا سرکاری کام نہیں، بلکہ ہمیشہ انفرادی فریضہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ جس کی کوئی رپورٹ کبھی مرتّب نہ کی گئی۔ تاہم قرائن سے بعض باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ اجمیر کے اس سیاسی اور مذہبی مرکز کے اوپر کے طبقوں میں مال و دولت کی بہت افراط تھی۔ ہندوستان کی پیداوار مقامی ضرورت کے لئے نہ صرف کافی تھی بلکہ ضرورت سے بہت زیادہ تھی اِس لئے باہر سے مالِ تجارت منگوانے کی حاجت نہ تھی۔ مگر برآمد بہت تھی۔ اِس لئے باہر کا سونا ملک میں کھچا چلا آتا تھا۔ چنانچہ اجمیر کی لُوٹ میں سے سلطان معزّالدین نے سلطان غیاث الدین محمد سام کو جو تحفے بھیجے، ان میں علاوہ اور چیزوں کے بہت سے سونے کے مصنوعات بھی تھے۔ "طبقاتِ ناصری" (ص ۴۰) میں ان تحائف کی تفصیل یوں دی ہے:۔

(۱) پانچ سونے کے بنے ہوئے مرصع کنگرے جنہیں فیروز کوہ کے "قصرِ کوشک" کے اوپر لگایا گیا۔ ان میں سے ہر کنگرے کا طول ۳ گز سے زائد اور عرض ۲ گز تھا۔

(۲) دو سونے کے بنے ہوئے ہما، جن میں سے ہر ایک بڑے اونٹ کے برابر تھا۔

(۳) سونے کا کنڈا اور زنجیر ۔۔۔ اور

(۴) ایک سونے کا خرزہ جس کے دائرے کا قطرہ ۵ گز تھا۔

(۵) دو سونے کے نقارے جو اتنے بڑے تھے کہ چھکڑے پر لاد کر لائے گئے تھے۔ سلطان نے کنڈا اور زنجیر وغیرہ فیروز کوہ کی مسجد کے پیش طاق میں لٹکوا دیئے۔ اتفاق سے مسجد طغیانی سے ڈھے گئی تو یہ کنڈا وغیرہ فروخت کر دیا گیا۔ ان کے داموں سے جامع مسجد ہرات کو جو آتشزدگی سے ویران ہو گئی تھی دوبارہ تعمیر کیا گیا۔

مذکورہ چیزیں اس قسم کی چیزیں ہیں کہ جو عام طور پر سونے سے بنائی نہیں جاتیں۔ اسی سے قیاس کرنا چاہیئے کہ اس زمانے میں اجمیر کی ثروت کا حال کیا ہوگا۔ مگر یہ ثروت صرف اوپر کے طبقوں کے لئے مخصوص تھی۔ اور جو آسائشیں اور لذتیں روپے کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہیں انہیں میسّر تھیں۔ مگر نیچے کے طبقوں کی حالت پست تھی اور ان کی اجتماعی کیفیت ناقص۔ ان سے نفرت کا سلوک کیا جاتا تھا اور ان کی بہبود سے سوسائٹی بے پرواتھی۔ ان کی ہر گونہ ترقی رکی ہوئی تھی اور وہ ایک زبردست انقلاب کے کنارے پر پہنچے ہوئے تھے۔ حضرت خواجہ جب ایسے دین کا پیغام لے کر پہنچے۔ جس میں نہ ذات پات کے بندھن تھے' نہ چھوت چھات کی لعنت' نہ طبقاتی تقسیم تھی جو بعض کو لطف زندگی کا اجارہ دار بنا دے' اور بعض کو محروم مطلق۔ نہ کسی کے دینی یا دنیاوی عزائم کے راستے میں کوئی رکاوٹ تھی۔ ایک خدا کے پوجنے والے سب برابر تھے۔ ہاں شرف اسے حاصل تھا جو دوسروں سے زیادہ تقویٰ رکھتا تھا۔ مختصر یہ کہ توحید اور مساوات اور اسلامی اخوت کے متعلق لوگوں نے جناب خواجہ کی صدائے حق پر لبیک کہا اور بقول ابوالفضل ان کے دم گیرا کی برکت سے جوق در جوق لوگوں نے فیض پایا اور حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔

توحید کی صاف اور واضح اور مثبت تعلیم نے ان لوگوں کو اپنی طرف کھینچا، جو اوہام پرستی میں مبتلا تھے۔ اور بُت پرستی کی مبہم اور غیر واضح تعلیم سے مطمئن نہ تھے۔ ایک طرف وجودِ باری پر کامل یقین تھا اور دین کے حقائق پر پختہ ایمان، دوسری طرف صدہا دیوتاؤں کی پُوجا تھی اور پریشان خیالی اور ذہنی انتشار، ان دونوں میں کشمکش ہوئی۔ اس کشمکش کا نتیجہ صرف ایک ہی ہو سکتا تھا۔ یعنی حق و راستی کی فتح۔ خواجہ صاحب نے توحید کا پیغام کیا دیا، لوگوں میں نئی مذہبی حس بیدار کر دی۔ ان میں ایمان پیدا کیا۔ ان کے فکر کو نئی زندگی اور نئی قوّت بخشی۔ جس نے ذہنی ترقی اور فلاحِ عمومی کا ایک نیا باب شمالی ہند میں کھول دیا۔

بلاشبہ حضرت خواجہ کی جاذب شخصیت کی مقناطیسی تاثیر کو اس بارے میں بے حد دخل تھا۔ "معارج الولایت" میں ہے کہ آپ جب مدینہ منوّرہ میں تھے تو حضرت سرورِ کائنات (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خواب میں آپ کو بشارت دی اور فرمایا کہ تمہیں بارگاہِ ایزدی سے ہندوستان کا ملک سپرد ہُوا ہے۔ وہاں جاؤ اور اجمیر کو اپنا مقام بناؤ۔ تمہارے اور تمہارے خلفاء کے اتقاء کی بدولت اسلام اس سرزمین میں ضرور پھیلے گا۔ آپ اور آپ کے ساتھی اجمیر پہنچے تو عبادتِ مولیٰ میں مشغول ہو گئے۔ اناساگر کے کنارے ایک باصفا دلکش مقام پر قیام کیا۔ اسی جھیل کے کنارے بہت سے بُت خانے بھی بنے ہوئے تھے۔ یہ لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو چند ہی دنوں میں گمراہی سے تائب ہو جاتے۔

"سیر الاولیاء" میں ہے کہ رائے پتھورا اور اس کے مقرّبوں پر آپ کا اجمیر میں رہنا بہت گراں گذرا مگر جناب شیخ کی عظمت و کرامت کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے۔ اس لئے دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ آپ نے راجہ اجمیر کو بھی مشفقانہ نصیحتوں کے ساتھ اسلام کی

طرف دعوت دی، مگر یہ دولت اس کے نصیب میں نہ تھی۔ اس کے جلد بعد اس کی حکومت اور زندگی دونوں کا خاتمہ ہو گیا۔" سیر الاولیاء" نے آپ کی کرامتوں کے سلسلے میں خوب کہا ہے کہ ملک ہندوستان انتہائے مشرق تک کفرو کافری اور بُت و بُت پرستی کا ملک تھا۔ اور سرکشانِ ہند مُشرک تھے اور سنگ و کلوخ اور دار و درخت اور ستور و گاؤ وغیرہ کی پُوجا کرتے تھے۔ ان کے تاریک دلوں پر کفر کے قفل پڑے ہوئے تھے۔ نہ کسی کو دین و شریعت کی خبر تھی، نہ خدا و پیغمبر کی۔ نہ کسی نے قبلہ دیکھا تھا، نہ اللہ اکبر سنا تھا۔ خواجہ صاحب کے مبارک قدم یہاں پہنچے۔ تو یہ ملک نُورِ اسلام سے روشن اور منوّر ہُوا۔ یہاں جو شخص مسلمان ہُوا یا آئندہ ہوگا اور ان کی اولاد جو مسلمان ہوگی تو قیامت تک اس کا ثواب شیخ الاسلام معین الدین کو پہنچتا رہے گا۔

صاحب "معارج الولایت" نے "سیر الاولیاء" کے کلام کا ماحصل یوں بیان کیا ہے کہ ہر مسلمان پر، جو ہندوستان میں پیدا ہو، حضرت خواجہ صاحب کو حقِ اسلام پہنچتا ہے۔ اس لئے کہ خواجہ صاحب ہندوستان تشریف لانے سے اسلام کو اور مسلمانوں کو تمکّن نصیب ہُوا ہے۔

ازنگاہِ کرمش فتحِ معزّ الدین سام
وزجلالِ نظرش بستہ پتھورا بینند

یعنی ___ معزّ الدین سام کو آپ ہی کی نظرِ عنایت اور صفتِ جمالی سے فتح نصیب ہوئی (جس سے مسلمانوں کے قدم شمالی ہند میں جمے) اور رائے پتھورا کا اسیر و مقہور ہونا بھی آپ کی جلالی صفت کا کرشمہ تھا۔

حضرت بہاء الدّین زکریا ملتانی کے حالاتِ زندگی

چھٹی صدی ہجری (بارھویں صدی عیسوی) میں شیخ الشیوخ عالم شہاب الدین سہروردی صاحبِ "عوارف المعارف" نے جو شیخ سعدیؒ کے استاد تھے، بغداد میں اس صحیح عقیدۂ تصوّف کی بنیاد رکھی جسے سلسلۂ سہروردیہ کہتے ہیں۔ شیخ الاسلام بہاء الحق و الدّین زکریا ملتانی قدس اللہ سرّہ العزیز نے ان سے بیعت کی۔ اور ان کے خلیفہ کی حیثیت سے اس سلسلہ کو ہمارے ملک میں رواج دیا۔ اس سلسلے کی خصوصیت یہ تھی کہ باطن ہویّت میں مصروف رہے اور ظاہر شریعت و طریقت میں۔ اب ہم سہروردیۂ ہند کے سرِ سلسلہ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریاؒ بن وجیہ الدین محمدؒ بن کمال الدین علی کی زندگی کے حالات مختصر طور پر بیان کرتے ہیں۔ گو آپ کے حالات بہت کم محفوظ ہوئے ہیں۔ ابنِ بطوطہ (طبع یورپ ۳ : ۱۰۲) نے شیخ بہاء الدین کے پوتے شیخ رکن الدین سے سنا کہ اُن کا جدّ اعلیٰ محمد بن قاسم قرشی اس لشکر میں بھرتی ہو کر سندھ پہنچا جو حجّاج بن یوسف نے بھیجا تھا۔ اور فتح سندھ میں شامل ہوا۔ اور فتح کے بعد سندھ ہی میں بس گیا۔ اور اُسے اللہ نے بہت سی آل اولاد دی۔ مشہور روایت کے مطابق شیخ الاسلام زکریا کا دادا مولانا کمال الدین علی مکّہ مکرمہ سے آکر خوارزم میں آباد ہوا۔ وہاں سے ملتان آیا اور وہاں کی سکونت اختیار کی۔ گویا کچھ افراد اس خاندان کے سندھ سے حجاز کو واپس ہوئے اور دوبارہ یہاں آئے۔ تحصیل لیہّ میں ایک قدیم قصبہ کوٹ کروڑ ہے۔ ایک مہاجر بزرگ مولانا حسام الدین ترمذی خروج تاتار کی وجہ سے اپنا وطن چھوڑ کر وہاں آ بسے۔ ان کی بیٹی سے مولانا کمال الدین علی نے اپنے بیٹے وجیہ الدین محمد کی شادی کی۔ اور ۵۶۵ھ (۱۱۷۰ء) یا بروایتے ۵۷۸ھ (۱۱۸۲ء) میں

ان کے گھر شیخ بہاء الدین پیدا ہوئے۔ ابتدائے شباب ہی میں آپ نے تحصیل علم کے لئے سفر اختیار کیا۔ پہلے خراسان کے بزرگوں سے بعض کتابیں پڑھیں، پھر توران کا رُخ کیا۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ وسط ایشیا میں خوارزم شاہیہ کا تسلّط تھا۔ پہلے تکش اور اس کے بعد علاء الدین محمد خوارزم شاہ تخت نشین ہوا۔ بخارا اور سمرقند میں اس دور میں فقہ و حدیث کا بحر زخّار موجزن تھا۔ چھٹی صدی کے مشہور ترین علماء اس دور میں تورانی تھے مثلاً قاضی خان اوزجندی فرغانی، علی مرغینانی صاحب ہدایہ، نجم الائمہ بخاری، بنو مازہ وغیرہ انہی بزرگوں اور ان کے شاگردوں اور معاصروں کی کشش ہوگی جو شیخ بہاء الدین زکریا کو بخارا اور سمرقند کی طرف لے گئی۔ اور جب وہ اسلامی دُنیا کے طویل سفر کرنے کے بعد ملتان واپس آئے تو اس بغایت مستند مذہبی لٹریچر کی روایت جو اُن دنوں ماوراء النہر میں پیدا ہوا تھا اپنے ہمراہ اپنے وطن میں لائے۔ انہوں نے بخارا میں نہ صرف اپنی تعلیم کو مکمل کیا، بلکہ ۱۵ سال تدریس اور افادۂ علوم میں بھی مصروف رہے۔ آخر وہ زیارت حرمین شریفین کے لئے گئے اور حج و زیارت سے فارغ ہو کر پانچ برس تک مدینہ منوّرہ میں مقیم رہے اور شیخ کمال الدین محمد یمنی سے، جو بہت بڑے محدّث تھے اور ۵۳ برس سے مدینہ میں حدیث پڑھا رہے تھے۔ کتب حدیث پڑھ کر اجازہ حاصل کیا۔ مدینہ منوّرہ سے وہ بیت المقدّس گئے اور مسجد اقصیٰ اور مشاہد انبیاء کی زیارت کی سعادت حاصل کی۔ پھر بغداد پہنچے اور شیخ الشیوخ عالم شہاب الدین عمر سہروردی سے بیعت کی اور خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ شیخ نظام الدین اولیاء سے روایت ہے کہ فقط سترہ دن میں آپ نے خرقہ حاصل کیا۔ پیر روشن ضمیر نے آپ کو وداع کرتے وقت ملتان کے قیام کا حکم دیا۔ اور اس علاقے کی ہدایت و ارشاد آپ کے سپرد کی۔ آپ ایک طویل راستے سے بغداد سے خوارزم ہوتے ہوئے ملتان پہنچے۔ متاہل ہوئے

اور خدا نے انہیں رشید اور صالح اولاد عطا فرمائی۔

علمِ ظاہر و باطن کی خاطر اس زمانے کے وسائلِ نقل و حرکت کے اعتبار سے، اتنا طویل اور مشکل سفر حیرت ناک ولولے اور جذبے اور شوق اور جفاکشی پر دلالت کرتا ہے جب ابن بطوطہ ہمیں بتاتا ہے کہ ان سے دو پشت بعد ان کی اولاد میں سے ایک شخص بہاء الدین اسمٰعیل اسے خلیج فارس کے کنارے بندر رام ہرمز میں ملا۔ جو مشایخ تبریز وغیرہا سے تعلیم پاکر اس شہر میں مقیم تھا تو ذرا بھی تعجب نہیں ہوتا، کیونکہ بزرگوں کے سفرِ علمی کی ایسی شاندار روایت ان کے گھر میں موجود تھی۔

شیخ الاسلام کے دستِ حق پرست پر ہزاروں لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ غوریوں کے زمانے میں بہت سے غیر مسلم راجپوت قبیلے ہندوستان کے صوبوں سے ہجرت کر کے پنجاب میں آبسے تھے، ان میں کھرلوں، ٹوانوں، گھیبوں، اور ہنوار سیالوں کے اجداد بھی شامل تھے۔ جناب بہاء الحق اور ان کے خالہ زاد بھائی اور دوست بابا فرید گنج شکر کی مساعی سے یہ لوگ اس کثرت سے مسلمان ہوئے کہ ایک انگریز افسر لکھتا ہے کہ: "اس زمانہ میں مسلمان ہوجانا فیشن میں داخل ہوگیا تھا"۔ لوگوں کے قبولِ اسلام کی دوسری وجہ اس زمانے کے سیاسی حالات بھی تھے۔ ملتان میں اس دور میں بہت سے انقلاب آئے۔ غزنویوں کی حکومت گئی تو غوری آئے۔ پھر خاندان غلاماں برسرِ اقتدار آیا۔ جن کے نو بادشاہوں کا زمانہ قطب الدین ایبک سے غیاث الدین بلبن تک، جناب شیخ الاسلام نے دیکھا۔ ملک ناصر الدین قباچہ اور التتمش کے درمیان ملتان اور اُچ کے بارے میں خونریز معرکے ہوئے، جن میں بالآخر التتمش کامیاب ہوا ۔۔۔ پھر جلال الدین منکو برنی نے ملتان پر قبضہ کرنے کے لیے سخت کوشش کی اور ملک میں سخت

افراتفری پیدا ہوئی۔ پھر تاتاری اس کے تعاقب میں چند بار اس علاقے میں آئے اور تباہی پھیلائی۔ پھر قارلغ ترکوں نے اس علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ اور ان میں اور حکامِ دہلی میں کشمکش رہی۔ اس تمام بد امنی اور بربادی اور ویرانی اور خرابی نے لوگوں کے دلوں کو مذہب سے تسکین ڈھونڈنے پر مجبور کیا۔ اور جناب شیخ الاسلام نے اسلام کا پیغام بر وقت ان تک پہنچایا۔ ان کی ڈھارس بندھائی اور ان کی اُمیدوں کی سوختہ کشتِ زار کو پھر سے ہرا کیا۔ شیخ الاسلام کے متعدد صاحبزادوں اور مریدوں اور خلفاء اور ان کے خلفاء نے اس سلسلے کو جاری رکھا۔ چنانچہ آپ کے خلیفہ سید جلال الدین بخاری اُچّی کے ہاتھ پر چنّڑ جاٹوں کے اجداد نے اسلام قبول کیا۔ اور ان کے پوتے سید مخدوم جہانیاں کی کوشش سے علاقہ ملتان کے نونوں کے اجداد مسلمان ہوئے، اور اسی طرح اور بہت سی قومیں حلقہ بگوشِ اسلام ہوئیں۔

سندھ اور جنوبی پنجاب میں جابجا جال کے درختوں کے نیچے کوئی پانچ چھ سو بیٹھکیں ہیں۔ لوگ ان درختوں کو نہیں کاٹتے۔ کہتے ہیں کہ مذکورہ بزرگوں کے تبلیغی دوروں کے ساتھ ان بیٹھکوں کا تعلق ہے۔ پس یہ بیٹھکیں آج بھی ان بزرگوں کی سعی ہائے مشکور کی شاہد ہیں۔

جناب شیخ کے نامور مریدوں میں سے دو مشہور شاعر ہیں، ایک شیخ فخر الدین عراقی جو آپ کے مرشد کے بھانجے تھے۔ اور ہمدان سے قلندرانہ وضع میں آپ کے پاس پہنچ کر ۲۵ سال تک آپ کی خدمت میں حاضر رہے۔ اور آپ کے وصال کے بعد حج کو چلے گئے۔ دوسرے امیر حسینی ہروی ہیں۔ جو مثنوی "کنز الرموز" اور "زاد المسافرین" اور "نزہتہ الارواح" کے مصنف ہیں۔ وہ ظاہر و باطن کے عالم تھے۔ باپ کے ساتھ

برسم تجارت ملتان آئے۔ اور واپس گئے۔ باپ فوت ہوئے تو تجرید و تفرید نے زور کیا۔ مال و دولت فقیروں کو بانٹ دیا اور ملتان آ گئے۔ اور جناب شیخ الاسلام سے بیعت کی اور تین برس ملتان مقیم رہ کر فیض پایا۔ ان کی قبر ہرات میں ہے۔ ان دونوں بزرگوں نے جناب شیخ الاسلام کی تعریف اپنے اشعار میں بہت جوش سے کی ہے۔ ایک نے آپ کی جان پاک کو "منبع صدق و یقین" کہا تو دوسرے نے آپ کی جبین کو "مشرقِ نورِ یقین" بتایا ہے۔ ایک نے آپ کی وجہ سے ہندوستان کو "جنّت المادیٰ" کہا ہے، تو دوسرے نے آپ کو "شیخ جہان" اور "امام زمان" اور "قطب وقت" لکھا ہے۔

شیخ الاسلام بہاء الدین کے وصال کی تاریخ اکثر مآخذ میں ۷ صفر سنہ ۶۶۶ھ (۲۸ اکتوبر سنہ ۱۲۶۷ء) لکھی ہے۔ گو بعض جگہ سنہ ۶۶۱ء بھی مذکور ہے۔ نمازِ جنازہ آپ کے صاحبزادے شیخ صدر الدین نے پڑھائی اور آپ کو قلعۂ ملتان میں دفن کیا گیا۔ سلطانہ رضیہ نے آپ کی خانقاہ کے لئے بہت سے گاؤں دیئے۔ بعد کے زمانے میں محمد تغلق نے بھی خانقاہ اور روضے کے متولیوں کو جاگیریں عطا کیں۔ کہتے ہیں کہ آپ نے اپنا مقبرہ اپنی زندگی ہی میں خود بنوایا تھا۔ ہندوستان بھر میں اس دَور کی طرزِ تعمیر کا دُوسرا نمونہ صرف ایک اَور ہے جو سونی پت میں ہے۔ عمارت کا نیچے کا حصّہ مربع ہے۔ اس کے اوپر ہشت پہلو عمارت ہے۔ اور اس کے اوپر نیم کردی گنبد۔ مشرقی رُخ کاشی کار ہے، باقی تین طرفوں پہ کاشی کا کام اب باقی نہیں رہا۔ سنہ ۱۸۴۸ء میں جب انگریزوں نے قلعہ کا محاصرہ کیا تو گولہ باری سے قلعہ کا میگزین اُڑ گیا۔ اور قلعے کی عمارتوں کو بہت نقصان پہنچا۔ چنانچہ اس مقبرہ کی عمارت کو بھی نقصان پہنچا۔ مگر مخادیم شاہ محمود نے چندہ کر کے مرمّت کرادی۔

اسی زمانے میں دیوان مولراج صوبیدار ملتان نے بیان کیا کہ قدیم الایام سے بعہد

سلاطین و حکام دیگر دستور تھا کہ جب سرکار سے نیا صوبیدار متعین ہو کر ملتان آتا تو صوبہ دار معزول اور صوبہ دار منصوب خانقاہ جناب شیخ بہاء الحق پر حاضر ہوتے۔ اور کلید قلعہ نئے صوبہ دار کو وہاں دی جاتی۔ اور یہ امر طرفین کے لئے باعث برکت تصور ہوتا۔

جناب شیخ الاسلام کو خدا نے مال و دولت سے بھی غنی کر دیا تھا۔ بفحوائے آیہ مبارکہ وَآتَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ۔ ان کی عمر کے آخری سالوں میں تاتاریوں نے قلعہ کے استحکامات کو گرا دیا، تو آپ نے لاکھ دینار اپنے خزانے سے دے کر اہل شہر کی گلو خلاصی کرائی[1]۔

اگرچہ "تذکرہ علماء ہند" میں لکھا ہے کہ جناب شیخ الاسلام کی متعدد تصانیف خصوصاً علم سلوک میں ہیں، لیکن دنیا کے مشہور کتب خانوں میں ان کا ذکر نہیں ملتا۔ صرف ایک اوراد کی کتاب پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں مجھے ملی ہے۔ اس کے دیباچے سے اور بعض کتابوں سے آپ کے چند اقوال آپ کو سناتا ہوں۔

اوراد میں فرماتے ہیں: "راحت و آسایش کا دروازہ اپنے آپ پر بند کرنا چاہیئے، خلقت کی مدح و ذم سے بے نیاز ہو جانا چاہیئے۔ خدا سے خدا کے سوا کچھ نہ مانگنا چاہیئے، گفتگو کم کرو، بے فائدہ علم نہ پڑھو، ایسا نہ ہو کہ حیلہ جو اور رخصت طلب بن جاؤ۔ تقسیم اوقات

---

[1] بعض روایتوں میں اس قصے کی یہی صورت ہے۔ مگر آٹھویں صدی ہجری کا مؤرخ سیفی ہروی اپنی کتاب "تاریخ نامہ ہرات" (طبع کلکتہ ص ۱۵۷) بعد پر لکھتا ہے کہ شیخ الاسلام حاکم ملتان کی طرف سے تاتاریوں سے بات چیت کرنے کے لئے گئے اور یہ طے کیا کہ تاتاریوں کو حاکم شہر لاکھ دینار دیدے تو وہ شہر سے چلے جائیں گے دوسرے دن شیخ الاسلام لاکھ دینار لیکر شہر سے باہر آئے۔ مگر یہ نہیں کہا کہ یہ رقم وہ اپنے خزانے سے لائے۔

اس طرح سے کرو کہ صبح کا وقت بیکار نہ کھویا جائے۔ اللہ ہمیں اور تمہیں غافلوں کی نیند سے بیدار کرے وَلَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْم "

آپ کی وصیتوں میں ہے :۔" بندے پر واجب ہے کہ اللہ کی عبادت صدق اور اخلاص سے کرے۔ وہ اس طرح سے کہ اغیار کو دور کر دے اور عبادات واذکار میں لوگوں اور چیزوں کے خیال کو مٹا دے۔ یہ صرف اسی طرح سے ہو سکتا ہے کہ احوال کو نیک بنائے اور قول وفعل میں نفس کا محاسبہ کرے۔ غیر ضروری قول وفعل سے پرہیز کرے اور ہر قول وفعل سے پہلے اللہ سے التجا کرے اور اس سے مدد مانگے تاکہ اللہ اسے اچھے عمل کی توفیق دے۔"

ایک خط میں ایک مرید کو لکھتے ہیں :" بدن کی سلامتی کم کھانے میں ہے اور روح کی سلامتی لوگوں کو ترک کر دینے میں ہے' اور دین کی سلامتی خیر خلق محمدؐ پر درود بھیجنے میں ہے۔"

شیخ محمد نور بخش نے، جو سلسلۂ نور بخشیہ کے بانی ہیں، نویں صدی ہجری (پندرھویں صدی عیسوی) میں شیخ الاسلام بہاءالدین زکریاؒ کے متعلق جو پاکیزہ خیالات ظاہر کیے ہیں، ان پر ہم اس مقالے کو ختم کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں :۔" وہ (شیخ الاسلام) ایسے مرشد تھے، جن سے اولیاء کے بہت سے طریقے متفرع ہوتے ہیں۔ لوگوں کو کفر سے ایمان کی طرف، گناہ سے طاعت کی طرف، نفسانیت سے روحانیت کی طرف راہنمائی کرنے میں آپ کو بڑا مرتبہ حاصل تھا۔"

(۲)

حضرت بہاءالدین زکریا ملتانی کے علمی اور تبلیغی کارنامے

شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی کے جدِ بزرگوار کمال الدین علی شاہ قریشی مکہ مکرمہ سے خوارزم اور وہاں سے ملتان آئے اور ملتان ہی میں سکونت اختیار کی۔ ان کے صاحبزادے

کا نام شیخ وجیہ الدین محمد تھا۔ شیخ بہاء الدین زکریا انہی کے بیٹے تھے۔ آپ کی ولادت کوٹ کروڑ میں ہوئی، جہاں ان کے نانا مولانا حسام الدین ترمذی سکونت پذیر تھے۔ سنۂ ولادت ۱۱۷۱ء یا باختلافِ روایت ۱۱۷۸ء تھا۔ بارہ برس کے تھے کہ والدِ ماجد کا انتقال ہوا۔ آپ نے قرآن مجید سات قراءت کے ساتھ حفظ کیا۔ اس زمانے میں وسطِ ایشیاء کے ممالک میں فقہ اور حدیث اور ادبِ عربی کا بہت چرچا تھا۔ قاضی خان فرغانی اور مرغینانی صاحب ہدایہ اور زمخشری جیسے نامور فضلاء اسی صدی میں انہی ممالک میں اپنے فیض سے ایک عالم کو مستفید کر رہے تھے۔ سفر میں سو سو طرح کی مشکلات موجود تھیں۔ اس کے باوجود جنابِ شیخ کو لڑکپن ہی میں علم کا شوق کشاں کشاں پہلے خراسان اور پھر ماوراء النہر لے گیا۔ چونکہ قریب ہی کے زمانے میں ان کے جدِّ مکرم نے خوارزم چھوڑا تھا یہ بھی ممکن ہے کہ وہاں ان کے کچھ قرابت دار ابھی باقی ہوں۔ بہرصورت اتنے دُور دست ملکوں میں اتنی چھوٹی سی عمر میں جنابِ شیخ کا طویل علمی سفر طلبِ علم کے ایسے حیرتناک جذبہ پر دلالت کرتا ہے جس کی نظیر بعد کے زمانے میں مشکل ہی سے ملے گی۔

بخارا میں جب وہ تعلیم میں مشغول تھے تو اہلِ بخارا ان کی عفت اور صلاحیت سے متأثر ہو کر انہیں "بہاء الدین فرشتہ" کہا کرتے تھے۔ ماوراء النہر سے آپ حج و زیارت کیلئے حرمین شریفین گئے۔ اور مدینہ منورہ میں پانچ سال تک مقیم رہ کر مولانا کمال الدین محمد یمنی سے جو پچاس سال سے مجاورِ حرم تھے۔ حدیث پڑھی اور وہاں سے ہر سال حج کے لئے بھی جاتے رہے۔ پانچ برس کے بعد حدیث پڑھانے کا اجازت نامہ حاصل کر کے آپ بیت المقدس گئے اور مقاماتِ مقدسہ کی زیارت سے مشرف ہو کر بغداد آئے اور سلطان المشایخ شیخ شہاب الدین عمر سہروردی صاحبِ "عوارف المعارف" کے

مرید ہوئے۔ تھوڑے ہی دنوں میں پیرِ روشن ضمیر نے انہیں خرقۂ خلافت عطا فرمایا اور ملتان میں متوطّن ہونے کا حکم دیا۔

افسوس ہے کہ آپ کے علم و فضل کے ثمرات اوراق میں بہت کم محفوظ رہے۔ آپ کے چند اقوال اور وصایا ہیں جو متفرق کتابوں میں ملتے ہیں اور آپ کی صرف ایک کتاب "کتاب الاوراد" ہم تک پہنچی ہے۔ جس کا ذکر ابھی آتا ہے۔ آپ کے وصایا کے ایک دو نمونے ملاحظہ فرمائیے۔ لکھتے ہیں:۔

"بندے پر واجب ہے کہ اللہ کی عبادت صدق و اخلاص سے کرے۔ بر اس طرح سے کہ عبادات و اذکار میں اغیار کو دور اور اشخاص کو محو کر دے۔ اس کی کوئی سبیل سوائے اس کے نہیں ہے کہ احوال کو درست کرے اور اقوال و افعال میں نفس کا محاسبہ کرے۔ سوائے ضرورت کے قول و فعل سے اجتناب کرے اور ہر قول و فعل سے پہلے اللہ سے التجا کرے اور اعانت طلب کرے کہ اللہ عزّ و جلّ اس کو بہترین عمل کی توفیق دے۔"

ایک مرید کو ہدایت فرماتے ہیں:۔

"ذکر یعنی اللہ کی یاد کی مداومت اپنے اوپر لازم کرو۔ ذکر سے طالب محبت تک پہنچتا ہے اور محبت آگ ہے جو ہر میل کو جلا دیتی ہے اور جب محبت صحیح اور درست ہو جائے تو ذکر کرنے والے کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ اسے ذکر کے ساتھ مشاہدۂ مذکور (یعنی جس کا ذکر کیا جائے) وہ بھی نصیب ہو جاتا ہے۔ اور یہی وہ ذکرِ کثیر ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے نجات کا وعدہ فرمایا ہے۔ یہ فرما کر: وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (اور اللہ کا ذکر کثرت سے کرو تاکہ تمہاری نجات ہو)"

علم ادعیہ اور اوراد میں آپ کی ایک گراں پایہ تصنیف ملتی ہے۔ اس علم کا شمار فروعِ حدیث میں ہے۔ اور اس میں دعاؤں اور اوراد کے کلمات کا ضبط اور اوراد کی روایت کی تصحیح وغیرہ امور سے بحث ہوتی ہے۔ متعدد ائمہ اسلام نے اوراد جمع کئے چنانچہ شیخ بہاء الدین زکریا کے پیر شیخ شہاب الدین سہروردی نے بھی ایک مجموعہ اوراد کا مرتب کیا جس میں مشائخ کبار اور جمہور سالکانِ طریقت کی جمع کردہ دعائیں درج ہیں۔

اپنے پیر کے طریقہ پر شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا نے بھی اوراد جمع کئے، جو صدیوں تک صلحاء کے معمولات میں شامل رہے، ان کے متعدد اقتباسات پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہیں، اصل اوراد کے کئی نسخے رامپور لائبریری میں اور ایک نفیس، قدیم الخط نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ہے۔ اسی کتاب خانے میں "کتاب الاوراد" کے بعض اجزاء کا حال المتن فارسی ترجمہ بھی ہے جو غالباً آٹھویں صدی ہجری میں ۷۹۱ھ (۱۳۸۸ء) کے قریب لکھا گیا۔ اصل کا مترجم نے ارادۃً شیریں اور دلآویز الفاظ ـــ اور نیاز انگیز عبارات میں ترجمہ کیا ہے۔ تاکہ نماز اور اوراد پڑھنے والا جو عبارتیں پڑھے، انہیں سمجھے اور ان کے معنی اس کے دل میں جگہ لیں۔

اسی طرح "کتاب الاوراد" کی نہایت نفیس اور معتبر فارسی شرح "کنز العباد" کے نام سے علی بن احمد الغوری نے دو ضخیم جلدوں میں نہایت فاضلانہ طریق سے لکھی۔

"کتاب الاوراد" میں مختلف نمازوں اور ان دعاؤں کا ذکر کیا ہے جو مختلف تقریبوں میں پڑھی جاتی ہیں۔ یہ تقریبیں سونے، جاگنے، کھانے، پینے، آنے جانے، غرض زندگی کے ہر پہلو سے تعلق رکھتی ہیں۔

فقیر اللہ نے "راگ درپن" میں جناب شیخ الاسلام کو ماہرینِ موسیقی میں شمار کیا

ہے، اور لکھا ہے کہ امیر خسروؒ کی طرح انہوں نے بھی چند راگ اور راگنیاں ایجاد کیں مثلاً ملتانی دھناسری انہی کی ایجاد ہے، جس میں دھناسری اور مالسری کو مخلوط کیا گیا ہے' آپ نے چھند کی طرز پر کئی نغمے اختراع کئے جن میں خدائے واحد کی ستائش اور داستانِ عشق اور بندگی کے طریق پر عجز وانکسار کی کیفیت بیان کی۔

اپنے پیر کے ارشاد کے مطابق شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا نے ملتان کو تعلیم وارشاد کا مرکز بنایا اور خلقِ خدا کو ہدایت کا پیغام پہنچایا اور اپنی عمر کے ساٹھ ستر یا اس سے بھی زیادہ سال آپ ان اشغال میں منہمک رہے۔

دارا شکوہ "سفینۃ الاولیاء" میں لکھتا ہے کہ "بہت سی خلقت نے ان کے ملتان میں تشریف فرما ہونے کی برکت سے ہدایت پائی اور آج کل بھی اس ملک میں سب ان کے مرید ہیں" آپ کے فیضان کا نور دُور دُور تک پہنچا۔ وزیرستان کے مرکز کانی گرام میں بھی آپ کے مرید تھے۔ ایک طرف تو اس دُور دست علاقے تک آپ کی دعوت و تبلیغ پہنچی، دوسری طرف "تحفۃ الکرام" (۳ : ۱۳۶) میں ہے کہ وہ سہوان تشریف لائے۔ کراچی سے چند میل کے فاصلے پر منگھو پیر کے پاس ایک پہاڑی ہے، جسے کتابوں میں "طوق منگ" لکھتے ہیں۔ اس کی چوٹی پر نشانات موجود ہیں۔ مقامی طور پر مشہور ہے کہ شیخ بہاء الدین اور ان کے تین رفیق یہاں آکر بیٹھے تھے۔ یعنی آپ کی تبلیغی مساعی کی جنوبی حد یہ تھی۔ غرض کم وبیش اس سارے علاقے میں جو اَب "مغربی پاکستان" کہلاتا ہے، شیخ بہاء الدین نے تبلیغ کے فرائض انجام دیئے۔ غوریوں کے زمانے میں بہت سے غیر مسلم راجپوت قبیلے ہندوستان کے صوبوں سے ہجرت کرکے پنجاب میں آبسے۔ ان میں کھرلوں، ٹوانوں، گھیبوں اور پنوار سیالوں کے اجداد بھی شامل تھے۔ شیخ بہاء الدین زکریا اور شیخ فرید الدین گنج شکر رحمہا اللہ کی

تبلیغی کوششوں اور ان کی بزرگی اور نفوس قدسیہ کی تاثیر سے یہ غیر مسلم قبائل مشرف باسلام ہوئے۔ بعض اقوام میں اب تک آپ کے فیوض روحانی کی یاد باقی ہے۔ ضلع جہلم کی للّا قوم کے لوگ برابر آپ کی خانقاہ پر زیارت کے لئے آتے ہیں۔ گڑگانویں کے میراثی آپ کو اپنا پیر مانتے ہیں۔ شاہ پور اور ملتان کے چاچڑ جو جاٹ ہیں آپ کی اولاد کے سوا کسی دوسرے کے مرید نہیں ہوتے۔ ملتان گزیٹیر (م ۳۳۹۶) میں ہے کہ آپ کی ایک کرامت کی وجہ سے چناب اور سندھ کے ملاّح مشکل پڑنے پر آپ کو پکارتے ہیں۔

ملتان اور سندھ میں چوتھی صدی ہجری کے آخر میں قرمطیوں کا زور تھا۔ محمود غزنوی نے ملتان فتح کر کے اپنی سلطنت میں ملا لیا اور غالباً اسی کے ہاتھوں سندھ کے قرمطی حکّام کا خاتمہ ہوا۔ انہوں نے پھر سر اٹھایا تو محمد غوری نے ۵۷۱ھ (۱۱۷۵ء) میں پھر سندھ اور ملتان ان سے چھینا۔ مگر حکومت چھن جانے کے باوجود لوگوں کے عقائد کی تصحیح کا کام ابھی باقی تھا۔ یہ وہ کام تھا جو جناب شیخ الاسلام اور شیخ فرید الدین جیسے بزرگوں کے ہاتھوں انجام پایا۔

جن لوگوں کی آپ نے تربیت کی ان میں بہت سے نامور لوگ شامل تھے مثلاً آپ کے فرزند بزرگ شیخ صدر الدین، سیّد جلال بخاری، شیخ فخر الدین عراقی ہمدانی شاعر مشہور، امیر حسینی صاحب "نزہتہ الارواح" وغیرہ وغیرہ۔ ان لوگوں نے اپنے پیر کی تعریف میں جو کچھ لکھا ہے۔ اس سے جناب شیخ کی عظمت دل پر نقش ہو جاتی ہے۔

آپ کی تبلیغی مساعی کی شہرت بیرونِ ہند تک پہنچی۔ چنانچہ نویں صدی ہجری میں شیخ محمد نور بخش جو "نور بخشیہ" فرقے کے سر سلسلہ ہیں لکھتے ہیں: بہاء الدین زکریا ملتانی قدس سرہٗ بلادِ ہند میں رئیس الاولیاء تھے۔ علوم ظاہرہ کے عالم اور مکاشفات و مشاہدات میں صاحب احوال و مقامات۔ وہ ایسے مرشد تھے جن سے بہت سے اولیاء کے سلسلے

چلے۔ کفر سے ایمان، گناہ سے طاعت، نفسانیت سے روحانیت کی طرف لوگوں کی رہنمائی کرنے اور لوگوں کو ہدایت دینے میں آپ کی شان بہت بلند تھی"۔

حضرت نظام الدین اولیاء اور اُن کے ملفوظات موسوم بہ فوائد الفواد

ہندوستان کے مشہور ولی اللہ سلطان المشایخ نظام اولیاء قدس سرہٗ کا نام نامی محمد اور ان کے والد کا اسم گرامی احمد ہے۔ آپ کے دادا خواجہ علی اور آپ کے نانا خواجہ عرب دونوں بخارا سے غزنی آئے، پھر آگے روانہ ہوئے اور لاہور پہنچے۔ ایک مدت تک بود و باش رکھی۔ آخر یہاں سے روانہ ہو کر بداؤں پہنچے۔ بداؤں جو روہیل کھنڈ میں دریائے سوٹھ کے بائیں کنارے پر واقع ہے۔ اس زمانے میں بہت آباد اور پُر رونق مقام تھا۔ اور دہلی کے لئے سرحدی شہر کا کام دیتا تھا۔ چنانچہ پُرانی دہلی کے ایک دروازے کا نام دروازۂ بداؤں تھا۔ (نزہتہ الخواطر) قلعہ بداؤں کے موجودہ کھنڈر اس کی عظمت اور اس کے استحکام کا پتہ دے رہے ہیں۔ ۱۱۹۶ء میں سلطان محمد غوری کے جرنیل قطب الدین ایبک نے اسے فتح کیا اور اپنے غلام ملک شمس الدین التمش کو امیر بداؤں مقرر کیا۔ التمش نے یہاں ۱۲۲۳ء میں ایک خوبصورت اور وسیع مسجد تعمیر کرائی، جو اب بھی موجود ہے۔ اس مقام کی اہمیت کا مزید ثبوت درکار ہو تو وہ اس سے ملتا ہے کہ دہلی کے دو بادشاہ التمش اور اس کا بیٹا رکن الدین فیروز شاہ دونوں تخت نشینی سے پہلے بداؤں کے گورنر رہ چکے تھے (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا بذیل بداؤں)۔

سلطان المشایخ کے دادا اور نانا کو بداؤں کے شہر کی کشش وہاں لے آئی کہ وہاں

متعدد بزرگ کامل بھی اس زمانے میں جمع تھے۔ اور "سیر الاولیاء" میں ہے کہ قبتہ الاسلام اس وقت بداؤں تھا۔ غرض ان نوواردوں نے بھی ۶۳۶ھ/ ۱۲۳۸ء میں وہیں سکونت اختیار کر لی۔ اسی شہر میں نظام الدین محمد پیدا ہوئے۔ دہلی کے تخت پر اُس وقت سلطانہ رضیہ متمکن تھی۔ شیخ کی ولادت کے جلد بعد ان کے والد شیخ احمد بخاری کا انتقال ہو گیا۔ مادر مہربان نے آپ کی پرورش کی۔ چار پانچ سال کی عمر ہو گی جب مکتب میں داخل ہوئے۔ کلام اللہ ختم کر کے کتاب خوانی شروع کی۔ فقہ، اصول عربیہ کی تعلیم شیخ علاء الدین اصولی بداؤنی سے پائی جنہیں "اخبار الاخیار" میں "بغایت بزرگ" و "کامل" لکھا ہے۔ ۱۶ برس کی عمر میں مزید تعلیم کے لئے دہلی روانہ ہوئے "(سیر الاولیاء)" شیخ شمس الدین خوارزمی سے جو بعد میں مستوفی ممالک ہند بنے، اور اپنے زمانے میں فضل و علم میں ممتاز تھے۔ مقامات حریری کے چالیس مقالے یاد کئے۔ شیخ کمال الدین محمد زاہد مارکیگی سے صغانی کی "مشارق الانوار" حفظ کی۔ یہ بزرگ صرف ایک واسطہ سے "مشارق" کی روایت صغانی سے کرتے تھے "(اخبار)" یوں تو لڑکپن ہی میں جب آپ نے شیخ فرید الدین گنج شکرؒ کی مجالس کے سوز و وجد کا ذکر سنا، تو اجودھن میں حاضر ہونے کا شوق دامنگیر ہوا، مگر موانع پیش آتے رہے۔ دہلی پہنچنے کے بعد تحصیل کے اثناء میں شوق نے ایسا زور پکڑا کہ ضبط کی طاقت نہ رہی اور اجودھن پہنچے۔ اس وقت آپ کی عمر بیس سال تھی۔ مرید ہوئے اور پیر روشن ضمیر کی خدمت میں عرض کی کہ تحصیل علم کا شوق ہے۔ اگر اجازت ہو تو تکمیل کروں ورنہ جو ارشاد ہو بجا لاؤں۔ آپ نے فرمایا علم سے باز رکھنا میرا شیوہ نہیں۔ اس لئے کہ سالک کو ظاہری علم سے چارہ نہیں۔ لیکن اس کے بعد جو صورت غالب آئے وہ اختیار کر لینا۔ چنانچہ حضرت نے ظاہری اور باطنی دونوں قسم کے علم حاصل کئے۔

شیخ فرید الدین سے قرآن مجید کے چھ سیپارے تجوید سے پڑھے، شیخ شہاب الدین سہروردی کی "عوارف المعارف" کے چھ باب، اور ابوشکور الکشی الحنفی السالمی کی "کتاب التمہید" کی چند فصلیں اور کچھ اور کتابیں بھی جناب شیخ الاسلام سے پڑھیں۔ اس کے بعد خرقۂ خلافت ملا اور دوسروں کی تکمیل کی اجازت بھی حاصل ہوئی۔ چنانچہ ۶۶۹ھ/ ۱۲۷۰ء میں سلطان بلبن کے عہد میں آپ دوبارہ دہلی تشریف لائے۔ جہاں پیر و مرشد نے قیام کا حکم دیا تھا۔ پہلے آپ دہلی کے مختلف محلوں میں رہے مگر بالآخر اشارتِ غیبی پاکر غیاث پور میں قیام فرمایا، جہاں اب آپ کی خانقاہ ہے۔ قرآن مجید حفظ کیا اور مجاہدہ اور صیام و قیام اور ذکر و فکر میں مشغول رہے اور خلقت کو اللہ کی طرف دعوت دی اور ترکِ دنیا کا طریق اختیار کیا۔ آپ کی تلقین سے سعادت یافتہ اہلِ تحقیق خلفاء کی ایک ایسی جماعت تیار ہوئی جنہوں نے ملک کے طول و عرض میں ارشاد و ہدایت کا نور پھیلایا۔ کہتے ہیں کہ آپ نے بڑے بڑے شہروں میں سات خلیفے روانہ کئے۔ دہلی اور نواحِ دہلی میں رُشد و ہدایت کے اعتبار سے اس دورِ سعادت میں جو کیفیت تھی، اس کا حال آپ کے ایک ارادتمند معاصر ضیاء الدین برنی نے اپنی تاریخ میں مفصل بیان کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ شیخ کے وجود ہمایوں اور ان کے انفاس بابرکت اور مستجاب دُعاؤں کی تاثیر سے مسلمانانِ دیار کی دُنیاوی اور دینی اور روحانی اصلاح کس حد تک ہوئی تھی۔ برنی لکھتے ہیں کہ :-

"سلطان علاء الدین خلجی (م ۷۱۵ھ/ ۱۳۱۵ء) کے عہد کے آخری زمانے میں شیخ الاسلام نظام الدین نے بیعت عام کا دروازہ کھولا ہوا تھا۔ وہ گناہ گاروں کو خرقہ دیتے اور توبہ کراتے تھے۔ انہیں مریدی میں قبول کرتے۔ خاص و عام، غنی اور مفلس، ملک اور فقیر، متعلم اور ناخواندہ، شریف اور بازاری، شہری اور دیہاتی، غازی اور مجاہد، آزاد

اور غلام، چونکہ یہ سب اپنے آپ کو جناب شیخ کا مرید سمجھتے تھے اس لئے بہت سے نالائق کاموں سے باز رہتے تھے۔ اگر کبھی کسی کوئی لغزش سرزد ہو جاتی تو وہ پھر سے بیعت کی تجدید کرتا۔ عام خلقت کچھ تقلید سے کچھ عقیدت سے، طاعت وعبادت کی طرف راغب ہو گئی تھی۔ سب لوگ نمازیں پڑھنے لگ گئے تھے۔ مخیر لوگوں نے دہلی سے غیاث پور تک متعدد جگہوں پر چبوترے بنا کر ان پر چھپر ڈال دیئے تھے اور کنوئیں کھدوا دیئے تھے۔ ان چبوتروں پر وضو اور نماز کا سامان رکھوا دیا تھا۔ اور ہر چبوترے میں ایک حافظ اور ایک خادم مقرر کر دیا تھا، تاکہ شیخ کی خدمت میں آنے جانے والوں کو راستے میں وضو کرنے اور وقت پر نماز ادا کرنے میں دقت نہ ہو۔ چبوتروں پر نمازیوں کا ہجوم رہتا تھا۔ لوگوں کے درمیان اغلب گفتگو نماز، روزہ، نوافل، کم خوری وغیرہ وغیرہ کی بابت ہوتی تھی۔ اور مخیر لوگوں میں حفظ قرآن کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ سلطانی امیر اور سلاحدار اور منشی اور لشکری اور سلطانی غلام جو شیخ کے مرید ہو چکے تھے، سلطانی محل میں نماز اشراق وچاشت پڑھتے تھے۔ اور ایام بیض اور عشرۂ ذی الحجہ میں روزے رکھتے تھے۔ کوئی محلہ ایسا نہ تھا جس میں ہر بیس تیس دن کے بعد اہل صلاح جمع ہو کر سماع صوفیانہ نہ کرتے ہوں اور اس میں گریہ ورقت نہ ہو۔ روزوں میں شیخ کے کئی مرید مسجدوں اور گھروں میں، تراویح میں قرآن مجید ختم کرتے اور بہت سے برگزیدہ مرید رات رات بھر جاگ کر عبادت کرتے۔ ملک کے اکثر مسلمان عبادت گذاری، تصوف، اور ترک وتجرید کی طرف مائل اور شیخ کی مریدی کی طرف راغب ہو گئے تھے۔ سلطان علاء الدین اور اس کا گھرانا شیخ کے مریدوں میں داخل ہو گیا تھا۔ خواص وعام نیکی اور نیکوکاری کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ شراب اور جوئے اور فحش اور فسق وفجور کا نام تک لوگوں کی زبان پر نہ آتا تھا۔

اور کبیرہ گناہوں کو وہ کفر کے برابر جانتے تھے۔ ایک دوسرے کی شرم سے مسلمان سود خواری اور غلّہ اندوزی کا ارتکاب کھلے بندوں نہ کر سکتے تھے۔ اہلِ بازار خائف ہو کر، جھوٹ کہنے، مال کم کر دینے اور فریب کرنے، کھوٹ اور ملاوٹ ملانے اور ناوانوں کو جُل دینے سے بالکل رُک گئے تھے۔ طالب علموں اور اشراف و اکابر کو سلوک اللہ طریقت کی کتابوں کے مطالعہ کا شوق دامنگیر ہو گیا تھا۔ "قوت القلوب مکی"، "احیار العلوم" اور "ترجمہ احیار"، "عوارف المعارف"، "کشف المحجوب"، "شرح تعرف"، "رسالہ قشیری"، "مرصاد العباد"، "فوائد الفواد" وغیرہ کثرت سے بکتی تھیں۔

"فوائد الفواد" جسے برنی نے اُس زمانے کی بسیار مطلوب کتابوں میں شمار کیا ہے۔ اب کچھ حال اس کے مصنف کا اور اس کا سُنیئے۔

امیر حسن بن العلاء اصلاً سیستانی تھے۔ اس لیے سیستانی یا سجزی کہلائے جو سیستانی کی عربی صورت ہے۔ سجزی کو کاتبوں نے بگاڑ کر سنجری بنا دیا۔ "فوائد الفواد" کے دیباچہ دوم میں وہ خود فرماتے ہیں ؎

حسن علا سجزی یکی از امیدواران ⁂ صُحُفی کہ جمع کردہ تحفیست پیش یاران

امیر حسن سلطان غیاث الدین بلبن اور اس کے لڑکے کے عہد میں امرار میں داخل تھے۔ بڑھاپے میں سلطان المشائخ کے مرید ہوئے اور ان کے ملفوظات جمع کیے۔ اور کتاب کا نام "فوائد الفواد" رکھا۔ اس یقین سے کہ دردمندوں کے دل کو اس سے فائدہ پہنچے گا۔ امیر حسن سلطان المشائخ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور فوائد جو ان کی زبانی سنتے انہیں بعد میں قلمبند کر لیتے۔ کبھی عین انہی کے لفظوں میں اور کبھی اپنے لفظوں میں، امیر حسن نے حضرت شیخ کو کچھ حصہ فوائد کا دکھایا بھی جسے آپ نے پسند فرمایا اور بعض بیاض خود پُر کیے۔ دیباچہ

بھی خود آپ ہی نے لکھا۔ جس مدت سے یہ فوائد متعلق ہیں وہ ۳/ شعبان ۷۰۷ھ/ جنوری ۱۳۰۸ء سے ۲۰/ شعبان ۷۲۲ھ/ ستمبر ۱۳۲۲ء تک ممتد تھی یعنی تقریباً پندرہ برس۔ سلطان المشایخ کے وصال کی تاریخ ۱۸/ ربیع الآخر ۷۲۵ھ/ ۵/ اپریل ۱۳۲۴ء ہے۔ پس گو فوائد الفواد" کے زمانے کے بعد جناب نظام الدین ڈھائی برس سے کچھ اوپر زندہ رہے تاہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ فوائد ان کی حیات طیّبہ کے آخری دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں وعظ و نصیحت کی باتیں ہیں اور ترغیب طاعت اور حکایات مشایخ اور ان کے احوال، بعض لغوی فوائد، تاریخی باتیں، غرض ہر قسم کے روح افزا کلمات، جن سے ان کی بلند شخصیت کے مختلف پہلو نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں۔" فوائد الفواد" اپنے موضوع پر ایک گراں قدر کتاب ہے۔ سلطان المشایخ نے خاندان غلاماں کے اکثر اور خلجیوں کے تمام بادشاہوں اور تغلقوں کا ابتدائی دَور دیکھا تھا۔ ان کے ملفوظات سے ان تمام ادوار کی تاریخ کے بعض تاریک پہلوؤں پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔

(۲)

حضرت نظام الدین کی یاد میں!

مرشدِ طریقت

سلطان المشایخ نظام الدین اولیاء قدس سرّہٗ کا نام و نسب محمد بن احمد بن علی ہے جنابِ شیخ عالم کبیر اور صاحب مقامات عالیہ ہیں۔ اور مشہور اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ بزرگوں کا وطن بخارا تھا۔ آپ کے دادا اور نانا ترکِ وطن کر کے غزنی کے راستے سے لاہور پہنچے۔ ایک مدت لاہور میں قیام کر کے قبۃ الاسلام بداؤں میں جا بسے۔ جو اُس

زمانے میں ایک اہم اور پُر رونق شہر تھا۔ اور دارالسلطنت دہلی کے لئے مضبوط سرحدی شہر کا کام دیتا تھا۔ بدایوں میں آپ ۶۳۶ھ / ۱۲۳۸ء یا ۱۲۳۹ء میں پیدا ہوئے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ملک میں خاندان غلاماں کی حکومت اور دہلی کے تخت پر سلطانہ رضیہ متمکن تھی۔ آپ کی ولادت کے جلد بعد آپ کے والد بزرگوار شیخ احمد بخاری کا انتقال ہُوا، اور آپ کی پرورش آپ کی مادرِ مہربان نے کی۔ بچپن ہی میں آپ مکتب میں داخل ہوئے، اور نحو اور زبان عربی فقہ و اصول کی تعلیم پائی۔ ۱۵ سال کے تھے کہ مزید تعلیم کے لیے دہلی پہنچے اور وہاں کے اساتذہ سے کتبِ درسیہ پڑھیں "مقامات حریری" کے ۴۰ مقامے حفظ کیے۔ صغانی کی "مشارق الانوار" نہ صرف پڑھی بلکہ حفظ بھی کی۔ پھر اجودھن پہنچے اور حضرت شیخ فریدالدین مسعود اجودھنی گنج شکر سے قرآن مجید "عوارف المعارف" اور "کتاب التمہید" پڑھی۔ جناب شیخ نے خرقہ پہنایا تو اس کے بعد بھی ایک مدت تک ان کی خدمت میں حاضر رہے۔ آخر پیر کامل نے اجازت بخشی کہ دہلی میں جاکر اقامت اختیار کریں۔ دہلی کے مختلف محلوں میں عزلت کی تلاش میں گھومے تاآنکہ غیاث پور (موجودہ نظام الدین) میں مقیم ہوئے اور اپنے شیخ بزرگوار کے ارشاد کے مطابق قرآن کریم حفظ کیا، اور مشائخ چشتیہ کے دستور کے مطابق طریقِ مجاہدہ اختیار کیا۔ روزے رکھے، چلّے کھینچے اور ان میں قیام اور ذکر اور فکر میں مشغول رہے۔ علائق سے منقطع ہو کر دل و جان سے اللہ پاک کی طرف رجوع کیا اور پرہیز گاری، پاکدامنی، قناعت، توکّل، ایثار اور اخلاقی خوبیوں میں کمال حاصل کیا۔ انہی کمالات سے وہ مرتبہ پایا کہ خلقِ خدا آپ کی طرف جوق در جوق اُمڈ کر آئی اور آپ نے اللہ کی طرف دعوت دی اور دلوں میں طریقِ عبادت پر چلنے کی رغبت پیدا کی۔ آپ کی تلقین سے سعادتمندوں

کی ایسی جماعت تیار ہوئی، جنہوں نے سارے ہند، و پاکستان میں ہدایت کا نور پھیلایا اور آپ کے بعد بھی اس سلسلہ کو جاری رکھا۔ یہاں تک کہ اس ملک کے تمام اطراف میں آپ کا طریقہ پھیلا اور خیر و برکت کا موجب بنا۔

اس امام مجاہد، صاحب زہد، صاحب ترک و تجرید نے علائق دینوی سے لپنے آپ کو اس حد تک منقطع کیا کہ نہ کوئی گھر بنایا، نہ کوئی سرمایہ جمع کیا۔ نہ کسی قسم کا ذخیرہ اکٹھا کیا۔ اور اپنا تمام وقت عبادات، دعوت الی الحق اور کسب فضائل میں صرف کیا۔ سلطان علاء الدین خلجی کے عہدِ حکومت کے آخری زمانے میں اپنے گرد و نواح کی اصلاح میں آپ نے جو کوششیں کیں اور جو نتائج حسنہ اس سے حاصل ہوئے، آپ کے مرید اور مؤرخ معاصر ضیاء الدین برنی نے اپنی تاریخ میں ان کی پوری تصویر کھینچی ہے :-

"شیخ الاسلام نظام الدین نے بیعتِ عام کا دروازہ کھولا۔ وہ گناہ گاروں کو توبہ کراتے ۔ خاص و عام، غنی و مفلس، عالم و ناخواندہ، شریف اور بازاری، شہری اور دیہاتی، آزاد و غلام چونکہ سب کے سب جناب شیخ سے ارادت رکھتے تھے۔ اس لئے بہت سے نالائق کاموں سے باز رہتے تھے۔ اگر کبھی کسی سے لغزش سرزد ہو جاتی تھی، تو وہ پھر سے بیعت کی تجدید کرتا تھا۔ عام خلقت کچھ تقلید سے کچھ عقیدت سے طاعت و عبادت کی طرف راغب ہو گئی تھی۔ سب لوگ نماز پڑھنے لگ گئے تھے۔ دہلی سے غیاث پور تک لوگوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ اس لئے مخیر لوگوں نے کئی جگہوں میں چبوترے بنا کر ان پر چھپر ڈال دیئے تھے اور کنوئیں کھدوا دیئے تھے اور ہر چبوترے پر وضو اور نماز کا سامان مہیا کر دیا تھا اور ہر چبوترے پر ایک حافظ اور ایک خادم مقرر کر دیا تھا۔

تاکہ آنے جانے والوں کو راستے میں وقت پر نماز ادا کرنے میں دقّت نہ ہو۔ سلطان افسر اور سلاحدار اور منشی اور لشکری اور سلطانی غلام جو شیخ کے مرید ہو چکے تھے۔ سلطانی محل میں نمازِ چاشت و اشراق پڑھتے تھے اور ایّامِ متبرکہ میں روزے رکھتے تھے۔ محلوں میں ہر بیس تیس دن کے بعد اہلِ سلاح جمع ہو کر سلاحِ صوفیانہ کرتے تھے اور گریہ و رقّت ہوتی تھی۔ خاص و عام نیکی اور نیکو کاری کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ شراب اور جوئے اور فحش اور فسق و فجور کا نام تک لوگوں کی زبان پر نہ آتا تھا۔ کبیرہ گناہوں کو وہ کفر کے برابر سمجھتے تھے۔ مسلمان سود خواری اور غلّہ اندوزی کا ارتکاب کھلے بندوں نہ کر سکتے تھے اہلِ بازار جھوٹ کہنے، مال کم دینے، فریب کرنے، کھوٹ اور ملاوٹ ملانے سے رُک گئے تھے۔ طالب علموں اور اشراف و اکابر کو سلوک اور طریقت کی کتابوں کے مطالعے کا شوق دامنگیر ہو گیا تھا۔ "قوت القلوب" کی "احیاء العلوم" غزالی، اور ترجمہ "احیاء العلوم"، "عوارف المعارف"، اور "کشف المحجوب"، "شرح تعرف"، "رسالہ قشیری"، "مرصاد العباد"، "فوائد الفواد"، وغیرہ کثرت سے نقل ہوتی اور بکتی تھیں۔

کہتے ہیں کہ سلطان علاء الدین کے دل میں خلش تھی کہ شاید آپ کو سلطنت اور حکمرانی کرنے کا خیال ہے۔ مگر آپ نے اسے یقین دلایا کہ بوریا نشین درویش کو بادشاہی اور اس کے کاروبار سے کچھ تعلق نہیں۔ اس پر بادشاہ نے ہر چند آستانہ بوسی کے لئے التماس کی، آپ نے قبول نہ فرمایا اور عذر کیا، اور کہا کہ درویش کے اُنس کو وحشت سے نہ بدلنا چاہیئے، اور اس کی دُعا، اور سلام کو جو وہ بتوسط پیغام بھیجتا ہے کافی سمجھنا چاہیئے۔

آپ کے وصال کی تاریخ ۱۸۔ ربیع الثانی ۷۲۵ھ (۱۵ اپریل ۱۳۲۵ء) تھی، اور

عمر ۸۹ سال۔ بعض روایتوں میں آپ کی عمر ۹۱ سال کی بتائی گئی ہے۔ اس حساب سے آپ نے خاندانِ غلاماں کے اکثر، خلجیوں کے تمام، اور تغلقوں کے پہلے دو بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔

بزرگانِ چشتیہ کے دستور کے مطابق حضرت سلطان المشایخ نے کوئی تصنیف یادگار نہ چھوڑی۔ مگر ان کے متعدد مریدوں نے ان کے ملفوظات جمع کیے۔ جن میں سب سے مشہور وہ ہیں، جو "فوائد الفواد" کے نام سے شیخ حسن بن العلا سجزی نے جمع کیے۔ اس کتاب میں حضرت سلطان المشایخ کی زندگی کے آخری دَور کی مجالس کی روداد دی ہے۔ جس مدّت میں یہ مجالس منعقد ہوئیں، وہ پندرہ سال کی مدّت ہے۔ آخری مجلس ۱۰ شعبان ۷۲۲ھ کو منعقد ہوئی۔ حاضرینِ مجالس علوم فقہ، حدیث، تفسیر، تصوّف وغیرہ کے متعلق مسائل پوچھتے ہیں۔ شیخ ان کا جواب دیتے ہیں۔ حکایاتِ مشایخ وصوفیائے کرام خصوصاً اپنے پیرومرشد شیخ فریدالدین شکر گنج کے چشم دید حالات رقّت آمیز لہجے میں بیان کرتے ہیں۔ سامعین کو پند، ترغیبِ طاعت اور وعظ ونصیحت کی دولت سے مالامال کرتے ہیں اور طریقِ رُشد وہدایت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ بعض تاریخی باتوں کا بھی ذکر آجاتا ہے۔ غرض ہر باب کے فوائد ان مبارک مجلسوں میں مذکور ہوئے ہیں۔ اب ان میں سے دو چار کلمے آپ بھی سُن لیں۔ جناب سجزی لکھتے ہیں:

" آپ نے فرمایا، شیخ (فریدالدین) کی (آخری) بیماری نے غلبہ پالیا۔ روزوں کا مہینہ آگیا۔ ناچار آپ نے روزے نہ رکھے۔ ایک دن خربوزے لائے گئے اور انہیں تراش تراش کر شیخ کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ تناول فرماتے رہے۔ اس درمیان میں آپ نے ایک ٹکڑا مجھے بھی دیا۔ میں نے چاہا کہ کھالوں، دل میں تھا کہ دو مہینے مسلسل اُس

روزے کا کفارہ دوں گا۔ یہ دولت کہ (شیخ) اپنے ہاتھ سے چیز مجھے عنایت کریں، اب کب میسّر ہوگی۔ قریب تھا کہ کھالوں، فرمایا، یہ نہ کرو۔ نہ کرو، مجھے تو شریعت کی طرف سے اجازت ہے، تمہیں نہیں کھانا چاہیئے۔"

▪ لوگوں نے شیخ (فریدالدین) کی عمر پوچھی۔ فرمایا: ۹۰ سال ——— اس دن اس باب میں گفتگو فرمائی۔ اتنی لذّت حاصل ہوئی کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ نمازِ عشاء کے بعد اپنا خاص مصلّٰی بندہ کو بخشا۔ والحمد للہ رب العالمین" (فوائد ص ۶۱)

ایک اور مجلس کی نسبت لکھتے ہیں:۔

"دُعا کی بات چلی۔ فرمایا: بندے کو چاہیئے، دُعا کے وقت کسی گناہ کا جو اس سے سرزد ہوا، دل میں دھیان نہ لائے اور نہ کسی طاعت کا خیال کرے۔ اس لیئے کہ طاعت کو خیال میں لانا غرور میں داخل ہے۔ اور اگر گناہ کو دھیان میں لائے گا تو قبولیتِ دُعا کے یقین میں سستی پیدا ہوگی۔ پس دُعا کے وقت خاص نظر اللہ کی رحمت پر رکھنی چاہیئے۔ اور یقین رکھنا چاہیئے کہ دُعا البتہ قبول ہوگی۔" (فوائد ص ۷)

چند مجالس میں لاہور کا ذکر بھی آیا ہے۔ جسے اس زمانے میں "لہاور" کہتے تھے۔ ایک دفعہ ذوق و شوق اور سالکوں کے اشتیاق کے غلبے کا ذکر ہو رہا تھا تو آپ نے لہاور کے ایک دانشمند واعظ کا ذکر کیا، جو بہت دل نشین وعظ کہا کرتا تھا۔ وہ قاضیٔ لہاور کے پاس آیا۔ اور کہا، زیارتِ کعبہ کی آرزو ہے۔ آپ اجازت دیں تو جاؤں! قاضی نے کہا: کہاں جایئے گا" آپ کی باتوں اور پند و نصائح سے خلقِ خدا کو نفع پہنچتا ہے۔ وہ دانشمند جانے سے رُک گیا ——— اگلے سال پھر قاضی کے پاس آیا، اور پھر اجازت طلب کی، قاضی نے کچھ دیا، اور کہا "کہاں جایئے گا"! اس نے پھر ارادہ ملتوی

کر دیا۔ تیسرے سال وہ پھر آیا، اور کہا: "اشتیاقِ کعبہ بہت غالب ہے، اجازت ہو تو جاؤں" قاضی نے کہا: "خواجہ! اگر شوقِ کعبہ واقعی غالب ہوتا تو آپ نہ اجازت مانگتے اور نہ مشورہ طلب کرتے۔" اِس پر شیخ الاسلام نے فرمایا: عشق میں مشورہ بیکار نہیں ہوتا۔" (فوائد صہ ۲۵۶)

حضرت خواجہ محمد سلیمان تونسوی ؒ

ابو الفضل نے "آئینِ اکبری" میں لکھا ہے کہ ہندوستان میں صوفیہ کے ۱۴ خانوادے شمار میں آتے ہیں۔ ان خانوادوں کی فہرست میں آخری خانوادہ حضرات چشت اہلِ بہشت کا ہے۔ اس خانوادے میں سے حضرت خواجہ معین الدین حسن ؒ ۵۸۹ھ (۱۱۹۳ء) میں دہلی پہنچے ـــ اسی سال سلطان معزّ الدین سام نے دہلی فتح کر کے ایک پائدار اسلامی حکومت کی بنیاد ہندوستان میں رکھی۔ خواجہ غریب نوازؒ عزلت گزینی کے خیال سے اجمیر میں قیام فرما ہوئے۔ اور ہدایت کا چراغ اس سرزمین میں روشن کیا۔ اور ان کے دم گیرا سے گروہ در گروہ لوگوں نے فیض پایا۔ وصال کی تاریخ ۶۳۳ھ (۱۲۳۶ء) ہے۔ ان کے علاوہ چار اور مشہور چشتی خلفاء ہندوستان میں ہو گذرے ہیں۔ یعنی خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ متوفی ۶۳۲ھ، خواجہ فرید الدینؒ گنج شکر متوفی ۶۶۸ھ، خواجہ نظام الدین اولیاء متوفی ۷۲۵ھ اور خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلی متوفی ۷۵۷ھ رحمہم اللہ اجمعین۔ حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے خلفاء نے خلق اللہ کی راہنمائی کا پاک کام ان کے بعد جاری رکھا اور خواجہ صاحب کے چراغ سے بعد کی صدیوں میں مسلسل کئی چراغ روشن ہوتے رہے،

بارھویں صدی ہجری میں اس نور کی ایک کرن مہار علاقہ ریاست بہاولپور میں پہنچی یعنی میاں نور محمد مہاروی چشتیؒ نے وادی سندھ میں نورِ محمدی سے ضیا پاشیاں کیں۔ اور ڈیرہ غازی خاں کے علاقے میں ان کے خلفاء نے، جن میں حضرت خواجہ محمد سلیمان تونسوی بھی شامل ہیں، متعدد مرکز فیوضِ باطنی کے قائم کئے۔

اب پہلے تھوڑا سا حال اس علاقے کا پیش کیا جاتا ہے تاکہ حضرت خواجہ محمد سلیمان تونسویؒ (جن کی یاد آج کی گفتگو کا موضوع ہے) کی حیاتِ مبارکہ کا پس منظر معلوم ہو سکے۔

ڈیرہ غازی خاں کا ضلع مغربی پنجاب میں واقع ہے۔ اس کی مشرقی حد دریائے سندھ ہے اور مغربی حد پر پہاڑ ہیں جنہیں اس ملک والے روہ کہتے ہیں جو دریائے سندھ کی طرح شمال سے جنوب کو آتے ہیں۔ روہ کے مغرب میں کوہ سلیمان ہے۔

ضلع ڈیرہ غازی خاں میں زیارتوں کی کثرت ہے۔ مشہور زیارتیں چالیس کے قریب ہیں۔ ضلع کے گزیٹیر کا مؤلف لکھتا ہے کہ ان زیارتوں کی کثرت سے معلوم ہوتا ہے کہ ماضی میں اس ضلع کی سکونت پاک باطن لوگوں کو بہت پسند تھی۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ گو یہ علاقہ دُنیا داروں کے لئے نامرغوب اور ناخوش آیند ہے تاہم اس میں ایسے علاقے بہت ہیں جو اُن حضرات کے دامنِ دل کو کھینچتے ہیں جو مجاہدہ اور نفس کشی کی خواہش رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت سخی سرور کو دیکھیے جس علاقے میں انہوں نے سکونت اختیار کی تھی، وہ ایسا ہے کہ جس شخص کو اقل قلیل خواہش ذاتی آرام و آسایش کی ہو گی وہ ایسے علاقے کے پاس بھی نہ پھٹکے گا۔

قریباً اسی قسم کا علاقہ تونسہ ہے۔ جس میں خواجہ محمد سلیمان خان نے سکونت اختیار

کی۔ یہ مقام ضلع ڈیرہ غازی خاں کی شمالی تحصیل سنگھڑ میں ملتان سے ۴۰ کوس مغرب کی طرف واقع ہے۔ یہاں سے وہ سڑک گذرتی ہے جو ڈیرہ اسمٰعیل خاں سے ڈیرہ غازی خان کو آتی ہے۔ مالکان دیہہ کے بزرگوں نے ہمایوں بادشاہ کے زمانے میں جنگل ویرانہ دیکھ کر یہ موضع آباد کیا تھا۔ خواجہ محمد سلیمان کا مسکن ومدفن یہی موضع ہے۔

خواجہ صاحب افغانوں کی قوم عشقون معروف بہ جعفر سے تھے۔ ان کی قوم بالائی رود سنگھڑ میں درگ کے مقام پر آباد تھی۔ اصل وطن ان کے اجداد کا خراسان تھا۔ وہاں سے بمرور زمانہ یہ لوگ علاقہ درگ میں آکر آباد ہوئے۔ جو تونسہ سے بجانب مغرب پہاڑ میں واقع ہے۔ اسی پہاڑ میں گرگوجی کے مقام پر جو تونسہ سے ۳۰ میل مغرب کو ہے ۱۱۷۹ھ (۱۷۶۵ء) میں محمد سلیمان خاں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا اسم مبارک زکریا خاں بن عبد الوہاب خان تھا۔ ان کا نام اس وقت ماتا رکھا گیا۔ بچپن میں وہ تونسہ اور لانگھر میں جو تونسہ سے ۵ کوس مشرق کی جانب ہے۔ علم فارسی کی تحصیل کرتے رہے۔ پھر انہوں نے قصبہ مٹھن کوٹ میں جہاں سے قریب ہی بجانب شمال پنجاب کے پانچ دریا دریائے سندھ سے ملتے ہیں۔ قاضی محمد عاقل کے مدرسے میں علم عربی تحصیل کیا۔ جب ان کی عمر ۱۶ برس کی ہوئی تو اتفاقاً حضرت خواجہ نور محمد مہاروی اپنے خلفاء و مشایخ کے ساتھ اُچ میں خانقاہ مخدوم جہانیاں پر تشریف لائے۔ خواجہ محمد سلیمان بھی جذب جاذبۂ حقیقی سے وہاں پہنچے۔ اور شرف بیعت سے مشرف ہوئے۔ اس وقت ان کے پیر نے ان کا نام محمد سلیمان خاں رکھا۔ چند سال تک وہ اپنے پیر کی خدمت میں حاضر رہے اور خرقۂ خلافت پایا۔ سنہ ۱۱۹۹ھ (۱۷۸۵ء) میں بزمانہ شاہ عالم ثانی وہ دہلی میں پیران طریقت کی زیارت کو گئے۔ دہلی سے واپس ہو کر وہ مہار شریف میں اپنے پیر کی خدمت میں پہنچ کر ذکر اور مجاہدہ میں مشغول ہو گئے۔ اسی

زمانہ میں انہوں نے اپنے پیر سے کتب تصوف مثل لوائح و فصوص الحکم کو سبقاً سبقاً پڑھا۔ یہاں سے وہ اپنے وطن پہنچے اور بعد چندے اپنے پیر روشن ضمیر کے حسب الارشاد تونسہ میں مقیم ہوئے اور خدا تعالیٰ کی عبادت اور خلقِ خدا کو راہِ خدا کی طرف ہدایت دینے میں مصروف ہو گئے۔ اپنی وضع انہوں نے ہمیشہ درویشانہ رکھی، اور روشِ زندگی بالکل سادہ۔ غیر اللہ سے اعراض، اور ماسویٰ اللہ سے اغماض کیا۔ سوا عبادت و مجاہدہ و ریاضت کسی سے کچھ تعلق نہ رکھا۔ اس واسطے ان کی نیک بختی کی شہرت زیادہ سے زیادہ ہونے لگی، اور ان کے رُشد اور صاحبِ کرامت ہونے کا چرچا نزدیک و دُور تک پہنچا۔ لوگ بکثرت ان کے مرید ہونے لگے جو کچھ آمدنی مریدوں سے ہوتی، وہ خیرات کر دیتے۔ ہزارہا خلق خراسان اور ہندوستان اور عرب اور ترکستان وغیرہ کی طرف سے آنی شروع ہوئی (تذکرۃ المشایخ) اور ہزارہا کافر اور فاسق و فاجر ان کے ہاتھ پر تائب ہو کر قربِ ایزدی تک پہنچے۔ (خزینۃ الاصفیا)

خواجہ صاحب کی زندگی میں ڈیرہ غازی خاں نے بہت سے انقلابات دیکھے ان کے بچپن میں یہ علاقہ درّانیوں کے ماتحت تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد جنوبی علاقہ درّانیوں نے خان قلات کو دے دیا اور کچھ حصہ بہاول پور کے قبضے میں آیا۔ خواجہ صاحب کی عمر ۳۵ برس کی ہو گی کہ سکھ ڈیرہ پر قابض ہو گئے۔ ۱۳، ۱۴ برس کے بعد دیوان ساون مل حاکم ملتان کی حیثیت سے آیا اور ۱۲ برس تک اس نواح پر بھی تسلط رہا۔ خواجہ صاحب کی وفات سے پہلے سکھوں کی دوسری لڑائی کے خاتمہ پر انگریزی حکومت سارے پنجاب میں قائم ہو گئی۔ ان زبردست اور پیہم سیاسی انقلابات کا کوئی نمایاں اثر خواجہ صاحب کے سوانح حیات پر نہیں پڑا، وہ نہایت اطمینان

اور سکون کے ساتھ اپنے گوشۂ عزلت میں اپنے خالق سے لَو لگائے بیٹھے رہے، اپنے مقررہ مشاغلِ عبادت و ہدایت میں مصروف رہے۔ صرف یہی نہیں کہ وہ اپنے محیط سے متأثر نہ ہوئے، واقع یہ ہے کہ ایک حد تک انہوں نے اپنے محیط کو متأثر کیا۔ چنانچہ مفتی تاج الدین لاہوری نے "تاریخ پنجاب" (خطی) میں لکھا ہے کہ والیانِ بہاول پوران کے مریدوں میں داخل ہوئے۔ دیوان ساون مل اُن کا بہت معتقد تھا۔ اور مہاراجہ رنجیت سنگھ بھی ان کی قدم بوسی کی خواہش رکھتا تھا، مگر بقول ان کے "ولولہائے ریاست نے اس کو فرصت جانے کی نہ دی۔"

خواجہ صاحب کے وصال کی تاریخ ۷ صفر ۱۲۶۷ھ (۱۸۵۵ء) ہے۔ آپ نے ۷۴ سال عمر پائی۔ بائیس برس تک سجادۂ مشیخت و ارشاد پر بیٹھ کر خلقِ خدا کو طریقت اور شریعت کا راستہ دکھایا۔

صاحبِ "تذکرۃ المشایخ" نے لکھا ہے کہ آپ اپنے پیر کے عرس پر جایا کرتے تھے۔ تونسہ سے مہار شریف ۱۱۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ جب بباعث بے طاقتی انہوں نے گھوڑے پر سوار ہو کر عرس پر جانا موقوف کیا تو نواب محمد بہاول خاں عبّاسی نے، کہ معتقدِ خاص حضرت کا تھا، عرض کیا کہ حضور کے واسطے میانہ اور پالکی تیار کرائی جائے؟ کہار پالکی اٹھانے والے ہردم حاضر رہیں گے! تو آپ نے فرمایا، کہ میں آدمیوں پر سوار ہو کر اپنے پیر کے عرس پر نہ جاؤں گا۔ معاف فرمائیں۔ ظاہر ہے کہ پالکی سے انکار میں فرمانِ خداوندی اِنَّ الْخَیْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِیْرَ لِتَرْکَبُوْھَا پر عمل اور متابعتِ نبوی مدِ نظر تھی۔

آپ سے کسی شخص نے پوچھا۔ "داخل ہونا دروازہ فیض آوازہ حضرت قطب الاقطاب

میں درست ہے یا نہیں؟"
فرمایا: "داخل ہونا دروازۂ مشرفہ متبرکہ میں' اس مراد سے کہ مکانِ متبرک موجبِ امید بہشت ہے' درست ہے۔ اور اس امید سے کہ بمجرد داخل ہونے دروازہ مشرفہ کے تمام گناہ ساقط ہو جائیں گے، یا داخل ہونے والا قطعی بہشتی ہو جاتا ہے' درست نہیں' اس لیے کہ دخولِ جنّت کی قطعیّت صرف انبیاء اور عشرۂ مبشرہ کے حق میں ہے۔ ان کے علاوہ صلحا، مؤمنین کے لیے صرف امید ہی کی جا سکتی ہے۔"
خواجہ صاحب کو بعد انتقال تونسہ شریف میں ان کے حجرۂ نشست گاہ میں دفن کیا گیا۔ اور پانچ برس بعد ۱۲۷۲ھ میں نواب صاحب بہاول پور نے ۸۵ ہزار روپیہ کے صرف سے ان کا مقبرہ تیار کرایا۔ سارے ضلع ڈیرہ غازی خان میں اس سے زیادہ خوبصورت مقبرہ نہیں ہے۔ بعد میں خواجہ صاحب کے پوتے حضرت صاحب میاں اللہ بخش نے، جو سجّادہ نشین مقرر ہوئے تھے' مقبرہ کی زیبائش اور خوبی میں بہت سا اضافہ کیا۔ گنبد پر جو کئی کئی میل سے نظر آتا ہے' سر بسر سنگِ مرمر کی ٹائلیں لگائی گئی ہیں۔ گردو نواح کے بے آب و گیاہ دشت سے اُٹھ کر جب نگاہ ان ٹائلوں پر پڑتی ہے تو آنکھوں میں نور اور دل میں سُرور آتا ہے۔ وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ.

قبر مبارک بھی سنگِ مرمر کی ہے اور اندرونی دیواروں کی استرکاری پر سیاہ و سفید کاشی کاری ہوئی ہے، جو ملتانی صنعت کا عمدہ نمونہ ہے۔ قریب ہی ایک مسجد بنائی گئی ہے' اور ایک منار' جس پر عرس کے دنوں میں روشنی کی جاتی ہے حضرت کا عرس ۵ صفر سے ۷ صفر تک تین دن ہوتا ہے۔ سرحدی صوبہ بہاولپور' سندھ اور

دُور دُور کے علاقوں سے صدہا مرید اس میں شامل ہوتے ہیں۔ خصوصاً افغانان سدوزئی و پوپل زئی، جو ڈیرہ اسمٰعیل خان سے آتے ہیں، نذر و نیاز سال بھر بکثرت موصول ہوتی رہتی ہے۔ اسی سے دربار کے تمام مصارف مہیا ہوتے ہیں۔ جن میں لنگر کا خرچ بھی شامل ہے۔

۱۸۷۵ء کی ایک سرکاری رپورٹ میں ہے کہ عُرس پر مجلس خانہ میں، جو روضہ کے بڑے دروازے کے آگے ہے، سب لوگ بیٹھ جاتے ہیں۔ میراثی لوگ سرود و غزل گاتے ہیں اور ساز بجاتے ہیں۔ فقراء لوگ بحالتِ وجد آکر حال کھیلنے لگتے ہیں اور گریہ زاری کرتے ہیں۔

رقص و سرودِ صوفیہ کے متعلق "کشف المحجوب" میں قدماء اکابرِ صوفیاء کا مسلک دیا ہے۔ اس میں سے ذیل کے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں:-

رقص کے متعلق فرماتے ہیں:-

"شریعت و طریقت دونوں میں رقص بے بنیاد چیز ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ عوام کے اس گروہ نے سمجھا ہے کہ مذہب تصوّف اس کے سوا کچھ نہیں، اسے اختیار کیا ہے؛ اور ایک اور گروہ اس کی اصلیت سے منکر ہے۔ مختصر یہ کہ اگر جاہل ترین لوگ پائے بازی کریں تو شرعاً اور عقلاً ایک بری بات ہے۔ چہ جائیکہ فاضل ترین لوگ ایسا کریں، ہاں، دل میں سُبکی پیدا ہو اور خفقان سر پر سوار ہو، اور وقت قوّت پکڑے، اور حال خود اضطراب پیدا کرے، اور ترتیب رسُوم اُٹھ جائیں تو وہ اضطراب جو اس طرح پیدا ہوتا ہے، وہ نہ رقص ہے نہ پائے بازی،

وہ پرورشِ طبیعت نہیں، بلکہ جاں گدازی ہے۔ اسے جو رقص کہے
وہ راہِ صواب سے بہت دُور ہے۔"

سماع کے متعلق فرمایا ہے :۔

"فقہا متفق ہیں کہ اگر مزامیر نہ ہوں اور دل میں فسق پیدا نہ ہو، تو سماع
مباح ہے..... مگر مشائخ متصوفہ کی مراد اور ہے، وہ کہتے ہیں کہ اعمال
میں فوائد کا ہونا ضروری ہے۔ صرف اباحت طلب کرنا عوام کا کام ہے
..... اگر دل میں سماع کی تاثیر حلال ہو تو سماع حلال ہے۔ حرام ہو، تو
حرام، مباح ہو تو مباح۔"

اب ہم اس دعا کا اعادہ کرتے ہیں، جو حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ نے "تذکرۃ الاولیاء"
کے دیباچہ کے آخر میں ایک بزرگ کا قول نقل کرکے مانگی ہے۔ فرماتے ہیں :۔
نقل ہے کہ، جمال موصلیؒ نے ایک عمر خون کھایا اور جان کنی کی۔ مال و جاہ صرف
کیا۔ تب روضۂ خواجہ انبیاءؐ کے جوار کے سامنے جگہ پائی اور وصیت کی کہ ان کی قبر پہ
لکھیں : وَکَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ. ـــــ اس پہ شیخ عطارؒ نے
کلماتِ ذیل لکھے :۔

"سگے قدمے چند بر اثر دوستان تو زد، او را درکار ایشان کردی، من
نیز دعوئ دوستی دوستان تو می کنم۔ خداوندا، اگرچہ من این سخن را از ہیچ
کسی، ہیچ کسی نیم، اما محبِّ ایشانم بحقِ جان پاک انبیا و اولیاء و علماء کہ
من غریب عاجز را ازین قومِ محجوب مگردان و از آن نظرِ خاص کہ بایشان
می رسد محروم مکن۔"

ترجمہ :- اصحابِ کہف کے کُتّے نے چند قدم تیرے دوستوں کے پیچھے پیچھے اُٹھائے تو تُو نے ان کے کام میں اُسے بھی شامل کر لیا۔ میں بھی تیرے دوستوں کی دوستی کا دم بھرتا ہوں۔ اے خداوند! اگرچہ ہیچ کسی کی وجہ سے، مجھ کو اس کلام سے کوئی نسبت نہیں، لیکن میں بھی ان کا دوست دار تو ہوں۔ اے خدا، بحقِ جانِ پاکِ انبیاء، و اولیاء، و علماء، مجھ غریب عاجز کو اس قوم سے محجوب نہ کیجیو، اور اس نظرِ خاص سے، جو انہیں پہنچی ہے، مجھے محروم نہ کیجیو!

مقالاتِ

دینی و علمی

حِصّہ اوّل

چند دینی و علمی تحقیقی تقریریں

جو

پروفیسر مولوی محمد شفیع ایم-اے (کینٹب) CANTAB
ڈی او ایل ستارۂ پاکستان

صدر شعبۂ دائرۂ معارفِ اُردو

نے

ریڈیو کے ذریعے سے نشر کیں

سنہ ۱۹۶۰ء

مطبوعہ دین محمدی پریس لاہور